

تفہیم القرآن  
ترجمہ و تفسیر

# تفسیر مضمونہ

(جلد دہم)

مکتبہ اسلامیہ

سیدنا امیر گنج

سورہ یوسف/ 54 تا 57

یوسف (ع) مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 58 تا 62

یوسف (ع) کی بھائیوں کو نئی تجویز

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 63 تا 66

آخر کار باپ راضی ہو گئے

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 67 تا 68

تفسیر

سورہ یوسف/ 69 تا 76

بھائی کو روکنے کی کوشش

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 77 تا 79

برادران یوسف (ع) کی فداکاری کیوں قبول نہیں ہوئی؟

سورہ یوسف/ 80 تا 82

بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 83 تا 86

میں وہ الطاف الہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

سورہ یوسف/ 87 تا 93

کو شش کرو اور مایوس نہ ہو

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 94 تا 98

آخر کار لطف الہی اپنا کام کرے گا

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 99 تا 101

تفسیر

چند اہم نکات

سورہ یوسف/ 102 تا 107

یہ دعویٰ عام طور پر مشرک ہیں

سورہ یوسف/ 108 تا 111

عبرت کے زندہ درس

آسمان و زمین اور سبزہ زار خدا کی نشانیوں ہیں

سورہ رعد / 1 تا 43

چند اہم نکات

سورہ رعد / 5 تا 6

قیامت کے بارے میں کافروں کا تعجب

چند اہم نکات  
سورہ رعد / 7  
پھر بہانہ سازی  
دو سوال اور ان کے جواب  
سورہ رعد / 8 تا 10  
خدا کا بے پایاں علم  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 11  
غیبی محافظ  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 12 تا 15  
عظمت الہی کی کچھ نشانیاں  
رعد و برق کی برکتیں  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 16  
بت پرستی کیوں؟  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 17  
حق و باطل کی منظر کشی  
قرآنی مثالیں  
سورہ رعد / 18  
جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لی  
ایک نکتہ  
سورہ رعد / 19 تا 24  
اہل شعور کا طرز عمل جنت کے اٹھ دروازے  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 25 تا 26  
دنیا پرست تباہ کار  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 27 تا 29  
یاد الہی باعثِ تسکین دل ہے  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 30 تا 32  
شان نزول  
بت دھرم بر گز ایمان نہیں لائیں گے  
چند اہم نکات  
سورہ رعد / 33 تا 34  
کس طرح خدا کو بتوں کا شریک بناتے ہو؟  
سورہ رعد / 35  
تفسیر  
سورہ رعد / 36  
خدا پرست اور دیگر گروہ

ایک اہم نکتہ

سورہ رعد / 37 تا 40 قطعی اور قابلِ تغیر حوادث

دو اہم نکات

سورہ رعد / 41 تا 43 انسان اور معاشرے ختم ہو جاتے ہیں ، خدا باقی رہتا ہے

سورہ ابراہیم / آیہ 1-3

تفسیر

ظلمتوں سے نور کی طرف

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور راہِ خدا کو نور سے تشبیہ دین

سورہ ابراہیم آیت 4-7

تفسیر

زندگی کے حساس دن

چند اہم نکات

۱۔ ایامِ اللہ کی یاد آوری

۲۔ جابروں کے طور طریقے

۔ سب سے بڑی نعمت آزادی ہے

۴۔ شکرِ نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ

شکرِ نعمت کے بارے میں چند اہم نکات

سورہ ابراہیم / آیہ 8-10

تفسیر

کیا خدا کے بارے میں شک ہے؟

سورہ ابراہیم / آیہ 11-12

صرف اللہ پر توکل کرو

چند اہم نکات

۱۔ مومنین اور متوکلین

۲۔ انبیاء اور معجزات

۳۔ توکل کی حقیقت اور فلسفہ

توکل کا فلسفہ

سورہ ابراہیم / آیہ 13-17

تفسیر

منحرف جابروں کا طرزِ عمل اور ان کا انجام

چند اہم نکات

۱۔ مقامِ پروردگار سے کیا مراد ہے؟

۲۔ ”استفتحوا“ کا مفہوم

۳۔ ایک جابر حکمران اور قرآن کی یہ آیت

سورہ ابراہیم / آیہ 18

تیز آندھی اور خاکستر

چند اہم نکات

ان کے اعمال کو گرد و غبار کی مانند خاکستر سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے

۲۔ ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں؟

۳۔ مسئلہ احباط

۴۔ کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لئے بھی جزاء ہے؟

سورہ ابراہیم / آیہ 19-20

تفسیر

خلقت حق کی اساس پر ہے

سورہ ابراہیم / آیہ 21-23

تفسیر

شیطان اور اس کے پیرو کاروں کی صریح گفتگو

چند اہم نکات

۱۔ ایک اشکال کی وضاحت :

۲۔ ”لو ہدانا اللہ لہدیناکم“ کا مفہوم

۳۔ اندھی تقلید کی مذمت

۴۔ ”پرزو“ اور ”محیص“ کا مفہوم

چند اہم نکات

۱۔ شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب

۲۔ روزِ حشر شیطان کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ

۳۔ گمراہی کے دیگر پیشواؤں کا طرز عمل

۴۔ ”مصرخ“ کا مطلب

۵۔ شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد

سورہ ابراہیم / آیہ 24-27

تفسیر

”شجرہ طیہ“ اور ”شجرہ خبیثہ“

چند اہم نکات

۱۔ کیا آخرت سے مراد قبر ہے؟

۲۔ ثبات و استقامت کا اثر

۳۔ روایات اسلامی میں شجرہ طیہ اور شجرہ خبیثہ

سورہ ابراہیم / آیہ 28-30

تفسیر

کفرانِ نعمت کا انجام

چند اہم نکات

سورہ ابراہیم / آیہ 31-34

تفسیر

قرآن کی نگاہ میں انسان کی عظمت

چند اہم نکات

۱۔ خالق اور مخلوق سے رشتہ

۲۔ انفاق، پنهان اور آشکار کیوں؟

۳۔ اس دن ”بیع“ اور ”خلال“ نہیں ہے

۴۔ اے انسان! تمام موجودات تیرے فرمان پر سر تسلیم خم ہیں

۵۔ دائیبن

۶۔ جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے؟

۷۔ اس کی نعمتیں کیوں قابلِ شمار نہیں

۸۔ افسوس کہ انسان ”مظلوم“ اور ”کفار“ ہے

سورہ ابراہیم / آیہ 35-41

تفسیر

ابراہیم (علیہ السلام) بت شکن کی اصلاحی دعائیں

چند اہم نکات

- ۱۔ کیا مکہ اس وقت شہر تھا؟
- ۲۔ مکہ سر زمین امن
- ۳۔ ابراہیم (علیہ السلام) بت پرستی سے دوری کی دعا کیوں کرتے ہیں؟
- ۴۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے تابع کون ہیں؟
- ۵۔ وادی - ”غیر ذی زرع“ اور خدا کا پر امن حرم
- ۶۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سات دعائیں
- ۷۔ کیا ابراہیم (علیہ السلام) اپنے باپ کے لئے دعا کر رہے ہیں؟

سورہ ابراہیم / آیہ 42-45

تفسیر

جس روز آنکھیں پتھرا جائیں گی

چند اہم نکات

- ۱۔ پیغمبر اکرم سے خطاب کیوں ہے؟
- ۲۔ ”یوم یأتیہم العذاب“ سے کون سا دن مراد ہے؟
- ۳۔ مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا؟

سورہ ابراہیم / آیہ 46-52

تفسیر

ظالموں کی کمزور سازشیں

چند اہم نکات

- ۱۔ زمین اور آسمان بدل جائیں گے :
  - ۲۔ سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام
  - ۳۔ اول و آخر - توحید
- بت شکن پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر ایک نظر
- حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا بچپن
- بت پرستوں سے مقابلہ
- منطق و استدلال کے سہارے
- آزر سے گفتگو
- دور نبوت
- عملی مقابلے کا آغاز
- حضرت ابراہیم (ع) کی ہجرت
- رسالت کا آخری مرحلہ
- قرآن اور ابراہیم کا مقام بلند

تفسیر نمونہ جلد 10

تفسیر نمونہ ، آیہ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) کی 15 سالہ زحمات کا نتیجہ ہے جس کو معظم لہ نے اہل قلم کی ایک جماعت کی مدد سے فارسی زبان میں تحریر فرمایا ، اس کا اردو اور عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے۔

سورہ یوسف 54 تا آخر ، سورہ رعد اور سورہ ابراہیم

تعداد جلد: 15 جلد

زبان: اردو

مترجم : مولانا سید صفدر حسین نجفی (رح)

تعداد صفحات: 710

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی 1417ھجری

سورہ یوسف/ 54 تا 57

۔ وَقَالَ الْمَلِكُ انْتُونِي بِهٖ اَسْتَخْلِصُهٗ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اُمِيْنٌ ۔

۵۴۔ قَالَ اجْعَلْنِي عَلٰی خَزَايِنِ الْاَرْضِ اِنِّي حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ۔

۵۶۔ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَّبِعُوْا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ وَلَا نُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔

۵۷۔ وَلَا جُرْ الْاٰخِرَةَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔

ترجمہ

۵۴۔ (مصر کے) بادشاہ نے کہا: اس (یوسف) کو میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اسے اپنے ساتھ مخصوص کر لوں۔ جب (یوسف اس کے پاس آئے اور) اس سے گفتگو کی (تو بادشاہ کو ان کی عقل و فہم کا اندازہ ہوا) تو اس نے کہا: آج تو ہمارے ہاں اعلیٰ قدر و منزلت رکھتا ہے تو قابل اعتماد۔

۵۵۔ (یوسف نے) کہا: مجھے (مصر کی) زمین کے خزانوں کا سر پرست بنادے کیونکہ میں حفاظت کرنے والا اور آگاہ ہوں۔

۵۶۔ اس طرح ہم یوسف کو (مصر کی) زمین میں قدرت دی کہ اب جہاں چاہتا اس میں رہتا (اور اس میں تصرف کرتا) ہم جسے چاہتے ہیں (اور لائق سمجھے ہیں) اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور ہم نیک لوگوں کا اجر ضائع کرتے۔

۵۷۔ اور جو ایمان لائے ہیں اور پر بیز گار ہیں آخرت کا اجر ان کے لئے بہتر ہے۔

یوسف (ع) مصر کے خزانہ دار کی حیثیت سے

حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی کی عجیب زندگی کی تفصیل میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ آخر ان کی پاکدامنی سب پر ثابت ہو گئی یہاں تک کہ ان کے دشمنوں نے ان کی پاکیزگی کی گواہی دی اور یہ ثابت ہو گیا کہ جس گناہ کی وجہ سے وہ زندان میں ڈالے گئے تھے وہ پاکدامنی تقویٰ اور پر بیز گاری کے سوا کچھ نہ تھا۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ بے گناہ قیدی علم، آگہی، دانشمندی، انتظامی صلاحیت اور فہم و فراست کی بہت اعلیٰ سطح کا مرکز ہے کیونکہ اس نے ”ملک“ (بادشاہ مصر) کے خزانے کی تعبیر بتاتے ہوئے آئندہ کی پیچیدہ اقتصادی مشکلات بیان کرتے ہوئے ساتھ ہی ان سے نجات کے راستے کی نشاندہی بھی کردی تھی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے؛ ”بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تاکہ میں اسے اپنا مشیر اور نمائندہ خاص بناؤ“، اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لئے اس کے علم و دانش اور انتظامی صلاحیت سے مدد لوں (وَقَالَ الْمَلِكُ انْتُونِي بِهٖ اَسْتَخْلِصُهٗ لِنَفْسِي)۔

بادشاہ کا پر جوش پیام لیکر اس کا خاص نمائندہ قید خانے میں یوسف کے پاس پہنچا۔ اس نے بادشاہ کی طرف سلام و دعا پہنچایا اور بتایا کہ اسے آپ سے شدید لگاؤ ہو گیا ہے۔ اس نے مصر کی عورتوں کے بارے میں تحقیق سے متعلق آپ کی درخواست کی عملی جامہ پہنا یا اور سب نے کھل کر آپ کی پاکدامنی اور بے گناہی کی گواہی دی ہے۔ لہذا اب تاخیر کرنے کی گنجائش نہیں رہی اٹھیے تاکہ ہم اس کے پاس چلیں۔

حضرت یوسف (ع) بادشاہ کے پاس تشریف لائے۔ ان کی آپس میں بات چیت ہوئی۔ بادشاہ نے ان کی گفتگو سنی اور آپ کی پر مغز اور نہایت اعلیٰ باتیں سنیں۔ اس نے دیکھا کہ آپ کی باتیں انتہائی علم و دانش اور دانائی سے معمور

ہیں تو پہلے سے بھی زیادہ آپ کا شیفٹ ہو گیا۔

کہنے لگا : آپ آج سے ہمارے ہاں اعلیٰ قدرت و منزل اور وسیع اختیارات کے حامل ہیں اور ہمارے نزدیک قابل اعتماد رہیں گے ( فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ) ۔

آج سے اس ملک کے اہم کام آپ کے سپرد ہیں اور آپ کو امور کی اصلاح کے لئے کمر ہمت باندھ لینا چاہیے کیونکہ میرے خواب کی جو تعبیر آپ نے بیان کی ہے اس کے مطابق اس ملک کو شدید اقتصادی بحران درپیش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بحران پر صرف آپ ہی قابو پا سکتے ہیں ۔

حضرت یوسف (ع) نے تجویز پیش کی کہ مجھے اس علاقہ کے خزانوں کی ذمہ داری سونپ دی جائے کیونکہ میں اچھا محافظ ہوں اور اس کام کے اسرار سے بھی واقف ہوں ( قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ) ۔

حضرت یوسف (ع) اچھی طرح جانتے تھے کہ ظلم سے بھرے اس معاشرے کی پریشانیوں کی ایک اہم بنیاد اس کے اقتصادی مسائل میں ہیں۔ لہذا انہوں نے سوچا کہ جب کہ انہیں مجبوراً آپ کی طرف آنا پڑا تو کیا ہی اچھا ہے کہ مصر کی اقتصادیات کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور محروم و مستضعف عوام کی مدد کے لئے آگے بڑھیں اور جتنا ہو سکے طبقاتی تباہی اور اونچ نیچ کو کم کریں ، مظلوموں کا حق ظالموں سے لیں اور اس وسیع ملک کی بد حالی کو دور کریں ۔ آپ کی نظر میں تھا کہ خاص طور پر زرعی مسائل اس ملک میں زیادہ اہم ہیں اس بات پر بھی توجہ رکھنا ہو گی چند سال فراوانی کے ہوں گے اور پھر خشکی کے سال درپش ہوں گے لہذا لوگوں کو زیادہ سے زیادہ غلے پیدا کرنے اور پھر انہیں احتیاط سے محفوظ رکھنے اور نہایت کم خرچ کرنے پر آمادہ کرنا ہو گا تاکہ قحط کے سالوں کے لئے غلہ ذخیرہ کیا جاسکے ۔ لہذا اس مقصد کے لئے آپ کو یہی بہتر معلوم ہوا کہ آپ مصر کے خزانوں کو اپنی سرپرستی میں لینے کی تجویز پیش کریں۔

بعض نے لکھا ہے کہ اس سال بادشاہ سخت مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور کسی طرح ان سے نجات چاہتا تھا لہذا اس نے تمام امور کی باگ ڈور حضرت یوسف (ع) کے ہاتھ میں دے دی اور خود کنارہ کشی اختیار کر لی ۔

بعض دوسروں کا کہنا ہے کہ اس نے عزیز مصر کی جگہ حضرت یوسف (ع) کو اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے ظاہری مفہوم کے مطابق وہ صرف مصر کے وزیر خزانہ بنے ہوں لیکن اسی سورہ کی آیت ۱۰۰ اور ۱۰۱/ کہ جن کی تفسیر انشاء اللہ آئے گی اس امر کی دلیل ہیں کہ آخر کار آپ بادشاہ ہو گئے اور تمام امور مملکت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آگئی ۔ اگر چہ آیت ۸۸/ میں ہے کہ یوسف (ع) کے بھائیوں نے ان سے کہا : ”یا ایہا العزیز“ ۔

یہ امر کی دلیل ہے کہ آپ نے عزیز مصر کا منصب سنبھالا مگر اس میں کوئی مانع نہیں کہ آپ نے یہ مناسب تدریجاً حاصل کئے ہوں ۔ پہلے وزیر خزانہ ہوئے ہوں پھر وزیر اعظم اور پھر بادشاہ ۔

بہر حال اس مقام پر خدا کہتا ہے : اور اس طرح ہم نے یوسف (ع) سر زمین مصر پر قدرت عطا کی کہ وہ جیسے چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا تھا ( وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ) ۔

جی ہاں ! ہم اپنی رحمت اور مادی و روحانی نعمتیں جسے چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں عطا کرتے ہیں ( نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ) ۔

اور ہم نیکو کاروں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کریں گے ۔“ اگر چہ اس میں تاخیر ہو جائے تاہم آخر کار جو کچھ ان کے لائق ہوا انہیں دیں گے کیونکہ ہم کسی نیک کو فراموش نہیں کرتے ( وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ) ۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم صرف دنیاوی اجر ہی نہیں دیں بلکہ ”جو اجر انہیں آخرت میں ملے گا وہ اہل ایمان اور صاحبان تقویٰ کے لئے زیادہ اچھا ہے“

( وَلَا جُزُ الْأَخْرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ) ۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یوسف (ع) نے طاغوت وقت کی دعوت کیونکر قبول کی ؟

زیر بحث آیات کی طرف توجہ ہوتے ہیں پہلا سوال جو ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے عظیم نبی طاغوت زمانہ سے وزارت خزانہ یا وزارت عظمیٰ کا منصب قبول کرنے اور اس کے ساتھ ملکر کام کرنے پر کیسے تیار ہو گئے ؟

اس سوال کا جواب خود مندرجہ بالا آیات ہی میں پوشیدہ ہے ۔ وہ یہ کہ آپ نے یہ منصب ایک ’حفیظ و علیم‘ شخصیت کی حیثیت سے قبول کیا تاکہ عوام کے مفاد میں بیت المال کی حفاظت کریں اور اسے انہی کے مفاد میں خرچ

کریں خصوصاً مستضعف اور محروم کے حقوق کو جو اکثر معاشروں میں پامال ہوتے ہیں ان تک پہنچائیں۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے کہا ہے وہ علم و تعبیر کے ذریعے جانتے تھے کہ مصری قوم کو ایک شدید اقتصادی بحران پیش آنے والا ہے لہذا اس کے مقابلے کے لئے دقیق پروگرام اور قریب سے اس کی نگرانی کے بغیر ممکن تھا کہ بہت سے لوگ تباہ و برباد ہو جاتے، لہذا اس مصیبت سے عوال کی نجات اور بے گناہ انسانوں کی جان کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ حضرت یوسف (ع) کو جو موقع مل رہا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے اور تمام لوگوں خصوصاً محروم عوام کے لئے اس سے استفادہ کرتے کیونکہ اقتصادی بحران اور قحط سالی میں سب سے زیادہ خطرہ انہیں لوگوں کی جان کو تھا اور بحرانوں کی پہلی قربانی یہی لوگ ہوتے ہیں۔

فقہ میں ظالم کی حکومت قبول کرنے کی بحث میں بھی یہ بات تفصیل سے آئی ہے کہ ظالم کی طرف سے کوئی منصب قبول کرنا ہمیشہ حرام نہیں ہوتا بلکہ کبھی مستحب بھی ہوتا ہے اور ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب اس منصب کو قبول کرنے کے فوائد اور دینی تقاضے اس کی حکومت کی تقویت پہنچنے کے نقصانات سے زیادہ ہوں۔ متعدد روایات میں آیا ہے کہ ائمہ اہل بیت (ع) بھی اپنے قریبی ساتھیوں کو اس قسم کی اجازت دے دیتے تھے مثلاً علی بن یقظین امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے فرعون ہارون رشید کی وزارت امام (ع) کی اجازت سے قبول کی۔

بہر صورت اس قسم کے مناصب قبول کرنے یا رد کرنے کا انحصار ’قانونِ اہم و فہم‘ پر ہے۔ اس کے نفع و نقصان کو دینی اور اجتماعی لحاظ سے پرکھا جانا چاہیئے۔ بہت سے مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ایسا عہدہ قبول کرنا ظالم کی معزولی پر منتج ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات کے مطابق حضرت یوسف (ع) کے ساتھ بھی اتفاق ہوا اور کبھی ایسا عمل بعد از انقلاب و قیام کا سرچشمہ بن جاتا ہے کیونکہ منصب قبول کرنے والا شخص حکومت کے اندر سے انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے۔ شاید مومن آل فرعون اسی قسم کی ایک مثال تھے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے افراد مظلوموں اور محروموں کے لئے پناہ گاہ بن جاتے ہیں اور ان کے لئے حکومتی ظلم میں کمی کاباعت بن جاتے ہیں ان مقاصد میں سے کوئی ایک بھی حاصل ہو رہا ہو تو ایسے عہدے قبول کرنے کا جواز بن جاتا ہے۔

ایک مشہور روایت میں امام صادق (ع) ایسے ہی افراد کے بارے میں فرماتے ہیں :

کفارة عمل السلطان قضاء حوائج الاخوان

ظالم حکومت کا ساتھ دینے کا کفارہ یہ ہے کہ بھائیوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ۱۔ لیکن یہ مسئلہ ایسے مسائل میں سے ہے کہ جن میں حلال و حرام کی سرحد ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوتی ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ انسان تھوڑی سی سہل انگاری کی وجہ سے غلط طور پر ظالم کا ساتھ دینے لگتا ہے اور کسی بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے جب کہ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں عبادت اور خدمت خلق میں مشغول ہوں۔ بعض اوقات سوء استفادہ کرنے والے افراد حضرت یوسف (ع) یا علی بن یقظین کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں اور اسے بہانے کے طور پر استعمال کرتے ہیں حالانکہ ان کے کام کو حضرت یوسف (ع) اور علی بن یقظین سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ 2

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ مصر کا ظالم بادشاہ اس کے لئے کیسے تیار ہو گیا جب کہ وہ جانتا تھا کہ حضرت یوسف ظلم و ستم استعماری ہتھکنڈوں اور استعمار کے لئے ہر گز تیار نہ ہوں گے بلکہ اس کے برعکس اس کے مظالم میں رکاوٹ بنیں گے۔ ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں رہتا، وہ یہ کہ بعض اوقات معاشرتی اور اقتصادی بحران اس طرح کے ہوتے ہیں کہ خود سروں کی حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں اسی طرح سے کہ انہیں اپنی ہر چیز خطرے میں نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع پر ہلاکت سے بچنے کے لئے وہ یہاں تک تیار ہو جاتے ہیں کہ ایک عادلانہ عوامی حکومت کو قبول کر لیں تاکہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

۲۔ اقتصادی مسائل اور انتظامی صلاحیت کی اہمیت :

بعض مکاتب بالکل یک جہتی ہیں اور ہر چیز کو اقتصادی پہلو میں منحصر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے انسان اور اس کے وجود کی مختلف جہات کو نہیں پہنچانا۔ ہم اگر چہ ان مکاتب سے اتفاق نہیں کرتے تاہم معاشروں کی زندگی میں خصوصیت سے اقتصادی مسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مندرجہ بالا آیات بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کیونکہ تمام مناصب میں سے حضرت یوسف (ع) نے وزارت خزانہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ وہ

جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے ٹھیک کر لیا تو مصر کی زیادہ تر پریشانیوں دور ہو جائیں گی اور عدالت اقتصادی کے ذریعے وہ دوسری مشکلات پر بھی قابو پا سکیں گے۔

اسلامی روایات میں بھی اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک مشہور حدیث حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے جس میں لوگوں کی روحانی اور رمادی زندگی (قوام الدین و الدنیا) کی حقیقی دو بنیادوں میں سے ایک اقتصادی مسائل بیان کی گئی جب کہ دوسری آگہی اور علم و دانش کو شمار کیا گیا ہے۔ گرچہ مسلمانوں نے ابھی تک اس اہمیت کی طرف توجہ نہیں کی کہ جو اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اس حصے کو دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان زندگی کے اس حصے میں اپنے دشمنوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور پس ماندہ ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں روز بروز بیداری اور آگاہی میں اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں مسلمان اقتصادی میدان میں کاوشوں کو ایک بہت بڑی اسلامی عبادت سمجھتے ہوئے انجام دینے لگیں گے اور اس لحاظ سے اسلام کے بے رحم دشمنوں کی نسبت جو پس ماندگی ہے اسے دور کریں گے۔

ضمناً حضرت یوسف (ع) نے یہ جو کہا ہے کہ: ”انی حفیظ علیم“۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے کسی حساس منصب کو قبول کرنے کے لئے صرف امانت داری ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت بھی ضروری ہے اور اس کے علاوہ علم و آگاہی اور مہارت بھی ضروری ہے کیونکہ آپ نے ”حفیظ“ کے ساتھ ساتھ ”علیم“ بھی کہا ہے۔

ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بے خبری، عدم مہارت اور انتظامی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے جو خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ خیانت سے پیدا ہونے والے خطرات سے کم نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات اس سے بدتر اور زیادہ ہوتے ہیں۔ ان واضح اسلامی تعلیمات کے باوجود معلوم نہیں بعض مسلمان انتظامی صلاحیت اور علم و آگہی کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور عہدے سپرد کرنے کے لئے وہ صرف امانت و دیانت کو شرائط سمجھتے ہیں حالانکہ پیغمبر اسلام اور حضرت علی (ع) کی دور حکومت میں ان کی سیرت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ بزرگوار آگاہی اور انتظامی صلاحیت کو امانت و دیانت کی طرح اہمیت دیتے تھے۔

### ۳۔ مصارف کی نگرانی :

اقتصادی مسائل میں صرف زیادہ سے زیادہ اجناس پیدا کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ بعض اوقات مصارف اور مخارج پر کنٹرول کرنا اس سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف (ع) نے اپنے دور حکومت میں فراوانی نعمت کے سات سالوں میں مصارف پر سختی سے کنٹرول کیا تاکہ اجناس کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ سختی کے سالوں کے لئے بچا کر رکھ سکیں۔

درحقیقت یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ زیادہ پیداوار اس وقت مفید ہوتی ہے جب اسے زیادہ صحیح طور پر کنٹرول کر کے استعمال کیا جا سکے اور مصارف پر کنٹرول اس وقت زیادہ مفید ہے جب اس کے ساتھ پیداوار بھی زیادہ ہے۔

مصر میں حضرت یوسف (ع) کی اقتصادی سیاست سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ترقی پذیر اقتصادی نظام صرف زمانہ حال پر نظر نہیں رکھتا بلکہ آئندہ پر بھی نظر رکھتا ہے بلکہ آئندہ نسلوں پر بھی نظر ہوتی ہے اور یہ انتہائی خود غرضی ہے کہ ہم صرف اپنے ا کے منافع کی فکر میں رہیں مثلاً زمین میں موجود تمام ذخائر کو لوٹ لیں اور آئندہ آنے والوں کی کوئی فکر نہ کریں اور یہ نہ سوچیں کہ وہ کن حالات میں زندگی بسر کریں گے کیا ہمارے بھائی صرف وہی ہیں جو آج ہمارے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور بعد میں آنے والے ہمارے کچھ نہیں لگتے؟

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض اوقات روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف (ع) نے مصر کے لوگوں میں طبقاتی فاقوت اور لوٹ کسوت کو ختم کرنے کے لئے قحط کے سالوں سے استفادہ کیا۔ آپ نے زیادہ پیداوار کر کے عرصے میں لوگوں سے غذائی مواد خرید لیا اور اس کے لئے تیار کئے گئے بڑے بڑے گواموں میں اسے ذخیرہ کیا۔ جب یہ سال گذر گئے اور قحط کے سال شروع ہوئے تو پہلے سال اجناس کو درہم و دینار کے بدلے بیچا۔ اس طرح کرنسی کا ایک بڑا حصہ جمع کر لیا۔ دوسرے سال اسباب زینت اور جواہرات کے بدلے اجناس کو بیچا۔ البتہ جن کے پاس یہ چیزیں نہ تھیں انہیں مستثنیٰ رکھا۔ تیسرے برس چوپایوں کے بدلے، چوتھے برس غلاموں اور کنیزوں کے عوض، پانچویں برس عمارات کے بدلے، چھٹے برس زرعی زمینوں اور پانی کے عوض اور ساتویں خود مصر کے لوگوں کے بدلے اجناس دیں۔ پھر یہ سب چیزیں انہیں (عادلانہ طور پر) واپس کر دیں اور کہا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ عوام کو بلاؤ مصیبت اور بے سروسامانی سے نجات دلاؤں۔ 3-

۴۔ اپنی تعریف یا اپنا تعارف :

اس میں اس میں شک نہیں کہ اپنی تعریف کرنا ایک ناپسندیدہ کام ہے لیکن اس کے باوجود یہ کلی قانون نہیں بعض اوقات حالات کا تقاضا ہوتا ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ انسان معاشرے کو اپنا تعارف کروانے تاکہ لوگ اسے پہچانیں اور اس کی مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور وہ ایک پوشیدہ اور متروک خزانے کی طرح نہ رہ جائے۔

مندرجہ بالا آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت یوسف (ع) نے مصر کی وزارت خزانہ کئے منصب کے لئے آپ کو تجویز کرتے ہوئے ”حفیظ علیم“ کے الفاظ سے اپنی تعریف کی کیونکہ ضروری تھا کہ بادشاہ مصر اور دوسرے لوگ جان لیں کہ آپ ایسی صفات کے حامل ہیں جو اسے شعبے کی سرپرستی کے لئے بہت ہی ضروری ہیں۔ اسی لئے تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ (ع) سے سوال کیا گیا : کیا جائز ہے کہ انسان آپ اپنی تعریف کرے۔

آپ (ع) نے فرمایا :

نعم ، اذا اضطر اليه اما سمعت قول يوسف اجعلني على خزائن الارض انى حفیظ علیم وقول العبد الصالح و انا لكم ناصح امین۔

جی ہاں ! جب اس کے سوا چارہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کیا تو نے حضرت یوسف (ع) کا قول نہیں سنا۔ انہوں نے فرمایا : مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کر دو کیونکہ میں امین اور آگاہ ہوں۔ اسی طرح خدا کے عبد صالح (پود (ع)) نے فرمایا : میں تمہارے لئے خیر خواہ اور امین ہوں۔ 4

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خطبہ شفشقیہ اور نہج البلاغہ کے دیگر خطبوں میں حضرت علی (ع) نے جو اپنی تعریف کی ہے اور اپنے آپ کو محور خلافت کا قب قرار دیا ہے کہ جس کی اوج فکر اور مقام والا تک فکر انسانی کا پرندہ پر نہیں مار سکتا اور علوم کی آبشار ان کے کوبسار وجود سے گرتے ہیں۔ اور اسی قسم کی دیگر تعریفیں سب اس لئے ہیں کہ نا آگاہ اور بے خبر لوگ آپ کے مقام کو سمجھیں اور آپ کے گنجینہ وجود سے معاشرے کی بہبود کے لئے استفادہ کریں۔

۵۔ روحانی اجر بہتر ہے :

اگر چہ بہت سے نیک لوگوں کو اس جہان میں مادی اجر مل جاتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف (ع) نے اپنی پاکدامنی ، صبر ، پارسائی اور تقویٰ کا نتیجہ اسی دنیا میں پالیا اور اگر وہ پاکدامن نہ ہوتے تو پرگز اس مقام تک نہ پہنچتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگوں کو اس قسم کی توقع رکھنا چاہئے اور اگر انہیں مادی اجر نہ ملے تو وہ یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ ان پر ظلم ہوا ہے کیونکہ اصلی اجر تو وہ ہے جو آئندہ زندگی میں انسان کے انتظار میں ہے۔ شاید اسی اشتباہ رفع کرنے اور اس توبہ کو دور کرنے کے لئے قرآن زیر بحث آیات میں حضرت یوسف (ع) کے دنیاوی اجر کا ذکر کر کے بعد مزید فرماتا ہے :

ولاجر الآخرة خیر للذین آمنوا وکانوا یتقون  
اہل ایمان اور صاحبان تقویٰ کے لئے اجر آخرت برتر و بہتر ہے۔

۶۔ قیدیوں کے حقوق کی حمایت :

قید خانوں میں ہمیشہ نیک لوگ ہی نہیں رہے۔ ان میں کبھی بے گناہ رہے ہیں اور کبھی مجرم لیکن ہر صورت میں اصول انسانی کا تقاضا ہے کہ انسانی حقوق کو ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ آج کی دنیا یہ سمجھے کہ قیدیوں کے حقوق کی آواز اسی دور میں بلند ہوئی ہے لیکن اسلام کی پر افتخار تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبر اکرم نے اپنی حکومت کی ابتدائی میں قیدیوں کے بارے میں نصیحتیں فرمائیں نیز حضرت علی (ع) نے اپنے ظالم قاتل عبد الرحمن بن ملجم مرادی کے بارے میں جو وصیت فرمائی وہ تو ہم سب نے سنی ہے کہ آپ (ع) نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے یہاں تک کہ آپ (ع) نے اپنے لئے آنے والا دودھ اس کے لئے بھیجا اور اسے قتل کرنے کے بارے میں فرمایا: اسے ایک سے زیادہ ضرب نہ لگائی جائے کیونکہ اس نے صرف ایک ضرب لگائی ہے۔ حضرت یوسف (ع) بھی جب قید خانہ میں تھے تو آپ قیدیوں کے لئے مہربان رفیق ، دلسوز ساتھی اور خیر خواہ مشیر تھے اور جب آپ قید خانہ سے جانے لگے تو سب سے پہلے آپ نے دنیا کی توجہ قیدیوں کے حالت کی طرف مبذول

کرائی اور ان کے حقوق کی حمایت کی اور ان سے اظہارِ ہمدردی کیا۔ آپ نے حکم کہ قید خانہ کے دروازے پر عبارت لکھیں :

هَذَا قَبْرُ الْأَحْيَاءِ، وَبَيْتُ الْأَحْزَانِ وَتَجْرِبَةُ الْأَصْدِقَاءِ وَشِمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ

یہ زندوں کا قبرستان ہے غموں کا گھر ہے ، دوستوں کی آزمائش گاہ ہے اور دشمنوں کی سرزنش کی جگہ ہے۔ 5 - حضرت یوسف (ع) نے یہ دعا کرتے ہوئے قیدیوں سے اپنے لگاؤ کاظہار کیا :

اللهم اعطف عليهم بقلوب الاخيار ، ولا تعم عليهم الاخبار -

بارالہا ! اپنے نیک بندوں کے دل ان کی طرف متوجہ کر دے اور ان سے خبروں کو پوشیدہ نہ رکھ۔ 6

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

فَذَلِكْ يَكُونُ اصْحَابُ السَّجْنِ اعْرِفِ النَّاسَ بِالْاِخْبَارِ فِي كُلِّ بَلَدَةٍ

یہی وجہ ہے کہ ہر شہر میں قیدی اس شہر کی خبروں کے بارے میں دوسروں سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں۔

اس بات کو خود ہم نے قید کے دوران آزمایا ہے۔ استثنائی مواقع کے علاوہ قیدیوں تک ایسی ایسی خبریں عجیب مخفی طریقوں سے پہنچ جاتی تھیں کہ جن سے قید خانے کے مامور آگاہ نہیں ہوتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قید خانے میں آنے والے نئے قیدیوں کو قید خانے میں ایسی خبریں سننے کو ملتیں جن سے وہ باہر آگاہ نہ ہوتے تھے۔ اب اگر ہم اس کی مثالوں میں پڑ گئے تو مقصد سے دور ہو جائیں گے۔

.....

1- وسائل الشیعیہ جلد 2 ص 139 ( سفینة البحار جلد 2 ص 252 پر اسی قسم کا مضمون امام کاظم علیہ السلام سے علی بن یقظین کے بارے میں منقول ہے )۔

یہ روایت بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

2- کئی ایک روایات جو امام علی بن موسیٰ رضا (ع) سے منقول ہیں ، میں ہے کہ کچھ افراد جو اسلامی معیاروں سے نا آشنا تھے بعض اوقات آپ (ع) پر اعتراض کرتے کہ آپ (ع) نے اس زہد و تقویٰ اور دنیا سے بے اعتنائی کے باوجود ماموں کی ولی عہدی کو قبول کر لیا ہے۔ امام (ع) نے جواب میں فرمایا: کیا پیغمبر افضل ہے یا وصی پیغمبر؟ انہوں نے کہا نہیں پیغمبر ہی افضل ہے۔ فرمایا: کون افضل ہے مسلمان یا مشرک؟ انہوں نے عرض کیا: مسلمان، فرمایا عزیز مصر مشرک تھا اور یوسف پیغمبر تھے اور مومون (ظاہراً) مسلمان ہے اور میں پیغمبر کا وصی ہوں اور یوسف (ع) نے عزیز مصر سے چاہا کہ انہیں مصر کے خزانوں پر ماموں کریں اور کہا کہ میں حفیظ و علیم ہوں اور جب کہ میں اس منصب کو قبول کرنے پر مجبور تھا۔ ( وسائل الشیعیہ جلد 12 ص 146 )۔

3- اس حدیث کو اختصار سے ذکر کیا گیا ہے اور صرف مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ یہ امام علی بن موسیٰ رضا (ع) سے منقول ہے۔ تفسیر مجمع البیان جلد 5 ص 244۔ کی طرف رجوع فرمائیں۔

4- تفسیر التقلین جلد 2 ص 433۔

5- نور التقلین ، جلد 2 ص 432۔

6- نور التقلین ، جلد 2 ص 432۔

تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ یوسف/ 58 تا 62

58- وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ-

59- وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ أَالآتَرُونَ أَنِّي أُوْفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ-

60- فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَاكَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِي-

61- قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ-

۶۲۔ وَقَالَ لِفَتْيَانِهِ اجْعَلُوا بَضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔

ترجمہ

۵۸۔ اور یوسف (ع) کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے۔ اس نے انہیں پہچان لیا لیکن وہ اسے نہ پہچان پائے۔  
۵۹۔ جب (یوسف) ان کے بار تیار کر چکا تو کہا (اُتدہ جب اُوْتو) تمہارا جو باپ کی طرف سے بھائی ہے اسے میرے پاس لانا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پیمانے کا حق ادا کرتا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں۔  
۶۰۔ اور اگر تم اسے میرے ہاں نہ لاؤ تو پھر میرے پاس تمہارے نہ کوئی کیل (اور غلے کا پیمانہ) ہوگا اور نہ ہی (تم ہرگز) میرے پاس آنا۔  
۶۱۔ انہوں نے کہا ہم اس کے باپ سے بات کریں گے (اور کوشش کریں گے کہ وہ مان جائے) اور ہم یہ کام کریں گے۔  
۶۲۔ پھر اس نے اپنے کارندوں سے کہا: جو کچھ انہوں نے قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان میں رکھ دو شاید اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ کر وہ اسے پہچانیں اور شاید پلٹ آئیں۔

یوسف (ع) کی بھائیوں کو نئی تجویز

آخر کار جیسا کہ پیش گوئی ہوئی تھی سات سات پے در پے بارش ہونے کے سبب اور دریائے نیل کے پانی میں اضافے کے باعث مصر کی زرعی پیداوار خوب تسلی بخش ہو گئی۔ مصر کا خزانہ اور اقتصادی امور حضرت یوسف (ع) کے زیر نظر تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ غذائی اجناس کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے چھوٹے بڑے گودام بنائے جائیں۔ آپ نے عوام کو حکم دیا کہ پیداوار سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لیں اور باقی حکومت کے پاس بیچ دیں۔ اس طرح گودام غلے سے بھر جائیں گے۔

نعمت و برکت کی فراوانی کے یہ سات سال گزر گئے اور قحط سالی اور خشک سالی کا منحوس دور شروع ہوا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے آسمان زمین کے لئے بخیل ہو گیا ہے۔ کھیتیاں اور نخلستان خشک ہو گئے۔ عوام کو غلے کی کمی کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ جانتے تھے کہ حکومت نے غلے کے ذخائر جمع کر رکھے ہیں لہذا وہ اپنی مشکلات حکومت ہی کے ذریعے دور کرتے تھے۔ حضرت یوسف (ع) بھی پوری منصوبہ بندی اور پروگرام کے تحت غلہ فروخت کرتے تھے اور عادلانہ طور پر ان کی ضرورت پوری کرتے تھے۔

یہ خشک سالی صرف مصر ہی میں نہ تھی اطراف کے ملکوں کا بھی یہی حال تھا فلسطین اور کنعان مصر کے شمال مشرق میں تھے۔ وہاں کے لوگ بھی انہی مشکلات سے دور چار تھے۔ حضرت یعقوب کا خاندان بھی اسی علاقہ میں سکونت پذیر تھا۔ وہ بھی غلے کی کمی سے دو چار ہو گیا۔

حضرت یعقوب (ع) نے ان حالات میں مصمم ارادہ کیا کہ بنیامین کے علاوہ باقی بیٹیوں کو مصر کی طرف بھیجیں۔ یوسف کی جگہ اب بنیامین ہی ان کے پاس تھا۔ بہت حال وہ لوگ مصر کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ بولنے اور بعض مفسرین کے بقول اٹھارہ دن کی مسافت کے بعد مصر پہنچے۔

جیسا کہ تواریخ میں ہے، ضروری تھا کہ ملک سے باہر سے آنے والے افراد مصر میں داخل ہوتے وقت اپنی شناخت کروائیں تاکہ مامورین حضرت یوسف (ع) کو مطلع کریں۔ جب مامورین نے فلسطین کے قافلہ کی خیر دی تو حضرت یوسف (ع) نے دیکھا کہ غلے کی درخواست کرنے والوں میں ان کے بھائیوں کے نام بھی ہیں۔ آپ انہیں پہچان گئے اور یہ ظاہر کئے بغیر کہ وہ آپ کے بھائی ہیں، آپ نے حکم دیا کہ انہیں حاضر کیا جائے اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: یوسف (ع) کے بھائی آئے اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں پہچان لیا لیکن انہوں نے اسے نہیں پہچانا (وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكَرُونَ)۔

وہ یوسف (ع) نہ پہچاننے میں حق بجانب تھے کیونکہ ایک طرف تو تیس یا چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا (اس دن سے لیکر جب انہوں نے حضرت یوسف (ع) کو کنوئیں میں پھینکا تھا ان کے مصر میں آنے تک) اور دوسری طرف وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کا بھائی عزیز مصر ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اسے اپنے بھائی کے مشابہ بھی پاتے تو ایک اتفاق ہی سمجھتے۔ ان تمام امور سے قطع نظر حضرت یوسف (ع) کے لباس کا اندازہ بھی بالکل بدل چکا تھا، انہیں مصریوں کے نئے لباس میں پہچاننا کوئی آسان کام نہیں تھا بلکہ یوسف (ع) کے ساتھ جو کچھ ہو گزرا تھا اس کے بعد ان کی زندگی کا احتمال بھی ان کے لئے بہت بعید تھا۔

بہر حال انہوں نے اپنی ضرورت کا غلہ خریدا اور اس کی قیمت نقدی کی صورت میں اور یا موزے، جوتے یا کچھ اجناس کی صورت میں ادا کی کہ جو وہ کنعان سے مصر لائے تھے۔

حضرت یوسف (ع) نے اپنے بھائیوں نے بہت محبت کا برتاؤ کیا اور ان سے بات چیت کرنے لگے۔ بھائیوں نے کہا: ہم دس

بھائی ہیں اور حضرت یعقوب (ع) کے بیٹے ہیں ہمارے والد خدا کے عظیم پیغمبر ابراہیم (ع) خلیل کے پوتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے باپ کو پہچانتے ہوئے تو ہمارا بہت احترام کرتے۔ ہمارا بوڑھا باپ انبیاء الہی میں سے ہے لیکن ایک نہایت گہرے غم نے ان کے پورے وجود کو گھیر رکھا ہے۔

حضرت یوسف (ع) نے پوچھا :

یہ غم کس بنا پر ہے۔

انہوں نے کہا :

اس کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ عمر میں وہ ہم سے بہت چھوٹا تھا۔ ایک دن ہمارے ساتھ شکار اور تفریح کے لئے صحرا میں گیا۔ ہم اس سے غافل ہو گئے تو ایک بھیڑیا اسے چیر پھا گیا۔ اس دن سے لے کر آج تک اس کے لئے گریاں اور غمگین ہے۔

بعض مفسرین نے اس طرح سے نقل کیا ہے :

حضرت یوسف (ع) کی عادت تھی کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بارے سے زیادہ غلہ نہیں بیچتے تھے۔ حضرت یوسف (ع) کے بھائی چونکہ دس تھے لہذا انہیں غلے کے دس بار دئیے گئے۔

انہوں نے کہا : ہمارا بوڑھا باپ ہے اور ایک چھوٹا بھائی ہے جو وطن میں رہ گیا ہے۔ باپ غم و اندوہ کی شدت کی وجہ سے سفر نہیں کر سکتا اور چھوٹا بھائی خدمت کے لئے اور مانوسیت کی وجہ سے اس کے پاس رہ گیا۔ لہذا ان دونوں کا حصہ بھی ہمیں دیدیجئے۔

حضرت یوسف (ع) نے حکم دیا کہ دو اونٹوں کے بار کا اضافہ کیا جائے۔ پھر حضرت یوسف (ع) ان کی طرف متوجہ ہوئے اور رکھا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہوشمند اور مؤدب افراد ہو اور یہ جو تم کہتے ہو کہ تمہارے بھائی کو تمہارے سب سے چھوٹے بھائی سے لگاؤ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی اور عام بچوں سے ہٹ کر ہے میری خواہش ہے کہ تمہارے آئندہ سفر میں اسے ضرور دیکھوں۔ علاوہ ازیں یہاں کے لوگوں کو تمہارے بارے میں کئی بدگمانیاں ہیں کیونکہ تم ایک دوسرے ملک سے تعلق رکھتے ہو لہذا بدظنی کی اس فضا کو دور کرنے کے لئے آئندہ سفر میں چھوٹے بھائی کو نشانی کے طور پر ساتھ لے آنا۔

یہاں قرآن کہتا ہے: جب یوسف (ع) نے ان کے بار تیار کئے تو ان سے کہا: تمہارا بھائی جو باپ کی طرف سے ہے اسے میرے پاس لے آؤ (وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ قَالَ أَتُونِي بِأَخٍ لَّكُمْ مِّنْ أَبِيكُمْ)۔

اس کے بعد مزید کہا: کیا تم دیکھتے ہیں ہو کہ میں پیمانہ کا حق ادا کر تا ہوں اور میں بہترین میزبان ہوں (وَلَا تَرَوُنَّ أُنَىٰ أَوْفَىٰ الْكَيْلِ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ)۔

اس تشویق اور اظہار محبت کے بعد انہیں یوں تہدید بھی کی: اگر اس بھائی کو میرے پاس نہ لائے تو نہ تمہیں میرے پاس سے غلہ ملے گا اور نہ تم خود میرے پاس پہنکنا (فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِي)۔

حضرت یوسف (ع) چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو بنیامین کو اپنے پاس بلائیں۔ اس کے لئے کبھی وہ لطف و محبت کا طریقہ اختیار کرتے اور کبھی تہدید کا۔

ان تعبیرات سے ضمنی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ مصر میں غلات کی خرید و فروخت تول کر نہیں ہوتی تھی بلکہ پیمانے سے ہوتی تھی۔

نیز یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف (ع) اپنے بھائیوں اور دوسرے مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے پذیرائی کرتے تھے اور ہر حوالے سے مہمان نواز تھے۔

بھائیوں نے ان کے جواب میں کہا: ہم اس کے باپ سے بات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ وہ رضامند ہو جائیں اور ہم یہ کام ضرور کریں گے (قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ)۔

”انا لفاعلون“ کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ انہیں یقین تھا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے باپ کو راضی کر لیں گے اور ان کی موافقت حاصل کر لیں گے۔ اسی لئے وہ عزیز مصر ایسا کا وعدہ کر رہے تھے اور ایسا ہی ہونا چاہتے تھے کیونکہ جب وہ اپنے اصرار اور آہ و زاری سے یوسف (ع) کو اپنے باپ سے لے جاسکتے تھے تو بنیامین کو کیونکر ان سے جد انہیں کر سکتے تھے۔

اس موقع پر ان کی ہمدردی اور توجہ کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے حضرت یوسف (ع) نے ”اپنے کارندوں سے کہا کہ ان کی نظر بچا کر وہ اموال ان کے غلے میں رکھ دیں جو انہوں نے اس کے بدلے میں دئیے تھے تاکہ جب وہ واپس اپنے خاندان میں جا کر اپنا سامان کھولیں تو انہیں پہچان لیں اور دوبارہ مصر کی طرف لوٹ آئیں (وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ

اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رَحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ) -

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یوسف (ع) نے بھائیوں نے اپنا تعارف کیوں نہیں کروا یا :

مندرجہ بالا آیات کے مطالعہ سے جو پہلا سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف (ع) نے بھائیوں نے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا کہ وہ جلد از آپ کو پہچان لیتے اور باپ کے پاس واپس جاکر انہیں آپ کی جدائی کے جانکاہ غم سے نکالتے ؟

یہ سوال زیادہ وسیع حوالے سے بھی سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ جس وقت حضرت یوسف (ع) کے بھائی آپ کے پاس آئے اس وقت آپ کی زندان سے رہائی کو کوئی اٹھ سال گزر چکے تھے کیونکہ گزشتہ سات سال فراوان نعمتوں پر مشتمل گزر چکے تھے جن کے دوران آپ قحط سالی کے عرصے کے لئے اناج ذخیرہ کرنے میں مشغول تھے۔ اٹھویں سال قحط کا دور شروع ہوا۔ اس سال یا اس کے بعد آپ کے بھائی غلہ لینے کے لئے مصر آئے۔ کیا چاہیے نہ تھا کہ ان اٹھ سالوں میں آپ کوئی قاصد کنعان کی طرف بھیجتے اور اپنے والد کو اپنے حالات سے آگاہ کرتے اور انہیں شدید غم سے نجات دلاتے ؟

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں ، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور اس سلسلے میں کئی جوابات پیش کئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ بہتر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت یوسف (ع) کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی کیونکہ فراق یوسف (ع) دیگر پہلوؤں کے علاوہ حضرت یعقوب کے لئے ایک امتحان بھی تھا اور ضروری تھا کہ آزمائش کا یہ دور فرمان الہی سے ختم ہوا اور اس کے پہلے حضرت یوسف (ع) خیر دینے کے مجاز نہ تھے۔

علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف (ع) فوراً ہی اپنے بھائیوں کو اپنا تعارف کروادیتے تو ممکن تھا کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوتا اور ہوسکتا تھا کہ وہ اس سے ایسے وحشت زدہ ہوتے کہ پھر لوٹ کر آپ کے پاس نہ آتے کیونکہ انہیں یہ خیال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے یوسف (ع) ان کے گزشتہ رویہ کا انتقال لیں۔

۲۔ غلہ کی قیمت کیوں واپس کر دی :

حضرت یوسف (ع) نے یہ حکم کیوں دیا تھا کہ جو مال ان کے بھائیوں نے غلے کی قیمت کے طور پر دیا ہے وہ ان کے سامان میں رکھ دیا جائے ؟

اس سوال کے بھی کئی جواب دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے فخر الدین رازی نے اپنے تفسیر میں دس جوابات ذکر کئے ہیں۔ بعض تو ان میں سے غیر مناسب ہیں البتہ خود مذکورہ آیت نے اس سوال کا جواب دیا ہے: ”لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ“۔

یعنی حضرت یوسف (ع) کا مقصد یہ تھا کہ جب وہ وطن واپسی پر اپنا سامان دیکھیں گے تو انہیں عزیز مصر ( حضرت یوسف (ع) ) کی کرم نوازی کا پہلے سے زیادہ احساس ہو اور اسی بنیاد پر وہ دوبارہ آپ کے پاس آجائیں یہاں تک کہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی پورے اطمینان قلب سے اپنے ساتھ لے آئیں اور خود حضرت یعقوب (ع) بھی یہ بات دیکھ کر بنیامین کو بڑے اعتماد سے مصر روانہ کر دیں۔

۳۔ حضرت یوسف (ع) نے بیت المال کا مال کیوں بلا معاوضہ دے دیا؟ :

ایک اور سوال جو یہاں سامنے آتا ہے یہ ہے کہ حضرت یوسف (ع) نے اپنے بھائیوں کو بیت المال کا کچھ حصہ کیوں بلا معاوضہ دے دیا۔

اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے :

پہلا یہ کہ مصر کے بیت المال میں مستضعفین کا حق تھا ( اور ہمیشہ ہوتا ہے ) اور مختلف ممالک میں موجود سرحدوں سے یہ حق ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت یوسف (ع) اپنے بھائیوں کے لئے جو اس وقت مستضعف تھے اس حق سے استفادہ کیا جیسا کہ وہ دیگر مستضعفین کے لئے بھی کرتے تھے۔

دوسرا یہ کہ حضرت یوسف (ع) اس وقت ایک حساس منصب پر تھے جس کی بناء پر ذاتی طور پر بھی ان کے کچھ حقوق تھے ، ان کا کم از کم یہ حق تھا کہ وہ اپنے معاشی ضروریات کا ، اپنے ضرورت مند اہل و عیال کا اور اپنے باپ اور بھائیوں جیسے رشتہ داروں کی کم از معاشی زندگی کا خیال رکھیں اسی بناء پر آپ نے اس بخشش و عطا میں اپنے حق سے

۶۳۔ فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَانًا نَّكَتَلُ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔  
 ۶۴۔ قَالَ هَلْ أَمْنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمْنُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ فَأَنشَأَهُ خَيْرٌ خَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ۔  
 ۶۵۔ وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانًا وَتَزِدُّوا  
 كَيْلَ بَعِيرٍ ذَلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ  
 ۶۶۔ قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِي مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ۔

ترجمہ

۶۳۔ جب وہ اپنے والد کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا : ابا جان ! ہم سے ( غلے کا ) پیمانہ روک دیا گیا ہے لہذا ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے گا تاکہ ہم ( غلے کا ) حصہ لے سکیں اور ہم اس کی حفاظت کریں گے ۔  
 ۶۴۔ اس نے کہا کہ کیا میں اس کے بارے میں تم پر بھروسہ کر لوں جیسا کہ اس کے بھائی ( یوسف ) کے بارے میں میں تم پر بھروسہ کیا تھا اور ( میں نے دیکھا کہ کیا ہوا اور بہر حال ) خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے ۔  
 ۶۵۔ اور جس وقت انہوں نے اپنا مال و متاع کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا سرمایہ انہیں واپس کر دیا گیا ہے ۔ انہوں نے کہا : ابا جان ! ہمیں اور کیا چاہیے یہ ( دیکھئے ) ہمارا سرمایہ جو ہمیں واپس کر دیا گیا ہے ( لہذا کیا ہی اچھا ہے کہ بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے ) اور ہم اپنے گھر والوں کے لئے اناج لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور زیادہ بڑا پیمانہ حاصل کریں گے ، یہ تو چھوٹا پیمانہ ہے ۔  
 ۶۶۔ اس نے کہا میں ہر گز اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک کہ مجھ سے پکا خدائی وعدہ نہ کرو کہ اسے حتماً میرے پاس لے آؤ گے مگر یہ کہ ( موت یا کسی اور سبب سے ) تم سے قدرت سلب ہو جائے اور جس وقت انہوں نے اس سے قابل و وثوق وعدہ کر لیا تو اس نے کہا : جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں خدا اس پر ناظر و حافظ ہے ۔

آخر کار باپ راضی ہو گئے

حضرت یوسف (ع) کے بھائی مالا ہو کر خوشی خوشی کنعان واپس آئے لیکن آئندہ کی فکر تھی کہ اگر باپ چھوٹے بھائی (بنیامین) بھیجنے پر راضی نہ ہوئے تو عزیز ان کی پذیرائی نہیں کرے گا اور انہیں غلے کا حصہ بھی نہیں دے گا ۔  
 اسی لئے قرآن کہتا ہے : جب وہ باپ کے پاس لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا ابا جان ! حکم دیا گیا ہے کہ آئندہ ہمیں غلے کا حصہ نہ دیا جائے اور پیمانہ ہم سے روک دیا جائے ( فَلَمَّا رَجَعُوا إِلَىٰ أَبِيهِمْ قَالُوا يَا أَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ ) ۔ اب جب یہ صورت در پیش ہے ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ ہم پیمانہ حاصل کر سکیں ( فَأَرْسِلْ مَعَنَا آخَانًا نَّكَتَلُ ) ۔ ۱۔  
 اور آپ مطمئن رہیں ہم اس کی حفاظت کریں گے ( وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ) ۔  
 باپ کہ جسے یوسف (ع) ہر گز نہ بھولتا تھا یہ بات سن کر پریشان ہو گیا ، ان کی طرف رخ کر کے اس نے کہا : کیا میں تم پر اس بھائی کے بارے میں بھروسہ کر لوں کہ اس کے بھائی یوسف (ع) کے بارے میں گزشتہ زمانے میں تم پر بھروسہ کیا تھا ( قَالَ هَلْ أَمْنُكُمْ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمْنُكُمْ عَلَىٰ أَخِيهِ مِنْ قَبْلُ ) ۔  
 یعنی جب تمہارا ایسا بر اماضی ہے کہ جو بھولنے کے قابل نہیں تو تم کس طرح توقع رکھتے ہو کہ دوبارہ تمہاری فرمائش مان لوں اور اپنے فرزند دلیند کو تمہارے سپرد کروں اور وہ بھی ایک دور دراز سفر اور پرانے دیس کے لئے ۔ اس کے بعد اس نے مزید کہا : ہر حالت میں خدا بہترین محافظ اور ارحم الراحمین ہے ۔  
 ( فَأَنشَأَهُ خَيْرٌ خَافِظًا وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ) ۔

ہوسکتا ہے یہ جملہ اس طرف اشارہ ہو کہ تم جیسے بڑے ماضی والے افراد کے ساتھ میرے لئے مشکل ہے کہ بنیامین کو بھیجوں اور بھیجوں گا ، بھی تو خدا کی حفاظت میں اور اس کے ارحم الراحمین ہونے کے بھروسے پر نہ کہ تمہارے بھروسے پر ۔

لہذا مندرجہ بالا جملہ ان کی فرمائش قبول کرنے کی طرف قطعی اشارہ نہیں ہے بلکہ ایک احتمالی بات ہے کیونکہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب (ع) نے ابھی تک ان کی فرمائش قبول نہ کی تھی اور آپ نے پختہ عہد لینے اور پیش آمدہ دیگر واقعات کے بعد اسے قبول کیا۔

دوسرا یہ کہ ممکن ہے حضرت یوسف (ع) کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس موقع پر انہیں یوسف (ع) یاد آگئے اور وہ پہلے سے بھی جانتے تھے کہ وہ زندہ ہیں (اور بعد والی آیات میں بھی ہم پڑھ گئے ہیں کہ انہیں حضرت یوسف (ع) کے زندہ ہونے کا اطمینان تھا ) لہذا آپ نے ان کے محفوظ و سلامت رہنے کی دعا کی کہ خدا یا ! وہ جہاں کہیں بھی ہیں انہیں سلامت رکھ۔

پھر ان بھائیوں نے جن اپنا سامان کھولاتو انہوں نے بڑے تعجب سے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں جو انہوں نے غلے کی قیمت کے طور پر عزیز مصر کو دی تھیں سب انہیں لوٹا دی گئی ہیں اور وہ ان کے سامان میں موجود ہیں ( وَ لَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ) ۔

جب انہوں نے دیکھا کہ یہ تو ان کی گفتگو پر سند قاطع ہے تو باپ کے پاس آئے اور ” کہنے لگے : ابا جان ! ہمیں اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے ، دیکھئے انہوں نے ہمارا تمام مال و متاع ہمیں واپس کر دیا ہے “۔ ( قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي هَذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ) 2

کیا اس سے بڑھ کر کوئی عزت و احترام اور رمہر بانی ہو سکتی ہے کہ ایک غیر ملک کا سر براہ ایسے قحط اور خشک سالی میں ہمیں اناج بھی دے اور اس کی قیمت بھی واپس کر دے ، وہ بھی ایسے کہ ہم سمجھ ہی نہ پائیں اور شرمندہ نہ ہوں ؟ اس سے بڑھ کر ہم کیا تصور کرسکتے ہیں ؟ ؟

ابا جان ! اب کسی پریشانی کی ضرورت نہیں ۔ ہمارے ساتھ بھیج دیں ” ہم اپنے گھر والوں کے لئے اناج لے آئیں گے “۔ ( وَ تَمِيرُ أَهْلَنَا ) ۲۔

۲۔ ” تمیر “ میرہ “ مادہ سے کھانا اور غذائی مواد حاصل کرنے کے معنی میں ہے ۔

اور اپنے بھائی کی حفاظت کی کوشش کریں گے “ وَ نَحْفَظُ أَخَانَا ) ۔ نیز اس کی وجہ سے ایک اونٹ کا بار بھی زیادہ لائیں گے ۔ ( وَ نَزِدَادُ كَيْلٌ بَعِيرٍ ) ۔ اور عزیز مصر جیسے محترم ، مہربان اور سخی شخص کے لئے کہ جسے ہم نے دیکھا ہے ایک آسان اور معمولی کام ہے ( ذَلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ) ۔

۳۔ ” ذلک کیل یسیر “ میں یہ احتمال بھی ہے کہ حضرت یوسف (ع) کے بھائیوں کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ لے آئے ہیں یہ تو تھوڑا سا پیمانہ ہے اگر ہمارا چھوٹا بھائی ہمارے ساتھ چلے تو ہم زیادہ غلہ حاصل کرسکتے ہیں ۔

ان تمام امور کے باوجود حضرت یعقوب (ع) اپنے بیٹے بنیامین کو ان کے ساتھ بھیجنے کے لئے راضی نہ تھے لیکن دوسری طرف ان کا اصرار تھا جو واضح منطق کی بنیاد پر تھا ۔ یہ صورت حال انہیں آمادہ کرتی تھی کہ وہ ان کی تجویز قبول کر لیں ۔ آخر کار انہوں نے دیکھا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں کہ مشروط طور پر بیٹے کو بھیج دیا جائے ۔ لہذا آپ نے انہیں اس طرح سے ” کہا : میں اسے ہر گز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا ، جب تک کہ تم ایک خدائی پیمانہ نہ دو اور کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے مجھے اعتماد پیدا ہو جائے کہ تم اسے واپس لے کر آؤ گے مگر یہ کہ موت یا موت یا اور عوامل کی وجہ سے یہ امر تمہارے بس میں نہ رہے ( قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّى تُؤْتُونِي مَوْثِقًا مِنْ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ ) ۔ ” مَوْثِقًا مِنْ اللَّهِ “ سے مراد وہی قسم ہے جو خدا کے نام کے ساتھ ہے ۔

” الا ان يحاط بكم “ کامعنی اصل میں یہ ہے :

” مگر یہ کہ جو حوادث سے مغلوب ہو جاؤ “۔

یہ جملہ ہوسکتا ہے موت یا ایسے دوسرے حوادث کے لئے کنایہ ہو جو انسان کو بے بس کر دیں ۔ 3  
واحیط بئمرہ ( کہف - ۴۲ ) لیکن واضح زیر بحث آیات میں مراد بالخصوص بلاکت نہیں ہے بلکہ ایسا عذر ہے جس کے باعث انسان کا اختیار ختم ہو جائے ۔

یہ استثناء حضرت یعقوب (ع) کی عظیم دانائی کی علامت ہے ۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنے بیٹھے بنیامین سے اس قدر محبت رکھتے تھے انہوں نے اپنے دوسرے بیٹوں کو ایسی مشکل میں نہیں ڈالا جو ان کے بس میں نہ ہو لہذا کہا کہ میں تم سے اپنا بیٹا چاہتا ہوں مگر یہ کہ ایسے حوادث پیش آجائیں جو تمہاری قدرت سے ماوراء ہوں اس صورت میں تمہارا کوئی

گناہ نہ ہو گا۔

واضح ہے کہ اگر ان میں سے بعض کسی حادثے میں گرفتار ہو جاتے اور ان سے قدرت چھن جاتی تو باقی رہ جائے والوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ باپ کی امانت اس تک پہنچا دیں ، اسی لئے حضرت یعقوب (ع) کہتے ہیں : مگر یہ کہ تم سب حوادث سے مغلوب ہو جاؤ ۔

بہر حال یوسف (ع) کے بھائیوں نے باپ کی شرط قبول کر لی اور جب انہوں نے اپنے والد سے عہدو پیمان باندھا تو یعقوب (ع) نے کہا : شاہد ، ناظر اور محافظ ہے ، اس بات پر کہ جو ہم کہتے ہیں ( فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ) ۔

.....

- ۱۔ ”نکتل“ اصل میں ”کیل“ کے مادہ سے ”نکتال“ تھا یہ پیمانے سے کوئی چیز حاصل کرنے کے معنی میں ہے لیکن ”کال“ پیمانے سے کوئی دینے کے معنی میں ہے ۔
- 2۔ یوسکتا ہے ”ماتیغی“ استفہامیہ جملہ ہو اور اس کی تقدیر ”ماتیغی وراء ذلک“ ( ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے ) ہو اور یہ بھی یوسکتا ہے کہ نافیہ ہو اور اس کی تقدیر اس طرح ہو : ”ماتیغی بذلک الذکب۔ او۔ ماتیغی منک دراهم“ (ہم جھوٹ نہیں بولنا چاہتے یا یہ کہ ہم اور پیسے آپ سے نہیں چاہتے یہی مال کافی ہے ۔
- 3۔ یہ تفسیر قرآن مجید میں کئی مقامات پر صرف بلاکت او رنابودی کے معنی میں استعمال ہوئی ہے مثلاً وظنوا انهم احیط بهم ( یونس ۲۲۔ )

چند اہم نکات

۱۔ حضرت یعقوب (ع) کیسے راضی ہو گئے :

مندرجہ بالا آیات کے سلسلے میں جو پہلا سوال ذہن میں آتا ہے یہ ہے کہ حضرت عقوب (ع) بنیامین کو ان کے سپرد کرنے پر کیسے آمادہ ہو گئے جب کہ ان کے بھائی یوسف (ع) کے بارے میں اپنے سلوک کی وجہ سے پہلے برے کردار کے شمار ہوتے تھے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صرف یوسف (ع) کے بارے میں اپنے دل میں کینہ و حسد نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ یہی احساسات اگر چہ نسبتاً خفیف ہی سہی بنیامین کے لئے بھی رکھتے تھے ۔ چنانچہ اس سورہ کی ابتدائی آیات میں ہے :

اذقالوا لیوسف و اخوه احب الیٰ ابینا منا و نحن عصبۃ

انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی باپ کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہے جب کہ ہم زیادہ طاقتور ہیں ۔ اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف (ع) والے حادثے کو تیس سے چالیس سال تک کا عرصہ بیت چکا تھا اور حضرت یوسف (ع) کے جو ان بھائی بڑھاپے کو پہنچ گئے تھے اور فطرتاً ان کے ذہن پہلے زمانے کی نسبت پختہ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں گھر کے ماحول پر اور اپنے مضطرب وجدان پر اپنے برے ارادے کے اثرات وہ اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے اور تجربے نے ان پر ثابت کر لیا کہ یوسف (ع) کے فقدان سے نہ صرف یہ کہ ان کے لئے باپ کی محبت میں اضافہ ہوا بلکہ مزید مہری اور بے التفاتی پیدا ہو گئی ۔ ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تو ایک زندگی کا مسئلہ ہے ۔ قحط سالی میں ایک گھرانے کے لئے اناج مہیا کرنا ایک بہت بڑی چیز تھی اور یہ سیر و تفریح کا معاملہ نہ تھا جیسا کہ انہوں نے ماضی میں حضرت یوسف (ع) کے متعلق فرمائش کی تھی ۔

ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر حضرت یعقوب (ع) نے ان کی بات مان لی لیکن شرط کے ساتھ کہ آپ سے عہد و پیمان باندھیں کہ وہ اپنے بھائی بنیامین کو صحیح و سالم آپ کے پاس واپس لے آئیں گے ۔

۲۔ کیا صرف ایک قسم کافی تھی ؟

دوسرا سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف قسم کھا لینا اور خدائی پیمان باندھ لینا کافی تھا کہ جس کی بنیاد پر بنیامین کو ان کے سپرد کر دیا جاتا ۔ ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم ہے کہ عہدو پیمان اور قسم کھا لینا ہی کافی نہیں تھا لیکن قرآن و شواہد نشاندہی کرے تھے کہ اس دفعہ ایک حقیقت پیش نظر ہے نہ کہ سازش ، مکر و فریب اور جھوٹ ۔ اس لئے وعدہ اور قسم زیادہ تاکید کے لئے تھی ۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی اشخاص سے مثلاً صدر مملکت اور اسمبلی کے ارکان سے ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے حلف و وفا داری لیا جاتا ہے جب کہ ان کے انتخاب میں بھی کافی دیکھ بھال سے کام لیا جاتا ہے ۔

۶۷۔ وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ .

۶۸۔ وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا وَإِنَّهُ لَدُوُّ عَلِيمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

ترجمہ

۶۷۔ (جب وہ جانے لگے تو یعقوب (ع) نے ) کہا : میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا ، بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا اور ( میں یہ حکم دے کر ) خدا کی طرف سے حتمی حادثے کو نہیں ٹال سکتا۔ حکم اور فرمان صرف خدا کی طرف سے جاری ہوتا ہے ۔ اس پر میں نے توکل کیا ہے اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے ۔

۶۸۔ اور جب اسی طریقے سے جیسا کہ انہیں باپ نے حکم دیا تھا وہ داخل ہوئے تو یہ کام ان سے کسی حتی خدائی حادثے کو دور نہیں کر سکتا تھا سوائے اس حاجت کے جو یعقوب (ع) کے دل میں تھی ، ( جو اس طرح سے ) انجام پائی ( اور اس کے دل کو تسکین ہوئی ) اور وہ اس تعلیم کی برکت سے جو ہم نے اسے دی بہت سا علم رکھتا تھا جب کہ اکثر لوگ نہیں جانتے ۔

تفسیر

آخر کار حضرت یوسف (ع) کے بھائی باپ کی رضا مندی کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کو ہمراہ لے کر دوسری مرتبہ مصر جانے کو تیار ہوئے تو اس موقع پر باپ نے انہیں نصیحت کی ۔ ” اس نے کہا : میرے بیٹو ! تم ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا “

( وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ ) .

اور مزید کہا : ” یہ حکم دے کر میں خدا کی طرف سے کسی حتمی حادثے کو تم سے ہر طرف نہیں کر سکتا “ ( وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ) . لیکن ناگوار حادثے کا ایک سلسلہ ایسا ہے جس سے بچا جا سکتا ہے اور ان کے متعلق خدا کا حتمی حکم صادر نہیں ہوا ۔

میرا مقصد یہ ہے کہ ایسے حوادث تم سے دور ہیں اور ایسا ہونا ممکن ہے ۔

آخر میں کہا : ” حکم اور فرمان خدا کے ساتھ مخصوص ہے “ ( إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ) ۔ ” میں نے خدا پر توکل کیا ہے “ ( وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ) ۔ ” اور تمام توکل کرنے والوں کو اسی پر توکل کرنا چاہیے اور اسی سے مدد طلب کرو اور اپنا معاملہ اسی کے سپرد کرو “ ( وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ) ۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں دوسرے شہروں کی طرح مصر کے پایہ تخت کے اگرد گر بھی فصیل تھی ۔ اس کے بھی برج و بار تھے اور اس کے متعدد دروازے تھے ۔

رہا یہ سوال کہ حضرت یعقوب (ع) نے کیوں نصیحت کی کہ ان کے بیٹے ایک دروازے سے داخل نہ ہوں بلکہ مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہو ، اس کی وجہ مندرجہ بالا آیت میں مذکور نہیں ہے ۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت یوسف (ع) کے بھائی ایک تو بہت حسین و جمیل تھے ( اگرچہ وہ یوسف نہ تھے مگر یوسف کے بھائی تو تھے ) ۔ ان کا قد کاٹھ بہت اچھا تھا ۔ لہذا ان کے باپ پریشان تھے کہ گیارہ افراد اکٹھے جن کے چہرے مہرے معلوم ہو کہ وہ مصر کے علاوہ کسی اور ملک سے آئے ہیں ، لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح انہیں نظر بد لگ جائے ۔

اس تفسیر کے بعد مفسرین کے درمیان نظر بد کی تا ثیر کے بارے میں ایک طویل بحث چھڑ گئی ہے ۔ انہوں نے اس کے لئے روایات و تاریخ میں سے کئی ایک شواہد پیش کئے ہیں جنہیں ہم انشاء الہ اس آیت کی تفسیر میں ذکر کریں گے :

و ان یکاد الذین کفروا لیزلقونک بابصار ہم ( ن و القلم - ۵۱ )

اس آیت کے ذیل میں ہم ثابت کریں گے کہ اس سلسلے کی کچھ بحث بجا بھی ہے اور سائنسی لحاظ سے بھی ایک مخصوص سیالہ مقناطیسی کہ جو آنکھ سے باہر اڑتا ہے اس کی توجیہ پیش کی جا سکتی ہے اگرچہ عامۃ الناس نے اس معاملے میں بہت سی خرافات شامل کر دی ہیں ۔

حضرت یعقوب (ع) کے اس حکم کے بارے میں جو دوسری علت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے جب اونچے لمبے چوڑے چکلے مضبوط جسموں والے اکھٹے چلیں تو حاسدوں کو انہیں دیکھ کر حسد پیدا ہو اور وہ ان کے بارے میں

حکومت سے کوئی شکایت کرنے لگیں اور ان کے متعلق یہ بد ظنی کریں کہ وہ کسی خرابی اور فتنہ و فساد کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے باپ نے انہیں حکم دیا کہ مختلف دروازوں سے داخل ہوں تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ بعض مفسرین (عظیم و خطیب مرحوم اشراقی (قدس سرہ)) نے اس کی ایک عرفانی تفسیر بھی ہے۔ وہ یہ کہ یعقوب (ع) راہنما راہ کے حوالے سے اپنے بیٹوں کو ایک اہم معاشرتی مسئلہ سمجھانا چاہتے تھے اور وہ یہ کہ کھوئی ہوئی چیز کو صرف ایک ہی راستے سے تلاش نہ کریں بلکہ ہر دروازے سے داخل ہو کر اسے ڈھونڈیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک مقصد تک پہنچنے کے لئے صرف ایک ہی راہ کا انتخاب کرتا ہے اور جب آگے راستہ بن پاتا ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے لیکن اگر وہ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو کہ متوجہ ہو کہ گمشدہ افراد اور چیزیں عموماً ایک ہی راستے پر جانے سے نہیں ملتیں بلکہ مختلف راستوں سے ان کی جستجو کرنا چاہئے تو عام طور پر کامیاب ہو جاتا ہے۔

برادران یوسف (ع) روانہ ہوئے اور کنعان و مصر کے درمیان طویل مسافت طے کرنے کے بعد سر زمین مصر میں داخل ہوئے اور جب باپ کے دئے ہوئے حکم کے مطابق مختلف راستوں سے مصر میں داخل ہوئے تو یہ کام انہیں کسی خدا نی حادثے سے دور نہیں کرسکتا تھا (وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ) بلکہ اس کا فائدہ صرف یہ تھا کہ ”یعقوب کے دل میں ایک حاجت تھی جو اس طرح پوری ہوتی تھی“ (إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا اثر صرف باپ کے دل کی تسکین اور آرام تھا کیونکہ وہ اپنے سارے بیٹوں سے دور تھا اور رات دن ان کی اور یوسف کی فکر میں رہتا تھا اور ان کے بارے میں حوادث کے گزند اور حاسدوں اور بد خوابوں کے بغض و حسد سے ڈرتا تھا اور اسے صرف اس بات سے اطمینان تھا کہ وہ اس کے احکام کے کاربند رہیں گے۔ اس پر اس کا دل خوش تھا۔

اس کے بعد قرآن یعقوب (ع) کی یوں مدح و ثنا اور تعریف و توصیف کرتا ہے : وہ ہماری ہوئی تعلیم کے سبب علم آگہی رکھتا تھا جب کہ اکثر لوگ نہیں جانتے (وَإِنَّهُ لَدُوٌّ عَلِيمٌ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ)۔ اس طرف اشارہ ہے کہ اسی طرح بہت سے لوگ عالم اسباب میں گم ہو جاتے ہیں ، خدا کو بھول جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کو نظر بد سے نہیں بچا یا جاسکتا۔ اسی بناء پر ایسے لوگ خدا اور اس پر توکل کو بھول کر ہر کہ کہ وہ مہ کے دامن سے جاچمٹتے ہیں لیکن حضرت یعقوب (ع) اس طرح کے نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک خدا کسی چیز کو نہ چاہے وہ انجام نہیں پاسکتی لہذا پہلے درجے میں ان کا بھروسہ اور اعتماد خدا پر تھا۔ اس کے بعد وہ عالم اسباب کی طرف جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ جانتے تھے کہ ان اسباب کے پیچھے ایک مسبب الاسباب ذات پاک ہے ، جیسا کہ قرآن بقرہ ۱۰۲ میں شہر بابل کے جادو گروں کے بارے میں کہتا ہے :

وما هم بضارين به من احد الا باذن الله

وہ جادو سے کسی کو نقصان نہیں پہنچاسکتے تے مگر یہ کہ خدا چاہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان سب چیزوں سے مافوق خدا کا ارادہ ہے دل اس سے باندھنا چاہئے اور اسی سے مدد لینا چاہئے۔

تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ یوسف/ 69 تا 76

۶۹۔ وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

۷۰۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذِنَ لَأَخِيهِمْ أَنْ يُدْخِلُوا إِلَيْهَا الْعَبِيرَ إِنكُمْ لَسَارِقُونَ۔

۷۱۔ قَالُوا وَأَقْبِلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَهُونَ۔

۷۲۔ قَالُوا نَقِضْ صُورَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ۔

۷۳۔ قَالُوا تَاللّٰهِ لَاقَدْ عَلَّمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِيْنَ-

۷۴۔ قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ اِنْ كُنْتُمْ كَادِبِيْنَ-

۷۵۔ قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ-

۷۶۔ فَبَدَا بِاَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ اَخِيهِ ثُمَّ اسْتَحْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ اَخِيهِ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَلْبُخْدَ اَخَاهُ فِي دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ -

ترجمہ

۶۹ جب یوسف کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ میں تمہارا بھائی ہوں جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے غمگین اور پریشان نہ ہو۔

۷۰۔ اور جس وقت ان کا سامان باندھا گیا تو ان کے بادشاہ نے پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کے بعد کسی نے آواز بلند کی کہ اے اس قافلے والو! تم چور ہو۔

۷۱۔ انہوں نے اس کی طرف رخ کر کے کہا تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے۔

۷۲۔ انہوں نے کہا: بادشاہ کا پیمانہ، اور جو شخص اسے لے آئے (غلام کا) اونٹ کا ایک بار اسے دیا جائے گا اور میں (اس انعام کا) ضامن ہوں۔

۷۳۔ انہوں نے کہا: قسم بخدا تم جانتے ہو کہ ہم اس علاقے میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم (کبھی بھی) چور نہیں تھے۔

۷۴۔ انہوں نے کہا: اگر تم جھوٹے ہوئے تو تمہاری سزا کیا ہے۔

۷۵۔ انہوں نے کہا: جس کے سامان میں (وہ پیمانہ) مل گیا تو وہ خود اس کی سزا ہو گا (اور اس کام کی بناء پر وہ غلام ہو جائے گا) ہم ظالموں کو اس طرح سے سزا دیتے ہیں۔

۷۶۔ تو اس وقت (یوسف نے) اپنے بھائی کے سامان سے پہلے ان کے سامان کی تلاشی لی اور پھر اپنے بھائی کے سامان سے اسے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کو چارہ کار یاد دلایا۔ وہ مصر (کے بادشاہ) کے ائین کے مطابق اپنے بھائی کو ہر گز نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ خدا چاہے۔ ہم جس شخص کے چاہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر صاحب علم کے اوپر ایک عالم ہے۔

بھائی کو روکنے کی کوشش

آخر کار بھائی یوسف (ع) کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ ہم نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے اور باوجود اس کے کہ ہمارے والد پہلے چھوٹے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجنے پر راضی نہ تھے لیکن ہم نے اصرار کر کے اسے راضی کی ہے تاکہ آپ جالیں کہ ہم نے قول و قرار پورا کیا ہے۔

حضرت یوسف (ع) نے بڑی عزت و احترام سے ان کی پذیرائی کی، انہیں مہمان بلا یا اور حکم دیا کہ دسترخوان یا طبق کے پاس دو دو افراد آئیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس وقت بنیامین جو تنہا رہ گیا تھا رونے لگا اور کہنے لگا کہ اگر میرا یوسف (ع) زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھا تاکہ نہ کہ ہم پدیری مادری بھائی تھے۔

پھر حکم دیا کہ دو دو افراد کے لئے ایک ایک کمرہ سونے کے لئے تیار کیا جائے۔ بنیامین پھر اکیلا رہ گیا تو حضرت یوسف (ع) نے فرمایا: اسے میرے پاس بھیج دو۔ اس طرح حضرت یوسف (ع) نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی لیکن دیکھا کہ وہ بہت دکھی اور پریشان ہے اور ہمیشہ اپنے کھوئے ہوئے بھائی یوسف (ع) کی یاد میں رہتا ہے۔ ایسے میں یوسف (ع) کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور آپ (ع) نے حقیقت کے چہرے سے پر دہ ہٹا دیا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جب یوسف (ع) کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے ہاں جگہ دی اور کہا کہ میں وہی تمہارا بھائی یوسف ہوں، غمگین نہ ہو اور اپنے دل کو دکھی نہ کر اور ان کے کسی کام سے پریشان نہ ہو (وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰی يُوسُفَ اَوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْ اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَسِمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)۔

”لا بتسّم“ اصل میں ”بؤس“ کے مادہ سے ضرر اور شدت کے معنی میں ہے اور اس مقام پر اس کا معنی ہے ”غمگین نہ ہو“۔

بھائیوں کے کام کہ جو بنیامین کو دکھی اور پریشان کرتے تھے ان سے مراد ان کی وہ نامہربانیاں اور بے التفاتیاں تھیں جو وہ اس کے اور یوسف (ع) کے لئے روارکھتے تھے اور وہ سازشیں کہ جو اسے گھر والوں سے دور کرنے کے لئے انجام دیتے تھے۔ حضرت یوسف (ع) کی مراد یہ تھی کہ تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی کارستانیوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ وہ میری ترقی اور بلندی کا ذریعہ بن گئیں لہذا اب تم بھی اس بارے میں اپنے دل کو دکھی نہ کرو۔ بعض روایات کے مطابق اس موقع پر حضرت یوسف (ع) نے اپنے بھائی بنیامین سے کہا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میرے

پاس رہ جاؤ اس نے کہا: ہاں میں تو راضی ہوں لیکن بھائی بر گز نہیں راضی ہوں گے کیونکہ انہوں نے باپ سے قول و قرار کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ مجھے ہر قیمت پر اپنے ساتھ واپس لے جائیں گے۔

حضرت یوسف (ع) نے کہا: تم فکر نہ کرو میں ایک منصوبہ بناتا ہوں جس وہ مجبور ہو جائیں گے کہ تمہیں میرے پاس چھوڑ جائیں۔ غلات کے بار تیار ہو گئے تم حکم دیا کہ مخصوص قیمتی پیمانہ بھائی کے بار میں رکھ دیں (کیونکہ ہر شخص کے لئے غلے کا ایک باردیا جاتا تھا) (قَلَمًا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ السَّقَايَةَ فِي رَحْلِ أُخِيهِ)۔

البتہ یہ کام مخفی طور پر انجام پا یا اور شاید اس کا علم مامورین میں سے فقط ایک شخص کو تھا۔ جب اناج کو پیمانے سے دینے والوں نے دیکھا کہ مخصوص قیمتی پیمانے کا کہیں نام و نشان نہیں ہے حالانکہ پہلے وہ ان کے پاس موجود تھا۔ لہذا جب وہ قافلہ چلنے لگا تو کسی نے پکار کر کہا: اے قافلے والو! تم چور ہو (تُمْ أَنْتُمْ مُؤَدِّنُ آيَاتِهَا الْعَيْنُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ)۔

یوسف (ع) کے بھائیوں نے جب یہ جملہ سنا تو سخت پریشان ہوئے اور وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ ان کے ذہن میں تو اس کا خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ اس احترام و اکرام کے بعد ان پر چوری کا الزام لگا یا جائے گا لہذا انہوں اس کی طرف رخ کر کے کہا: تمہاری کونسی چیز چوری ہو گئی ہے (قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقَهُونَ)۔

انہوں نے کہا ہم سے بادشاہ کا پیمانہ گم ہو گیا ہے اور ہمیں تمہارے بارے میں بد گمانی ہے (قَالُوا نَقُفُّ صَوَاعِ الْمَلِكِ)۔ پیمانہ چونکہ گران قیمت ہے اور بادشاہ کو پسند ہے لہذا ”وہ جس شخص کو ملے اور وہ اسے لے آئے تو اسے ایک اونٹ کا بار بطور انعام دیا جائے گا“ (وَلَمَنْ جَاءَ بِهِ حِمْلًا بَعِيرٍ)۔

پھر یہ بات کہنے والے نے مزید تاکید سے کہا: اور میں ذاتی طور پر اس انعام کا ضامن ہوں (وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ)۔ بھائی یہ بات سن کر سخت پریشان ہوئے اور حواس باختہ ہو گئے اور وہ نہیں سمجھتے تھے کہ معاملہ کیا ہوا، ان کی طرف رخ کر کے ”انہوں نے کہا: خدا کی قسم تم جانتے کہ ہم یہاں اس لئے نہیں آئے کہ فتنہ و فساد کریں اور ہم کبھی بھی چور نہیں تھے“ (قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ)۔

یہ جو انہوں نے کہا کہ تم خود جانتے ہو کہ ہم فساد اور چور نہیں ہیں، شاید اس طرف اشارہ ہو کہ تم ہمارا سابقہ کردار اچھی طرح جانتے ہو کہ گزشتہ موقع پر ہماری پیش کردہ قیمت جو تم نے ہمارے غلات میں رکھ دی تھی وہ ہم دوبارہ تمہارے پاس لے آئے ہیں اور تمہیں بتایا کہ وہ ساری کی ساری ہم تمہیں واپس کرنے کو تیار ہیں لہذا وہ افراد جو دور دراز کے ملک سے اپنا قرض ادا کرنے واپس آجاتے ہیں ان سے کیونکر ممکن ہے کہ چوری کے لئے ہاتھ بڑھائیں۔

اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ مصر میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے اونٹوں کے منہ دبان بدنوں سے باندھ دیئے تھے تاکہ وہ کسی کی زراعت اور مال کا نقصان نہ کریں۔ لہذا ان کی مراد یہ تھی کہ ہم جو اس حد تک احتیاط کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے جانور بھی کسی کو ضرر یا نقصان نہ پہنچائیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ہم ایسے کام کے مرتکب ہوں۔ یہ سن کر مامورین ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ”کہا: لیکن اگر تم جھوٹے ہوئے تو اس کی سزا کیا ہے؟“ (قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ)۔

”انہوں نے جواب میں کہا: اس کی سزا یہ ہے کہ جو شخص کے بارے میں بادشاہ کا پیمانہ مل جائے اسے روک لو اور اسے اس کے بدلے میں لے لو“ (قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وَجَدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ)۔ ”جی ہاں! ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں (كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ)۔

اس موقع پر حضرت یوسف (ع) نے حکم دیا کہ ان کے غلات کے بارے کھولے جائیں اور ایک ایک جانچ پڑتال کی جائے البتہ اس بناء پر ان کے اصلی منصوبے کا کسی کو پتہ نہ چلے، اپنے بھائی بنیامین کے بار سے پہلے دوسروں کے سامان کی پڑتال کی اور پھر وہ مخصوص پیمانہ اپنے بھائی کے مال سے بر آمد کر لیا (فَبَدَأَ بِأَوْعِيَّتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أُخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أُخِيهِ)۔

بنیامین کے بارے سے پیمانہ بر آمد ہوا تو تعجب سے بھائیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے گویا غم و اندوہ کے پہاڑ ان کے سروں پر آگرا اور انہیں یوں لگا جیسے وہ ایک عجیب مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ جس کے چاروں طرف راستے بند ہو گئے ہیں۔ ایک طرف ان کا بھائی ظاہرا ایسی چوری کا مرتکب ہوا جس سے ان کے سر ندامت سے جھک گئے اور دوسری طرف ظاہراً عزیز مصر کی نظروں میں ان کی عزت و حیثیت خطرے میں جا پڑی کہ اب آئندہ کے لئے اس کی حمایت حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہ رہا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر انہوں نے سوچا کہ باپ کو کیا جواب دیں گے اور وہ کیسے یقین کرے گا کہ اس میں ان کوئی قصور نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ موقع پر بھائیوں نے بنیامین کی طرف رخ کر کے کہا: اے بے خبر! تونے ہمیں رسوا کر دیا ہے اور ہمارا منہ کالا کر دیا ہے۔ تونے یہ کیسا غلط کام انجام دیا ہے (نہ تونے اپنے باپ پر رحم کیا، نہ ہم پر اور نہ

خاندان یعقوب (ع) پر کہ جو خاندان نبوت ہے (آخر ہمیں بتا تو سہی کہ تو نے کس وقت پیمانہ اٹھا یا اور اپنے بار میں رکھ لیا۔

بنیامین نے جو معالے کی اصل اور قضیے کے باطن کو جاننا تھا ٹھنڈے دل سے جواب دیا کہ یہ کام اسی شخص نے کیا ہے جس نے تمہاری دی ہوئی قیمت تمہارے بار میں رکھ دی تھی لیکن بھائیوں کو اس حادثے نے اس قدر پریشان کر رکھا تھا کہ وہ سمجھ نہ سکے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ۱

پھر قرآن مزید کہتا ہے: ہم نے اس طرح یوسف (ع) کے لئے ایک تدبیر کی (تاکہ وہ اپنے بھائی کو دوسرے بھائیوں کی مخالفت کے بغیر روک سکیں) (كَذٰلِكَ كِذَّبْنَا لِيُؤْسَفَ)۔

اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر یوسف (ع) قوانین مصر کے مطابق سلوک کرتے تو انہیں چاہیے تھا کہ اسے زود و کوب کرتے اور قید خانے میں ڈال دیتے لیکن اس طرح نہ صرف بھائی کو آزار و تکلیف پہنچتی بلکہ خود ان کا مقصد کہ بھائی کو اپنے پاس رکھیں، پورا نہ ہوتا۔ اسی لئے انہوں نے پہلے بھائیوں سے اعتراف لیا کہ اگر تم سے چوری کی ہو تو تمہارے نزدیک اس کی کیا سزا ہے تو انہوں نے اپنے ہاں رائج طریقے کے مطابق جواب دیا کہ ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ طور کو اس کی چوری کے بدلے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور اس سے کام لیتے ہیں اور حضرت یوسف (ع) نے بھی اسی طریقے کے مطابق ان سے سلوک کیا کیونکہ مجرم کو سزا دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے اس کے اپنے قانون کے مطابق سزا دی جائے۔

اسی بناء پر قرآن کہتا ہے: یوسف (ع) ملک مصر کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو نہیں لے سکتے تھے اور اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے (مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ)۔

اس کے بعد استثناء کے طور پر فرماتا ہے: مگر یہ کہ خدا چاہے (إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام جو یوسف (ع) نے انجام دیا اور بھائیوں کے ساتھ ان کے طریقے کے مطابق سلوک کیا فرمان الہی کے مطابق تھا اور یہ بھائی کی حفاظت اور ان کے باپ کی اور دوسرے بھائیوں کی آزمانش کی تکمیل کے لئے ایک منصوبہ تھا۔

آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: ہم جس کو چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں (نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَاءُ)۔

ان افراد کے درجات جو اہل ہوں اور یوسف کی طرح امتحانات کی کٹھالی سے صحیح و سالم نکل آئیں۔

بہر حال ہر عالم سے بڑھ کر ایک عالم و دانا ہے (یعنی خدا) (وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ)۔ اور وہی ہے جس نے اس منصوبے کا یوسف (ع) کو الہام کیا تھا۔

.....

۱. مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۵۳۔ مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

۲. طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اس زمانے میں ایک گروہ میں یہ طریقہ رائج تھا کہ وہ چور کو ایک سال کے لئے غلام بنالیتے تھے۔ نیز یہ بھی نقل کیا ہے کہ خاندان یعقوب (ع) میں چوری کی مقدار کے برابر غلامی کی مدت معین کی جاتی تھی (تاکہ وہ اسی کے مطابق کام کرے)۔

چند اہم نکات

مندرجہ بالا آیات سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا ایک ایک کر کے جواب دیا جائے گا:

۱۔ یوسف (ع) نے بھائیوں سے اپنا تعارف کیوں نہ کروایا؟

یوسف (ع) نے بھائیوں نے اپنا تعارف کیوں نہیں کروایا، تاکہ ان کے باپ کو جانکاہ غم فراق سے جلدی نجات ملتی؟۔ اس سوال کا جواب جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے یہ ہے کہ باپ اور بھائیوں کے امتحان کے پروگرام کی تکمیل کے لئے تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کام خود غرضی کی بناء پر نہ تھا بلکہ ایک فرمان الہی کے ماتحت تھا۔ خدا چاہتا تھا کہ دوسرے بیٹھے کو کھونے پر بھی یعقوب (ع) کے عزم اور حوصلے کا امتحان لے اور یوں ان کے تکامل اور ترقی کا آخری زینہ بھی طے ہو جائے اور بھائی بھی آزمائے جائیں کہ ایسے موقع پر جب ان کا بھائی اس طرح کے معالے میں گرفتار ہوا ہے تو وہ باپ سے باندھے پیمان کی کس طرح سے حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ بے گناہ پر چوری کا الزام؟ :

کیا جائز تھا کہ ایک بے گناہ پر چوری کا اتہام لگا یا جاتا، ایسا اتہام کہ جس کے برے آثار نے باقی بھائیوں کو بھی کسی حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا؟

اس سوال کا جواب بھی خود واقعہ میں موجود ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ خود بنیامین کی رضا مندی سے انجام پا یا تھا۔ کیونکہ حضرت یوسف (ع) نے پہلے اپنے آپ کو اس سے متعارف کروایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ منصوبہ خود اس کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا۔ نیز اس سے بھائیوں پر بھی کوئی تہمت نہیں لگی البتہ انہیں اضطراب اور پریشانی ضرور ہوئی جس میں کہ ایک اہم امتحان کی وجہ سے کوئی برج نہ تھا۔

۳۔ چوری کی طرف سب کی نسبت کیوں دی گئی؟

کیا ”انکم لسا رقون“ یعنی ”تم چور ہو کہہ کر سب کی طرف چوری کی نسبت دینا جھوٹ نہ تھا اور اس جھوٹ اور تہمت کا کیا جواز تھا؟

ذیل کے تجربہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا:

اولاً: یہ معلوم نہیں کہ یہ بات کہنے والے کون تھے۔ قرآن میں صرف اس قدر: ”قالوا“ یعنی انہوں نے کہا۔“ ہوسکتا ہے یہ بات کہنے والے حضرت یوسف (ع) کے کچھ کارندے ہوں کہ جب انہوں نے دیکھا کہ مخصوص پیمانہ نہیں ہے تو یقین کر لیا کہ کنعان کے قافلے میں سے کسی شخص نے اسے چرا لیا ہے اور یہ معمول ہے کہ اگر کوئی چیز ایسے افراد میں چوری ہو جائے کہ جو ایک ہی گروہ کی صورت میں متشکل ہو اور اصل چور پہچانا نہ جائے تو سب کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیا ہے یعنی تم میں سے ایک نے یا میں سے بعض نے ایسا کیا ہے۔

ثانیاً: اس بات کا اصلی نشانہ بنیامین تھا جو کہ اس نسبت پر راضی تھا کیونکہ اس منصوبے میں ظاہراً تو اس پر چوری کی تہمت لگی تھی لیکن درحقیقت وہ اس کے اپنے بھائی یوسف (ع) کے پاس رہنے کے لئے مقدمہ تھی اور یہ جو سب پر الزام آیا یہ ایک بالکل عارضی سی بات تھی جو صرف برادران یوسف (ع) کے سامان کی تلاشی پر ختم ہو گیا اور جو درحقیقت مراد تھا یعنی ”بنیامین“ وہ پہچان لیا گیا۔

بعض نے کہا کہ یہاں جس چوری کی ان کی طرف نسبت دی گئی ہے وہ گزشتہ زمانے سے مربوط تھی اور وہ تھی بھائیوں کا یوسف (ع) کے باپ یعقوب (ع) سے یوسف (ع) کو چرا نا لیکن یہ خیال اس صورت میں درست ہو سکتا ہے جب یہ نسبت حضرت یوسف (ع) کی طرف اشارہ سے انہیں دی جاتی کیونکہ وہی گزشتہ معاملے سے آگاہ تھے اور شاید بعد والے جملے میں اسی کی طرف اشارہ ہو کیونکہ حضرت یوسف (ع) کے مامورین نے یہ نہیں چاہا کہ تم نے بادشاہ کا پیمانہ چوری کیا ہے بلکہ کہا: ”نفقد صوامع الملک“ یعنی ہم بادشاہ کا پیمانہ مفقود پاتے ہیں۔“ (لیکن پہلا جواب زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے)۔

۴۔ اس زمانے میں چوری کی سزا؟

اس زمانے میں چوری کی سزا کیا تھی اس سلسلے میں زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں اور کنعان کے باشندوں میں چوری کی سزا مختلف تھی۔ حضرت یوسف (ع) کے بھائیوں اور احتمالاً اہل کنعان میں اس عمل کی سزا یہ تھی کہ چور کو اس چوری کے بدلے میں (بمیشہ کے لئے یا وقتی طور پر) غلام بنالیا جاتا۔ 2۔ لیکن مصریوں میں یہ سزا رائج نہ تھی بلکہ چوروں کو دوسرے ذرائع سے مثلاً مار پیٹ سے اور قید و بند وغیرہ سے سزا دیتے تھے۔

بہر حال یہ جملہ اس امر کی دلیل نہیں بنتا کہ آسمانی ادیان میں سے کسی میں غلام بنالینا چور کی سزا تھی کیونکہ بسا اوقات کسی گروہ میں رائج کوئی طریقہ اس زمانے کے لوگوں کی طرف سے شمار ہوتا ہے۔ غلامی کی تاریخ میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ بے ہودہ اقوام میں یہ طریقہ ربا ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو جاتا تو اسے غلام بنا لیا جاتا۔

۵۔ ”سقایا“ یا ”صوامع“:

زیر نظر آیات میں کبھی لفظ ”صوامع“ (پیمانہ) استعمال ہوا اور کبھی ”سقایا“ (پانی پینے کا برتن)۔ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ یہ پیمانہ ابتداء میں بادشاہ کے پینے کا برتن تھا لیکن جس وقت اناج سر زمین مصر میں گراں اور رکم یاب ہو گیا اور اس کی راشن بند ہو گئی تو اس امر کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے کہ لوگ نہایت احتیاط سے اور کم خرچ کریں بادشاہ کے پانی پینے کے لئے استعمال ہونے والا مخصوص برتن اس کے پیمانے کے

طور پر استعمال کیا گیا۔

اس برتن کی خصوصیت کے ضمن میں مفسرین نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ چاندی کا تھا اور بعض کے بقول وہ سونے کا تھا بعض نے اضافہ کیا ہے کہ اس میں جواہرات بھی جڑے ہوئے تھے۔ کچھ غیر معتبر روایات میں بھی ایسے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔ جو کچھ مسلم ہے وہ یہ کہ ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے کسی زمانے میں بادشاہ مصر پانی پیتا تھا بعد میں وہ پیمانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ بھی واضح ہے کہ ایک ملک کی تمام تر ضروریات کو اس قسم کے پیمانے سے ناپ کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ شاید ایسا رمز آگیا ہو اور ان سالوں میں غلے کی کم یابی اور اہمیت ظاہر کرنے کے لئے خاص طور پر اسے استعمال کیا گیا ہوتا لوگ اسے صرف کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیں۔

ضمناً اس بناء پر کہ وہ پیمانہ اس وقت حضرت یوسف (ع) کے قبضے میں تھا لہذا وہ اس بات کا سبب بنتا اگر چور غلام بنایا جاتا تو وہ صاحب احتیاط پیمانہ یعنی خود حضرت یوسف (ع) کا غلام بنتا اور انہی کے پاس رہتا اور بالکل اسی مقصد کے لئے حضرت یوسف (ع) نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔

## تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ یوسف / 77 تا 79

۷۷۔ قَالُوا اِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ فَاَسْرَهَا يُوْسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ۔

۷۸۔ قَالُوا يَا اَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَّهُ اَبًا سَيِّئًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ اِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

۷۹۔ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّأَخُذَ اِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ اِنَّا اِذَا لَطَالُمُوْنَ ۔

ترجمہ

۷۷۔ (بھائیوں نے) کہا: اگر اس (بنیامین) نے چوری کی ہے تو (تعجب کی بات نہیں) اس کے بھائی (یوسف) نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی یوسف (کو بہت دکھ ہوا اور اس) نے اس (دکھ) کو اپنے اندر چھپائے رکھا اور ان پر ظاہر نہیں کیا۔ (بس اتنا) کہا: تم بد تر ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو خدا اس سے زیادہ آگاہ ہے۔

۷۸۔ انہوں نے کہا: اے عزیز مصر! اس کا ایک بوڑھا باپ ہے (اور وہ بہت پریشان ہوگا) ہم میں سے ایک کو لے لے ہم دیکھ رہے ہیں کہ تو نیکوکاروں میں سے ہے۔

۷۹۔ اس نے کہا: اس سے خدا کہ پناہ کہ جس شخص کے پاس سے ہمارا مال و متاع ملا ہم سوائے اس کے کسی اور کو لیں کیونکہ اس صورت میں ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

برادران یوسف (ع) کی فداکاری کیوں قبول نہیں ہوئی؟

آخر کار بھائیوں نے یقین کر لیا کہ ان کے بھائی بنیامین نے ایسی قبیح اور منحوس چوری کی ہے اور اس طرح اس نے عزیز مصر کی نظروں میں ان کا سابقہ رکارڈ سارا خراب کر دیا ہے۔ لہذا اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لئے انہوں نے کہا: اگر اس لڑکے نے چوری کی ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ اسکا بھائی یوسف (ع) بھی پہلے ایسے کام کا مرتکب ہو چکا ہے، اور یہ دونوں ایک ماں اور باپ سے ہیں اور ہم کہ جو دوسری ماں سے ہیں ہمارا حساب کتاب ان سے الگ ہے (قَالُوا اِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهُ مِنْ قَبْلُ)۔ اس طرح سے انہوں نے اپنے اور بنیامین کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرنا چاہی اور اس کا تعلق یوسف (ع) سے جوڑ دیا۔

یہ بات سن کر یوسف (ع) بہت دکھی اور پریشان ہوئے اور ”اسے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے اظہار نہ کیا“ (فَاَسْرَهَا يُوْسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ)۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ بات کہہ کر انہوں ایک بہت بڑا بہتان باندھا ہے لیکن

انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس اجمالی طور پر اتنا کہا: جس کی طرف تم یہ نسبت دیتے ہو تم اس سے بدتر ہو یا میرے نزدیک مقام و منزلت کے لحاظ سے تم بدترین لوگ ہو“ ( قَالَ أَنْتُمْ شَرُّ مَكَانًا )۔

اس کے بعد مزید کہا: جو کچھ تم کہتے ہو خدا اس کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے ( وَ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ )۔ یہ ٹھیک ہے کہ یوسف (ع) کے بھائیوں نے ان بحرانی لمحوں میں اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کے لئے اپنے بھائی یوسف (ع) پر ایک ناروا تہمت باندھی تھی لیکن پھر بھی اس کام کے لئے کوئی بہانہ اور سند ہونا چاہیے جس کی بناء پر وہ یوسف (ع) کی طرف ایسی نسبت دیں۔ اس سلسلے میں مفسرین کا وش و زحمت میں پڑے ہیں اور گزشتہ لوگوں نے تواریخ سے انہوں نے تین روایات نقل کی ہیں۔

پہلی یہ کہ یوسف (ع) اپنی ماں کی وفات کے بعد اپنی پھوپھی کے پاس رہا کرتے تھے اور انہیں یوسف (ع) سے بہت زیادہ پیار تھا جب آپ بڑے ہو گئے اور حضرت یعقوب (ع) نے انہیں ان کی پھوپھی سے واپس لینا چاہا تو ان کی پھوپھی نے ایک منصوبہ بنایا اور وہ یہ کمر بند یا ایک خاص شال جو حضرت اسحاق (ع) کی جانب سے ان کے خاندان میں بطور یادگار چلی آ رہی تھی یوسف (ع) کی کمر سے باندھ دی اور دعویٰ کیا کہ یوسف (ع) اسے چھپا لے جانا چاہتا تھا ایسا انہوں نے اس لئے کیا تاکہ اس خاص کمر بند یا شال کے بدلے یوسف (ع) کو اپنے پاس رکھ لیں۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت یوسف (ع) کے مادری رشتہ داروں میں سے ایک کے پاس ایک بت تھا جسے یوسف (ع) نے اٹھا کر توڑ دیا اور اسے سڑک پر لا پھینکا لہذا انہوں نے حضرت یوسف (ع) پر چوری کا الزام لگا دیا حالانکہ اس میں تو کوئی گناہ نہیں تھا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ کبھی کبھار وہ دسترخوان سے کھانا لے کر مسکینوں اور حاجت مندوں کو دے دیتے لہذا بہانہ تراش بھائیوں نے اسے بھی چوری کا الزام دینے کے لئے سند بنا لیا حالانکہ ان میں سے کوئی چیز گناہ کے زمرے میں نہیں آتی۔

اگر ایک شخص کسی کو کوئی لباس پہنادے اور پہنے والا نہ جانتا ہو کہ یہ کسی دوسرے کا مال ہے تو کیا اسے چوری کا الزام دینا صحیح ہے۔

اسی طرح کیا کسی بٹ کو اٹھا کر پٹخ دینا گناہ ہے۔

نیز انسان کوئی چیز اپنے باپ کے دسترخوان سے اٹھا کر مسکینوں کو دے دے جب کہ اسے یقین ہو تو کیا اسے گناہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے چھوٹے بھائی بنیامین کو اس قانون کے مطابق عزیز مصر کے پاس رہنا پڑے گا جسے وہ خود قبول کرچکے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے باپ سے پیمانہ باندھا تھا کہ بنیامین کی حفاظت اور اسے واپس لانے کے لئے اپنی پوری کوشش کریں گے۔ ایسے میں انہوں نے یوسف (ع) کی طرف رخ کیا جسے ابھی تک انہوں نے پہچانا نہیں تھا اور ”کہا: اے عزیز مصر: اے بزرگوار صاحب اقتدار! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے اور وہ اس کی جدائی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہم نے آپ کے اصرار پر اسے باپ سے جدا کیا اور باپ نے ہم سے تاکید و وعدہ لیا کہ ہم پر قیمت پر اسے واپس لائیں گے۔ اب ہم پر احسان کیجئے اور اس کے بدلے میں ہم سے کسی ایک کو رکھ لیجئے“ ( قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَخَدْنَا مَكَانَهُ )۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نیکو کاروں میں سے ہیں“ اور یہ پہلا موقع نہیں کہ آپ نے ہم پر لطف و کرم اور مہر بانی کر کے اپنی کرم نوازیوں کی تکمیل کیجئے۔ ( إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ )۔ حضرت یوسف (ع) نے اس تجویز کی شدت سے نفی کی اور ”کہا: پناہ بخدا! کیسے ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس سے ہمارا مال و متاع برآمد ہو ابے ہم اس کے علاوہ کسی شخص کو رکھ لیں“ کبھی تم نے سنا ہے کہ ایک منصف مزاج شخص نے کسی بے گناہ کو دوسرے کے جرم میں سزا دی ہو ( قَالَ مَعَادَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعًا عِنْدَهُ )۔ اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہم ظالم ہوں گے ( إِنَّا إِذَا لَطَمُونَ )۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف (ع) نے اپنی اس گفتگو میں بھائی کی طرف چوری کی کوئی نسبت نہیں دی بلکہ کہتے ہیں کہ ”جس شخص کے پاس سے ہمیں ہمارا مال و متاع ملا ہے“ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس امر کی طرف سنجیدگی سے متوجہ تھے کہ اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی غلط بات نہ کریں۔

سورہ یوسف / 80 تا 82

۸۰۔ فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِي يُوسُفَ فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّى يَأْتِيَ لِي أُبَى أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ۔

۸۱۔ ارْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَاتَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمَنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ۔

۸۲۔ وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعَيْرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا وَإِنَّا لَصَادِقُونَ۔

ترجمہ

۸۰۔ جب (بھائی) اس سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف گئے اور آپس میں سرگوشی کی۔ ان میں سے سب سے بڑے نے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ سے تم سے الہی پیمانہ لیا تھا اور اس سے پہلے تم سے یوسف (ع) کے بارے میں کوتاہی کی تھی لہذا میں اس سر زمین سے نہیں جاؤں گا جب تک مجھے میرا باپ اجازت نہ دے یا خدا اپنا حکم میرے بارے میں صادر نہ فرمائے اور وہ بہترین حکم کرنے والا ہے۔

۸۱۔ تم اپنے باپ کی طرف پلٹ جاؤ اور اس سے کہو ابا (جان)! تمہارے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کے سوا ہم نے گواہی نہیں دی اور نہ ہی ہم غیب سے آگاہ تھے۔

۸۔ (مزید اطمینان کے لئے) اس شہرے سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے نیز اس قافلے سے پوچھ لیں جس کے ساتھ ہم آئے ہیں اور ہم (اپنی بات میں) سچے ہیں۔

بھائی سر جھکائے باپ کے پاس پہنچے

بھائیوں نے بنیامین کے رہائی کے لئے اپنی آخری کوشش کر دیکھی لیکن انہوں نے اپنے سامنے تمام راستے بند پائے۔ ایک طرف تو اس کام کو کچھ اس طرح سے انجام دیا گیا تھا کہ ظاہراً بھائی کی برأت ممکن نہ تھی اور دوسری طرف عزیز مصر نے اس کی جگہ کسی اور فرد کو رکھنے کی تجویز قبول نہ کی لہذا وہ مایوس ہو گئے۔ یوں انہوں نے کنعان کی طرف لوٹ جانے اور باپ سے سارا ماجرا بیان کرنے کا ارادہ کر لیا۔ قرآن کہتا ہے: جس وقت وہ عزیز مصر سے یا بھائی کی نجات سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف کو آئے اور دوسروں سے الگ ہو گئے اور سرگوشی کرنے لگے (فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا)۔

”خلصوا“ یعنی ”خالص ہو گئے“۔ یہ دونوں سے الگ ہونے اور خصوصی مٹینگ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور ”نجی“ ”مناجات“ کے مادہ سے دراصل ”نجوہ“ سے مراد تعلق زمین کے معنی میں لیا گیا ہے چونکہ اونچی اور مفعول زمینیں اپنے اطراف سے جدا اور الگ ہوتی ہیں اور مخفی مٹنگیں اور سرگوشیاں ارد گرد والوں سے ہٹ کر ہوتی ہیں اس لئے انہیں ”نجوی“ کہتے ہیں (اس بناء پر ”نجوی“ ہر قسم کی محرمانہ بات کو کہا جاتا ہے چاہے وہ کان میں کہی جائے یا کسی خفیہ مٹنگ میں)۔

جملہ ”خلصوا نجيا“ جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ فصیح ترین اور خوبصورت ترین قرآنی تعبیر ہے جس میں دو لفظوں کے ذریعے بہت سے مطالب بیان کر دئے گئے ہیں جب کہ یہ مطالب بیان کرنے کے لئے بہت سے جملے درکار تھے۔

بہر حال سب سے بڑے بھائی نے اس خصوصی مٹینگ میں ان سے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے الہی پیمانہ لیا ہے کہ بنیامین کو ہر ممکنہ صورت میں ہم واپس لائیں گے (قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُمْ مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ)۔ اور تمہی نے اس سے پہلے بھی یوسف کے بارے میں کوتاہی کی، اور باپ کے نزدیک تمہارا گزشتہ کردار برا ہے (وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُمْ فِي يُوسُفَ)۔

”اب جبکہ معاملہ یوں ہے تو میں اپنی جگہ سے (یا سر زمین۔ مصر سے) نہیں جاؤں گا اور یہیں پڑاؤ ڈالوں گا، مگر یہ کہ میرا باپ مجھے دے دے یا خدا میرے متعلق کوئی فرمان صادر کرے جو کہ بہترین حاکم و فرمان روا ہے (فَلَنْ أُبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْتِيَ لِي أَوْ يَخُكُمَ اللَّهُ لِي وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ)۔

اس حکم یا تو موت کا حکم مراد ہے یعنی مرتے دم تک یہاں سے نہیں جاؤں گا یا خدا کی طرف پیدا ہونے والا کوئی چارہ کار مراد ہے یا پھر کوئی قابل قبول اور ناقابل توجیہ عذر مراد ہے جو کہ باپ کے نزدیک قطعی طور پر قابل قبول ہو۔ پھر بڑے بھائی نے دوسرے بھائیوں کو حکم دیا، ”تم باپ کے پاس لوٹ آؤ اور کہو ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے (ارْجِعُوا إِلَىٰ آبَائِكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَاتَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ)۔

”اور یہ جو ہم گواہی دے رہے ہیں اتنی ہی ہے جتنا ہمیں علم ہوا“ بس ہم نے اتنا دیکھا کہ بادشاہ کا پیمانہ ہمارے بھائی کے بارے سے ہر آمد ہو جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے چوری کی ہے، باقی رہا امر۔ باطن تو وہ خدا جانتا ہے (وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا)۔ اور ہمیں غیب کی خبر نہیں“ (وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ)۔ اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ بھائیوں کا مقصد یہ ہو کہ وہ باپ سے کہیں کہ اگر ہم نے تیرے پاس گواہی دی اور عہد کیا کہ ہم بھائی کو لے جائیں گے اور واپس لے آئیں گے تو اس بناء پر تھا کہ ہم اس کے باطن سے باخبر نہ تھے اور ہم غیب سے آگاہ نہ تھے کہ اس کا انجام یہ ہوگا۔

.....

۱. ” فرطتم “ تفریط “ کے مادہ سے در اصل ” فروط “ (بروزن ” شروط “) مقدم ہونے کے معنی میں ہے اور جب یہ بات تفعیل میں آجائے تو آگے بڑھنے میں کوتاہی کرنے کے معنی میں ہے اور جب باب افعال سے ” افراط “ ہو تو تقدم اور آگے بڑھنے میں تجاوز کرنے کے معنی میں ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ سب سے بڑا بھائی کون تھا ؟  
 بعض نے سب سے بڑے بھائی کا نام ” روبین “ ( روبیل ) لکھا ہے ۔ بعض نے ” شمعون “ کو سب سے بڑا بھائی سمجھا ہے ۔ بعض نے اس کا نام ” یہودا “ بیان کیا ہے ۔  
 نیز اس لحاظ سے بھی مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہاں بڑا ہونے سے مراد عمر میں بڑا ہے یا عقل و فہم کے لحاظ سے بڑا ہے ۔ البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ یہاں سن و سال میں بڑا ہونا مراد ہے ۔

۲۔ موجود قرائن کی بنیاد پر فیصلہ :  
 اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اقرار اور گواہ نہ ہوں تو قاضی قطعی قرائن پر عمل کر سکتا ہے کیونکہ برادران یوسف (علیہ السلام) کے اس واقعے میں نہ گواہ تھے اور نہ اقرار۔ صرف بنیامین کے بارے میں بادشاہ کے پیمانے کا کامل جانا اس کے مجرم ہونے کی دلیل شمار کیا گیا ۔  
 نیز ان میں سے ہر ایک ذاتی طور پر اپنے بار کو پر کرتا تھا یا کم از کم پر کرتے وقت وہاں حاضر ہوتا تھا اور اگر تالالگانا ہوتا یا بند کرنا ہوتا تو چابی وغیرہ بھی خود اسی کے قبضے میں ہوتی۔ دوسری طرف کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی منصوبہ کار فرما ہے ۔ مزید یہ کہ کنعان کے مسافروں ( برادران یوسف ) کا اس شہر میں کوئی دشمن بھی نہ تھا کہ جو ان کے خلاف کوئی سازش کرتا ۔  
 ان تمام پہلوؤں کو پیش، نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ بنیامین کے بارے میں جو بادشاہ کا پیمانہ برآمد ہوا ہے یہ خود اس کا ذاتی کام ہے ۔  
 دور حاضر میں ایسی ہی بنیادوں پر فیصلے کئے جاتے ہیں ۔ اس سلسلے میں فقہ اسلامی میں مزید جستجو اور تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ یہ امر موجودہ زمانے میں عدالتی بحثوں میں بہت مؤثر ہے ۔ کتاب القضاء میں اس سلسلے میں بحث کی جانا چاہیے ۔

۳۔ برادران یوسف (علیہ السلام) میں فرق :  
 مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ برادران یوسف (علیہ السلام) میں عزم و ہمت کے لحاظ سے بہت فرق تھا ۔ سب سے بڑا بھائی اپنے وعدہ کا بہت سختی سے پابند تھا جب کہ دوسرے بھائیوں نے جب دیکھا کہ عزیز مصر سے ان کی گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تو انہوں نے بس اسی پر اپنے آپ کو معذور سمجھا اور مزید کوشش نہ کی البتہ حق بڑے بھائی کے ساتھ تھا کیونکہ وہ مصر ہی میں ٹھہر گیا تھا خصوصاً عزیز مصر کے دربار کے نزدیک اس نے پڑاؤ ڈال لیا ۔ اس سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ لطف و مہربانی کرے اور ایک پیمانے کی وجہ سے جو آخر کار مل گیا تھا اور ایک مسافر اس سے داغ دار بھی ہو گیا تھا ، اب اس کے بدلے بھائیوں اور اس کے بوڑھے باپ کو سزا نہ دے ۔ اسی احتمال کی بناء پر وہ مصر میں ٹھہر گیا اور بھائیوں کو باپ کا حکم معلوم کرنے کے لئے باپ کی خدمت میں روانہ کر دیا تاکہ وہ جاکر سارا واقعہ بیان کریں ۔

۸۳. قَالَ بِنِ سَوَّلْتُ لَكُمْ أَنْفُسَكُمْ أَمْرًا فَصَبِرْ جَمِيلٌ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ.  
 ۸۴. وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسْفَى عَلَى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ.  
 ۸۵. قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ.  
 ۸۶. قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ .

ترجمہ

۸۳. (یعقوب (علیہ السلام)) نے کہا: نفس (اور ہوا و ہوس) نے معاملہ تمہاری نگاہ میں اس طرح سے مزین کر دیا ہے - میں صبر کروں گا ، صبر جمیل (کہ جس میں کفران نہ ہو) ، مجھے امید ہے کہ خدا ان سب کو میری طرف پلٹادے گا کیونکہ وہ علیم و حکیم ہے -

۸۴. اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا : ہائے یوسف (علیہ السلام) - اور اس کی آنکھیں غم اندوہ سے سفید ہو گئیں لیکن وہ اپنا غصہ پی جاتا ( اور ہر گز ناشکری نہ کرتا ) -

۸۵. انہوں نے کہا : بخدا ! تو یوسف (علیہ السلام) کو اس قدر یاد کرتا ہے کہ تو موت کے قریب جا پہنچے گا یا ہلاک ہو جائے گا -

۸۶. اس نے کہا: میں اپنا درد و غم صرف خدا سے کہتا ہوں ( اور اس کے ہاں شکایت کرتا ہوں ) اور میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے -

میں وہ الطاف الہی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

بھائی مصر سے چل پڑے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بھائی کو وہاں چھوڑ آئے اور پریشان و غم و زدہ کنعان پہنچے - باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے - اس سفر سے واپسی پر باپ نے جب گزشتہ سفر کے برعکس غم و اندوہ کے آثار ان کے چہروں پر دیکھے تو سمجھ گئے کہ کوئی ناگوار خبر لائیں ہیں خصوصاً جبکہ بنیامین اور سب سے بڑا بھائی ان کے ہمراہ نہ تھا جب بھائیوں نے بغیر کسی کمی بیشی کے ساری آپ بیتی کہہ دی تو یعقوب (علیہ السلام) بہت حیران ہوئے اور ان کی طرف رخ کر کے ” کہنے لگے : تمہاری نفسانی خواہشات کا یہ معاملہ تمہارے سامنے اس طرح سے پیش کیا ہے اور اسے اس طرح سے مزین کیا ہے “ ( قَالَ بِنِ سَوَّلْتُ لَكُمْ أَنْفُسَكُمْ أَمْرًا ) - یعنی بالکل وہی جملہ کہا جو انہوں نے حادثہ یوسف (علیہ السلام) کے بعد کہا تھا جب کہ انہوں نے وہ جھوٹا واقعہ بیان کیا تھا -

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے ان کے سابقہ کردار ہی کے باعث ان کے بارے میں سوء ظن کیا اور یقین کر لیا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اس میں کوئی سازش ہے حالانکہ ایسا کرنا نہ صرف یعقوب (علیہ السلام) جیسے پیغمبر سے بعید معلوم ہوتا ہے بلکہ عام لوگوں سے بھی بعید ہے کہ کسی کو صرف اس کے کسی سابقہ برے کردار کی وجہ سے یقینی طور پر متہم کریں جبکہ دوسری طرف گواہ بھی ہوں اور تحقیق کا راستہ بھی بند نہ ہو -

یا پھر - کیا اس جملہ کا مقصد ایک اور نکتہ بیان کرنا ہے جس کے یہ پہلو ہیں :

۱ - تم فقط بادشاہ کا پیمانہ بھائی کے بارے میں دیکھ کر کیوں مان گئے کہ اس نے چوری کی ہے جب کہ تنہا یہ بات منطقی دلیل نہیں بن سکتی -

۲ - تم نے عزیز مصر سے کیوں کہا کہ طور کی یہ سزا ہے کہ اسے غلام بنالو حالانکہ یہ کوئی خدائی قانون نہیں بلکہ کنعان کے لوگوں کی ایک غلط رسم ہے

( یہ بات اس صورت میں درست ہے جب بعض مفسرین کے قول کے خلاف اس قانون کو شریعت یعقوب کا حصہ نہ سمجھا جائے ) -

۳ - اس واقعہ کے بعد تم فوراً کیوں چل پڑے اور برے بھائی کی طرح قیام کیوں نہیں کیا جبکہ تم میرے ساتھ پکا خدائی وعدہ کر چکے تھے - ۱

اس کے بعد یعقوب (علیہ السلام) اپنی جانب متوجہ ہوئے اور ” کہنے لگے کہ میں صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں

چھوڑوں گا اور اچھا صبر کروں گا کہ جو کفران نعمت سے خالی ہو (فَصَبْرٌ جَمِيلٌ) ۔ مجھے امید ہے کہ خدا ان سب جو (یوسف علیہ السلام) ، بنیامین اور میرے بڑے بیٹے کو (میری طرف پلٹا دے گا (عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا) کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ” وہ ان سب کے دل کو داخلی کیفیات سے باخبر ہے ، علاوہ ازیں وہ حکیم بھی ہے اور وہ کوئی کام بغیر کسی حساب کتاب کے نہیں کرتا“ (إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ) ۔ اس وقت یعقوب (علیہ السلام) رنج و غم میں ڈوب گئے ۔ بنیامین کہ جو ان کے دل کی ڈھارس تھا واپس نہ آیا تو انہیں پیارے یوسف (علیہ السلام) کی یاد آگئی ۔ انہیں خیال آیا کہ اے کاش آج وہ آبرومند ، بالیمان ، بابوش اور حسین و جمیل بیٹا ان کی آغوش میں ہوتا اور اس کی پیاری خوشبو ہر لمحہ باپ کو ایک حیاتِ نو بخشی لیکن آج نہ صرف یہ کہ اس کا نام و نشان نہیں بلکہ اس کا جانشین بنیامین بھی اس کے طرح ایک درد ناک معالے میں گرفتار ہو گیا ہے ۔ ” اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے رخ پھیر لیا اور کہا: بائے یوسف (علیہ السلام) (وَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسْفَىٰ عَلَىٰ يَٰسُفَ بھائی کہ پہلے جو بنیامین کے ماجرے پر باپ کے سامنے شرمندہ تھے یوسف کانام سن کر فکر میں ڈوب گئے ۔ ان کے ماتھے پر عرقِ ندامت کے قطرے چمکنے لگے ۔

حزن و ملال اتنا بڑھا کہ یعقوب (علیہ السلام) کی آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کا سیلاب بہہ کر یہاں تک کہ ” اس کی آنکھیں درد و غم سے سفید اور نابینا ہو گئیں (وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ) ۔ لیکن اس کے باوجود کوشش کرتے تھے کہ ضبط کریں اور اپنا غم و غصہ پی جائیں اور رضائے حق کے خلاف کوئی بات نہ کہیں ” وہ باحوصلہ اور جوان مرد تھے اور انہیں اپنے غصے پر پورا کنٹرول تھا “ ( فَهُوَ كَظِيمٌ) ۔ ظاہر آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) اس وقت تک نابینا نہیں ہوئے تھے لیکن اب جب کہ رنج و غم کئی گنا بڑھ گیا اور آپ مسلسل گریہ و زاری کرتے رہے اور آپ کے آنسو تھمنے نہ پاتے تھے تو آپ کی بینائی ختم ہو گئی اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کوئی اختیاری چیز نہ تھی کہ جو صبر و جمیل کے منافی ہو ۔ 2 بھائی کہ جو ان تمام واقعات سے بہت پریشان تھے ، ایک طرف تو ان کا ضمیر حضرت یوسف (علیہ السلام) کے واقعے کی بناء پر انہیں عذاب دیتا اور دوسری طرف وہ بنیامین کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک نئے امتحان کی چوکھٹ پر پاتے اور تیسری طرف باپ کا اتنا غم اور دکھ ان پر بہت گراں تھا لہذا انہوں نے پریشانی اور بے حوصلگی کے ساتھ باپ سے ”کہا: بخدا تو اتنا یوسف یوسف کرتا ہے کہ بیمار ہو جائے گا اور موت کے کنارے پہنچ جائے گا یا ہلاک ہو جائے گا (قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ نُنْفِئُكَ يَٰيُوسُفَ حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ) 3۔

لیکن کنعان کے اس مرد بزرگ اور روشن ضمیر پیغمبر نے ان کے جواب میں کہا: میں تمہارے سامنے اپنی شکایت پیش نہیں کی جو اس طرح کی باتیں کرتے وہ میں اپنا درد و غم بارگاہ الہی میں پیش کرتا ہوں اور اس کے ہاں اپنی شکایت پیش کرتا ہوں “ ( قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ) 4۔ اور اپنے خدا کی طرف سے مجھے ایسے الطاف و عنایات حاصل ہیں اور ایسی چیزیں مجھے معلوم ہیں کہ جن سے تم بے خبر ہو ( وَأَعْلَمُ مِنْ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ )

- ۱۔ یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ واقعہ یوسف (علیہ السلام) کی طرف اشارہ ہے ، بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ یوسف کو ماں باپ سے جدا کرنے کا معاملہ مندرجہ بالا آیات میں بالکل نہیں آیا ہے ۔
- 2۔ مزید وضاحت کے لئے اس سورہ کی آیہ ۱۸ کی تفسیر ملاحظہ کیجئے ۔
- ۳۔ ”بث“ کا معنی ہے پراکندگی اور ایسی چیز جسے چھپا یا نہ جاسکے اور یہاں واضح غم و اندوہ اور دل کی نمایاں پراکندگی کے معنی میں ہے ۔
- 4۔ ”حرض“ (بروزن ”مرض“ فاسد اور پریشان کرنے والی چیز کے معنی میں ہے ۔ یہاں اس کا معنی ہے بیمار، نحیف ، لاغر اور قریب المرگ۔

سورہ یوسف / 87 تا 93

۸۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوسُفَ وَاٰخِيْهِ وَاَلْبَيْتِ الَّذِيْنَ لَمْ يَلْبَسُوْا مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ اِنَّ الْاَقْوَامَ الْكَافِرُوْنَ ۔  
 ۸۸۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يَا اَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلُنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي

الْمُنْصَدِّقِينَ -

۸۹۔ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ۔

۹۰۔ قَالُوا أَنْتَ لَأَنْتَ يُوسُفُ قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔

۹۱۔ قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آتَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِبِينَ -

۹۲۔ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ -

۹۳۔ اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَأَلْفُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ۔

ترجمہ

۸۷۔ اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو

کیونکہ خدا کی رحمت سے کافر کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

۸۸۔ جب وہ اس (یوسف) کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: اے عزیز! ہم اور ہمارا خاندان پریشانی میں گھر گیا ہے اور

ہم (اناج خریدنے کے لئے) تھوڑی سی پونجی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ ہمارا پیمانہ پوری طرح بھر دے اور ہم پر صدقہ

کردے کیونکہ خدا صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔

۸۹۔ اس نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب کہ تم جاہل تھے۔

۹۰۔ انہوں نے کہا: کیا تو وہی یوسف (علیہ السلام) ہے۔ اس نے کہا: (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے خدانے ہم

پر احسان کیا ہے۔ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر و استقامت دکھائے (آخر کار وہ کامیاب ہوتا ہے) کیونکہ خدا

انیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

۹۱۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! تجھے ہم پر مقدم رکھا اور ہم خطا کار تھے۔

۹۲۔ اس نے کہا: آج تم پر کوئی ملامت و سرزنش نہیں ہے، خدا تمہیں بخشے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

۹۳۔ یہ میری قمیص لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تو وہ بینا ہو جائے گا اور تمام گھر والوں کو میرے پاس

لے آؤ۔

کوشش کرو اور مایوس نہ ہو

مصر اور اطراف مصر جس میں کنعان بھی شامل تھا میں قحط ظلم ڈھا رہا تھا۔ اناج بالکل ختم ہو گیا تو حضرت یعقوب

(علیہ السلام) نے دوبارہ اپنے بیٹوں کو مصر کی طرف جانے اور غلہ حاصل کرنے کا حکم دیا لیکن اس مرتبہ اپنی آرزوں

کی بنیاد پر یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی بنیامین کی تلاش کو قرار دیا اور کہا: ”میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف

(علیہ السلام) اور اس کے بھائی کو تلاش کرو“ (يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ)۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے بیٹے چونکہ اس بارے میں تقریباً مطمئن تھے کہ یوسف (علیہ السلام) موجود ہی نہیں اس

لئے وہ باپ کی اس نصیحت اور تاکید پر تعجب کرتے تھے۔

یعقوب ان کے گوش گزار کرتے رہے تھے: ”رحمت الہی سے کبھی مایوس نہ ہونا“ کیونکہ اس کی قدرت تمام مشکلوں

اور سختیوں سے مافوق ہے (وَلَا تَيْسَّرُوا مِنْ رُوحِ اللَّهِ) کیونکہ صرف بے ایمان کافر کہ جو قدرتِ خدا سے بے خبر ہیں اس

کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں (إِنَّهُ لَا يَأْتِيَنَّكَ مِنَ رُوحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ)۔

”تحسس“ مادہ ”حس“ سے ہے اور یہ قوتِ حس کے ذریعے کسی چیز کی جستجو اور تلاش کے معنی میں ہے۔ اور یہ

کہ ”تجسس“ میں اور اس میں کیا فرق ہے، اس سلسلے میں مفسرین اور ارباب لغت کے درمیان اختلاف ہے۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ ”تحسس“ امورِ خیر میں ہے اور تجسس“ امورِ شر میں۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ ”تحسس“ افرادِ اقوام کی سرگزشت جاننے کے لئے کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور

تجسس“ عیوب و نقائص کی جستجو کرنے کے معنی میں ہے۔

بعض دیگر احباب نے دونوں سے ایک ہی معنی مراد لیا ہے۔

لیکن اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس میں فرمایا گیا ہے:

لَاتَجَسَّسُوا وَلَا تَحَسَّسُوا

۔ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ نیز ان دونوں کے درمیان فرق کے بارے میں، زیر بحث آیت کے

معنی میں، ابن عباس کانظریہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث میں دونوں سے منع کیا گیا ہے تو ہو

سکتا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہو کہ لوگوں کے کاموں اور معاملات کی ٹوہ میں نہ رہو نہ ان کے اچھے کاموں کی ٹوہ

میں اور نہ ہی برے کاموں کی ٹوہ میں -

”روح“ رحمت، راحت، سہولت اور کشائش۔ کار کے معنی میں ہے۔ مفردات میں راغب کہتا ہے کہ ”روح“ (بر وزن ”لوح“) اور ”روح“ (بر وزن ”نوح“) دونوں کا اصل میں ایک ہی معنی ہے اور یہ ”جان“ اور تنفس“ کے معنی میں ہیں۔ بعد ازاں ”روح“ (بر وزن ”لوح“) رحمت اور کشائش کے معنی میں استعمال ہونے لگا (اس بناء پر کہ ہمیشہ مشکلات ٹل جانے پر انسان نئی روح اور جان پاتا ہے اور آزاری کا سانس لیتا ہے)۔

بہر حال فرزند ان یعقوب (علیہ السلام) نے اپنا مال و اسباب باندھا اور مصر کی طرف چل پڑے اور اب کے وہ تیسری مرتبہ داستانوں سے معمور اس سر زمین پر پہنچے۔ گزشتہ سفروں کے برخلاف اس سفر میں ان کی روح کو ایک احساسِ ندامت کچوکے لگا رہا تھا کیونکہ مصر میں اور عزیز مصر کے نزدیک ان کا سابقہ کردار بہت برا تھا اور وہ بدنام ہو چکے تھے اور اندازہ تھا شاید بعض لوگ انہیں ”کنعان کے چور“ کے عنوان سے پہچانیں۔ دوسری طرف ان کے پاس گندم اور دوسرے اناج کی قیمت دینے کے لئے درکار مال و متاع موجود نہیں تھا اور ساتھ ہی بنیامین کے کھو جانے اور باپ کی انتہائی پریشانی نے ان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ گویا تلوار ان کے حلقوم تک پہنچ گئی تھی۔ بہت ساری مشکلات اور روح فرسا پریشانیوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ایسے میں جو چیز ان کی تسکینِ قلب کا باعث تھی وہ صرف باپ کا آخری جملہ تھا کہ جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اس کے لئے ہر مشکل آسان ہے۔ اس عالم میں ”وہ یوسف (علیہ السلام) (علیہ السلام) کے پاس پہنچے اور اس وقت انتہائی پریشانی کے عالم میں انہوں نے اس کی طرف رخ کیا اور کہا: اے عزیز! ہمیں او ہمارے خاندان کو قحط، پریشانی اور مصیبت نے گھیر لیا ہے“ (فَلَمَّا نَحَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسْنَا وَأَهْلُنَا الضَّرُّ)۔ ”اور ہمارے پاس صرف تھوڑی سی کم قیمت پونجی ہے“ (وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُزْجَاةٍ) ۱۔

لیکن پھر بھی ہمیں تیرے کرم اور شفقت پر بھروسہ ہے ”اور ہمیں توقع ہے کہ تو ہمارا پیمانہ بالکل پورا کرے گا“ (فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ)۔ ”اور اس معاملے میں ہم پر احسان کرتے ہوئے صدقہ کر“ (وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا)۔

اور اپنا اجر و ثواب ہم نے لے لے بلکہ اپنے خدا سے لے کیونکہ خدا کریموں اور صدقہ کرنے والوں کو اجر خیر دیتا ہے (إِنَّ اللَّهَ يُجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ)۔

یہ قابل توجہ ہے کہ برادران یوسف (علیہ السلام) کو باپ نے تاکید کی تھی کہ پہلے یوسف (علیہ السلام) اور اس کے بھائی کے لئے جستجو کریں اور بعد میں اناج حاصل کریں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس بات کی طرف چنداں توجہ نہیں کی اور سب سے پہلے انہوں نے عزیز مصر سے اناج کا تقاضہ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں یوسف (علیہ السلام) کے ملنے کی چنداں امید نہ تھی یا ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ بہتر ہے کہ اپنے کو اناج کے خرید داروں کے طور پر پیش کریں جو کہ زیادہ طبعی اور فطری ہے اور بھائی کی آزادی کا تقاضا ضمناً بنے دیں تاکہ یہ چیز عزیز مصر پر زیادہ اثر انداز ہو۔

بعض نے کہا کہ ”تصدق علینا“ سے مراد وہی بھائی کی آزادی ہے ورنہ وہ اناج بغیر معاوضے کے حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اسے ”تصدق“ قرار دیا جاتا۔

روایات میں بھی ہے کہ بھائی باپ کی طرف سے عزیز مصر کے نام ایک خط لے کر آئے تھے اس خط میں حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے عزیز مصر کے عدل و انصاف کا تذکرہ کیا۔ اپنے خاندان سے اس کی محبتوں اور شفقتوں کی تعریف کی۔ پھر اپنا اور پائے خاندان نبوت کا تعارف کروایا۔ اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا اور ساتھ ہی اس کے ضمن میں اپنے بیٹے یوسف (علیہ السلام) اور دوسرے بیٹھے بنیامین کے کھوجانے اور خشک سالی سے پیدا ہونے والی مصیبتوں کا ذکر کیا۔ خط کے آخر میں اس سے خواہش کی گئی تھی کہ بنیامین کو آزاد کر دے اور تاکید کی تھی کہ ہمارے خاندان میں چوری وغیرہ ہر گز نہ تھی اور نہ ہوگی۔

جب بھائیوں نے باپ کا خط عزیز مصر کو دیا تو انہوں نے اسے لے کر چوما اور اپنی آنکھوں پر رکھا اور رونے لگے۔ گریہ کا عالم یہ تھا کہ قطراتِ اشک انکے پیراہن پر گرنے لگے۔ 2

(یہ دیکھ کر بھائی حیرت و فکر میں ڈوب جاتے ہیں کہ عزیز مصر کو ان کے باپ سے کیا لگاؤ ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کے باپ کے خط نے اس میں ہیجان و اضطراب کیوں پیدا کر دیا ہے اور شاید اسی موقع پر ان کے دل میں یہ خیال بجلی کی طرح اُترا ہو کہ ہو نہ ہو یہی یوسف (علیہ السلام) ہو اور شاید باپ کے اسی خط کی وجہ سے یوسف (علیہ السلام) اس قدر بیقرار ہو گئے کہ اب مزید اپنے آپ کو عزیز مصر کے نقاب میں نہ چھپا سکے اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بہت جلد بھائیوں سے بھائی کی حیثیت سے اپنا تعارف کروادیا)۔

اس موقع پر جبکہ دور آزمائش ختم ہو رہا تھا اور یوسف (علیہ السلام) بھی بیتاب اور پریشان نظر آ رہے تھے تعارف کے لئے

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بھائیوں کی طرف رخ کر کے آپ نے ” کہا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم جاہل و نادان تھے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا ( قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ) - حضرت یوسف (علیہ السلام) کی عظمت اور شفقت ملاحظہ ملاحظہ کیجئے کہ اولاً تو ان کاگناہ مجمل طور پر بیان کیا اور کہا: ” مافعلتم“ ( جو کچھ تم نے انجام دیا ہے اور اب تم عاقل اور سمجھدار ہو۔

ضمناً اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں انہوں نے صرف یوسف (علیہ السلام) پر ظلم نہیں ڈھایا تھا بلکہ بنیامین بھی اس دور میں ان کے شر سے محفوظ نہیں تھے اور انہوں نے اس کے لئے بھی اس زمانے میں مشکلات پیدا کی تھیں۔ جب بنیامین مصر میں یوسف (علیہ السلام) کے پاس تھے شاید ان دنوں میں انہوں نے ان کی کچھ بے انصافیاں اپنے بھائی کو بتائی ہوں۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہوں اور یہ خیال نہ کریں کہ عزیز مصر ہم سے انتقام لینے والا ہے یوسف (علیہ السلام) نے اپنی گفتگو کو ایک تبسم کے ساتھ ختم کیا۔ اس تبسم کی وجہ سے بھائیوں کو حضرت یوسف (علیہ السلام) کے خوبصورت دانت پوری طرح نظر آگئے۔ جب انہوں نے خوب غور کیا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ دانت ان کے بھائی یوسف (علیہ السلام) سے عجیب مشابہت رکھتے ہیں۔ 3

3- مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اس طرح بہت سے پہلو جمع ہو گئے۔ ایک طرف تو انہوں نے دیکھا کہ عزیز مصر یوسف (علیہ السلام) کے بارے میں اور اس پر بھائیوں کی طرف سے کئے گئے مظالم کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنہیں سوائے ان کے اور یوسف (علیہ السلام) کے کوئی نہیں جانتا تھا دوسری طرف انہوں نے دیکھا کہ یعقوب (علیہ السلام) کے خط نے اس قدر مضطرب کر دیا ہے جیسے اس کا یعقوب (علیہ السلام) سے کوئی بہت ہی قریبی تعلق ہو۔ تیسری طرف وہ اس کے چہرے مہرے پر جتنا غور کرتے انہیں اپنے بھائی یوسف (علیہ السلام) سے بہت زیادہ مشابہت دکھائی دیتی۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ یوسف (علیہ السلام) عزیز مصر کی مسند پر پہنچ گیا ہو۔ وہ سوچتے کہ یوسف (علیہ السلام) کہا اور یہ مقام کہاں؟

لہذا انہوں نے شک و تردد کے لہجے میں ” کہا: کیا تم خوف یوسف (علیہ السلام) تو نہیں ( قَالُوا أَلَيْسَ لَأَنْتَ يُوسُفَ )۔ یہ موقع بھائیوں پر بہت زیادہ حساس لمحات گزرا۔ کیونکہ صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ عزیز مصر کے سوال کے جواب میں کیا کہے گا۔ کیا سچ مچ وہ پردہ ہٹا دے گا اور اپنا تعارف کروائے گا یا انہیں دیوانہ اور بے وقوف سمجھ کر خطاب کرے گا کہ انہوں نے ایک مضحکہ خیز بات کی ہے۔

گھڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں انتظار کے روح فرسا لمحے ان کے دل کو بوجھل کر رہے تھے لیکن حضرت یوسف (علیہ السلام) نے نہ چاہا کہ یہ زمانہ طویل ہو جائے۔ اچانک انہوں نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا یا اور ” کہا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے “ ( قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي ) لیکن اس بناء پر کہ وہ خدا کی نعمت پر شکر ادا کریں کہ جس نے یہ سب نعمات عطا فرمائی تھیں اور ساتھ ہی بھائیوں کو بھی ایک عظیم درس دیں انہوں نے مزید کہا: خدانے ہم پر احسان کیا ہے جو شخص بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرے گا خدا اسے اس کا اجر و ثواب دے گا کیونکہ خدا نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا “ ( قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ نَا أَنَّهُ مَنْ يَتَّقُ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ )۔

کسی کو معلوم نہیں کہ ان حساس لمحات میں کیا گزری اور جب دسیوں سال بعد بھائیوں نے ایک دوسرے کو پہچانا تو کیسا شور و غوغا مچا، وہ کس طرح آپس میں بغل گیر ہوئے اور کس طرح سے ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امڈ پڑے۔

ان تمام چیزوں کے باوجود بھائی اپنے آپ میں شرمندہ تھے۔ وہ یوسف (علیہ السلام) کے چہرے کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھ پارہے تھے۔

وہ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں ان کا عظیم گناہ بخشش و عفو کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ لہذا انہوں نے بھائی کی طرف رخ کیا اور کہا: خدا کی قسم: اللہ نے تجھے ہم پر مقدم کیا ہے اور تجھے ترجیح دی ہے اور علم حلم اور عقل و حکومت کے لحاظ سے جھے فضیلت بخشی ہے ( قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آتَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا ) 4۔

یقیناً ہم خطاکار اور گناہ گار تھے ( وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ ) 5۔

لیکن یوسف (علیہ السلام) نہیں چاہتے تھے کہ بھائی اس طرح شرمسار رہیں خصوصاً جب کہ یہ ان کی اپنی کامیابی و کامرانی کا موقع تھا یا یہ کہ احتمالاً بھائیوں کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ یوسف (علیہ السلام) اس موقع پر انتقام لے گا لہذا

فوراً یہ کہہ کر انہیں مطمئن اور پر سکون کر دیا کہ ” آج تمہیں کوئی سرزنش اور توبیخ نہیں ہو گی “ ( قَالَ لَا تَأْتِرُ بَعْدَ عَلَيْنَا )

تمہاری فکر آسودہ رہے اور وجدان کو راحت رہے اور گذشتہ گناہوں پر غم نہ کرو۔ اس بناء پر کہ انہیں بتایا جائے کہ انہیں نہ صرف یوسف (علیہ السلام) کا حق بخش دیا گیا ہے بلکہ ان کی ندامت و پشمانی کی وجہ سے اس سلسلے میں خدائی حق بھی قابل بخشش ہے ، مزید کہا: اللہ بھی تمہیں بخش دے گا کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے ( يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ )۔ یہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی انتہائی عظمت کی دلیل ہے کہ نہ صرف اپنا حق معاف کر دیا بلکہ اس بات پر بھی تیار نہ ہوئے کہ انہیں تھوڑی سی بھی سرزنش کی جائے چہ جائیکہ ، بھائیوں کو کوئی سزا دیتے بلکہ حق الہی کے لحاظ سے بھی انہیں اطمینان دلا یا کہ خدا غفور اور بخشنے والا ہے بلکہ یہ بات ثابت کرنے کے لئے یہ استدلال پیش کیا کہ وہ ارحم الراحمین ہے ۔

اس موقع پر بھائیوں کو ایک اور غم بھی ستا رہا تھا اور وہ یہ کہ باپ اپنے بیٹوں کے غم میں ناپائیدار ہو چکا تھا اور اس کا اس طرح رہنا پورے خاندان کے لئے ایک جانکاح رنج ہے علاوہ ازیں ان کے جرم پر ایک مسلسل دلیل ہے ۔ لہذا یوسف (علیہ السلام) نے اس عظیم مشکل کے حل کے لئے بھی فرمایا : ” میرا یہ پیرا بن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو تاکہ وہ بینا ہو جائے “ ( اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَاَلْفُوهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِي يَاتِ بِصَبْرًا )۔ ”اس کے بعد سارے خاندان کے ہمراہ میرے پاس آ جاؤ “ ( وَاتُّونِي بِالْهَلِكُمْ اَجْمَعِينَ ) ۔

۱. بضاعت - بضع کے مادہ سے ہے بروزن جزء
2. مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔
3. ” تثریب“ اصل میں ” ثرب“ (بروزن ” سرد “ کے مادہ سے ہے ” ثرب“ در اصل چربی کی اس نازک اور پتلی جھلی کو کہتے ہیں جس نے معدے اور آنتوں کو چھپا رکھا ہوتا ہے اور ” تثریب “ اسے الگ کر دینے کے معنی میں ہے ۔ بعد ازاں یہ سرزنش و ملامت کے معنی میں استعمال ہو نے لگا گویا اس کام سے گناہ کا پر دہ دوسرے کے چہرے سے دور کر دیا جاتا ہے ( قاموس ، مفردات راغب، تفسیر فخر رازی اور روح المعانی کی طرف رجوع فرمائیں ) ۔
4. ” اثرک“ ایثار کے مادہ سے ہے ۔
5. فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ ” خاٹی “ اور ” مخطی“ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ” خاٹی “ اس شخص کو کہتے ہیں جو جان بوجھ کر برے کام کرے اور ” مخطی “ اسے کہتے ہیں جو غلطی سے غلط کام کرے بیٹھے ۔
6. مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں ۔

چند اہم نکات

- ۱۔ یوسف (علیہ السلام) کی قمیص کون لے کر گیا ؟
- چند ایک روایات میں آیا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے کہا :
- میرا شفا بخش کرتہ باپ کے پاس وہی لے کر جائے جو خون آلودہ کرتہ لے کر گیا تھا تاکہ جیسے اس نے باپ کو تکلیف پہنچائی اور پریشان کیا تھا اب کے اسے خوش و خرم کرے ۔
- لہذا یہ کام ” یہودا“ کے سپرد ہوا کیونکہ اس نے بتا تھا کہ وہ میں ہو جو خون آلودہ کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان سے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کو بھیڑیا کہا گیا ہے ۔
- اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ یوسف (علیہ السلام) اس قدر مشکلات اور مصائب میں گرفتار رہے لیکن اخلاقی مسائل کی باریکی سے غافل نہیں رہتے تھے ۔ 6

- ۲۔ یوسف (علیہ السلام) کی عظمت :
- بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ اس ماجرے کے بعد حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائی ہمیشہ شرمسار رہتے تھے ۔ انہوں نے کسی کو یوسف (علیہ السلام) کے پاس بھیجا اور رکھلایا کہ آپ ہر صبح و شام ہمیں دسترخوان پر بٹھا تے ہیں اور آپ کا چہرہ دیکھ کر ہمیں شرم و خجالت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہم نے آپ کے ساتھ اس قدر جسارتیں کی ہیں ۔
- اس بناء پر کہ انہیں نہ صرف احساس شرمندگی نہ ہو بلکہ یوسف (علیہ السلام) کے دسترخوان پر ان کی موجودگی کو یوسف (علیہ السلام) کی ایک خدمت محسوس کریں ، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے انہیں بہت ہی عمدہ جواب دیا ۔ آپ

نے کہا: <br> مصر کے لوگ اب تک مجھے ایک زر خرید غلام کی نظر سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے :

سبحان من بلغ عبداً ببيع بعشرين درهماً مابلغ

پاک ہے وہ ذات جس نے اس غلام کو کہ جو بیس درہم میں بیچا گیا اس مقام تک پہنچا یا ۔  
لیکن اب جب کہ تم لوگ آگئے ہو اور میری زندگی کی کتاب ان کے سامنے کھل گئی ہے تو وہ سمجھنے لگے کہ غلام نہیں تھا بلکہ میں خاندان نبوت سے تعلق رکھتا ہوں اور ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد میں سے ہوں اور یہ میرے لئے باعث افتخار ہے ۔ 1-

۳۔ کامیابی کا شکرانہ :

مندرجہ بالا آیات میں یہ اہم اخلاقی درس اور واضح ترین اسلامی حکم موجود ہے کہ دشمن پر کامیابی کے وقت انتقام جو اور کینہ پر ور نہ بنو ۔

یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے انہیں نہایت سخت صدمے پہنچائے تھے اور انہیں موت کی دہلیز تک پہنچا دیا تھا ۔ اگر لطف الہی شامل حال نہ ہوتا تو بچ جانا ان کے لئے ممکن نہ تھا صرف یہی نہیں کہ انہوں نے یوسف (علیہ السلام) کو تکلیف پہنچائی تھی بلکہ ان کے والد کو بھی سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب جب کہ وہ سب کے سب رازو نزار یوسف (علیہ السلام) کے سامنے تھے اور یوسف (علیہ السلام) کے پاس پوری قدرت و طاقت بھی تھی مگر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی گفتگو سے او ران کے کلمات کے اندر جھانکنے سے اچھی طرح محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں نہ صرف یہ کہ کوئی کینہ موجود نہیں تھا بلکہ انہیں اس بات سے تکلیف ہوتی تھی کہ ان کے بھائی گزشتہ واقعے کو یاد کریں اور پریشان و غمزہ ہوں اور شرمندگی محسوس کریں ۔ <br> یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ احساس ان کی روح سے نکال دیں ۔ یہاں تک کہ اس سے بھی بڑھ کر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں یقین دلائیں کہ ان کا مصر میں آنا اس لحاظ سے باعث افتخار ہے کہ خود حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بارے میں مزید آگاہی کا سبب بنا ہے او رلوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ وہ خاندان رسالت میں سے ہیں نہ کہ ایک کنعانی غلام ہیں کہ جسے چند درہموں میں بیچا گیا ہے ۔ وہ چاہتے ہیں کہ بھائی اس طرح محسوس کریں کہ نہ صرف یہ کہ میں ان پر احسان نہیں کر رہا بلکہ وہ مجھ پر احسان کر رہے ہیں ۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ پیغمبر اسلام کو ایسے ہیں حالات میں پیش آنے اور فتح مکہ کے موقع پر آپ کو خونخوار دشمنوں یعنی شرک و بت پرستی کے سر غنوں پر کامیابی حاصل ہوئی تو ابن عباس کے بقول آپ خانہ کعبہ کے پاس تشریف لائے ۔ اس وقت مخالفین کعبہ میں پناہ لے چکے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ پیغمبر اسلام ان کے بارے میں کیا حکم صادر کرتے ہیں ۔ ایسے میں آپ نے کعبہ کے کٹھے کو پکڑ کر فرمایا:

الحمد لله الذي صدق وعده و نصر عيده و هزم الاحزاب و حده

شکر ہے خدا کا کہ جس کا وعدہ پورا ہوا اور اس نے اپنے بندے کو کامیاب کیا اور دشمنوں کے گروہوں کو شکست دی ۔ اس کے بعد آپ (علیہ السلام) نے لوگوں کی طرف رخ کیا اور فرمایا :

ماذا تظنون معشر قريش

اے قريش والو! کیا گمان ہے کہ میں تمہارے بارے میں حکم دوں گا ۔

قالوا خيراً ، و ابن اخ كريم و قد قدرت

انہوں نے جواب دیا : ہم تجھ سے خیر و نیکی کے علاوہ کوئی توقع نہیں رکھتے ۔ آپ کریم و شریف بھائی ہیں اور کریم و بزرگوار بھائی کے بیٹے ہیں اور اس وقت قدرت و طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے ۔

قال و انا اقول كما قال اخى يوسف : لا تتريب عليكم اليوم

اس پر پیغمبر اکرم نے فرمایا : میں تمہارے بارے میں وہی کچھ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کامیابی کے وقت کہا تھا ” لا تتريب عليكم اليوم “۔ یعنی ۔ آج تمہارے لئے روز ملامت و سرزنش نہیں ہے ۔

عمر کہتے ہیں :

اس موقع پر میرے چہرے پر شرم و حیا سے پسینہ آگیا کیونکہ میں نے مکہ میں داخل ہوتے وقت ان سے کہا تھا : آج کے دن میں تم سے انتقام لوں گا ۔ جب پیغمبر نے وہ جملہ فرمایا تو مجھے اپنی گفتگو پر شرم آئی ۔ 2-

روایات اسلامی میں بھی بار بار یہ آیا ہے کہ :  
 کامیابی کی زکات عفو و بخشش ہے - حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :  
 اذا قدرت علی عدوک فاجعل العفو عنہ شکرًا للقدرة علیہ -  
 جس وقت تو اپنے دشمن پر کامیاب ہو جائے تو عفو بخشش کو اپنی کامیابی کا شکرانہ قرار دے - 3

1. تفسیر فخر رازی جلد ۱۸ ص ۲۰۶.
2. تفسیر قرطبی، جلد ۵ ص ۳۴۸۷.
3. نہج البلاغہ کلمات قصار - جملہ ۱۱.

### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ یوسف/ 94 تا 98

- ۹۴۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعَبِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِي -
  - ۹۵۔ قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ -
  - ۹۶۔ فَلَمَّا أُنْجِيَ الْيُوسُفُ أَلْقَاهُ عَلَيْهِمْ فَارْتَدَّ بَصِيرًا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ -
  - ۹۷۔ قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ -
  - ۹۸۔ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ -
- ترجمہ
- ۹۴۔ جس وقت قافلہ (س رزمین مصر سے) جد ابوا تو ان کے باپ (یعقوب) نے کہا : اگر مجھے نادانی اور کم عقل کی نسبت نہ دو تو مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے -
- ۹۵۔ انہوں نے کہا: بخدا تو اسی گزشتہ گمراہی میں ہے -
- ۹۶۔ لیکن جب بشارت دینے والا گیا (اور اس نے) وہ کرتہ (اس کے چہرے پر ڈالا تو اچانک وہ بینا ہو گیا - تو اس نے کہا : کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خدا کی طرف ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے -
- ۹۷۔ انہوں نے کہا ابا (جان) ! خد سے ہمارے گناہوں کی بخشش کو خواہش کریں ، بے شک ہم خطا کار تھے -
- ۹۸۔ اس نے کہا عنقریب میں اپنے پرور دگار سے تمہارے لئے طلب بخشش کرونگا - بے شک وہ غفور و رحیم ہے -

آخر کار لطف الہی اپنا کام کرے گا

فرزند ان یعقوب (علیہ السلام) خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے - وہ خوشی خوشی یوسف (علیہ السلام) کا پیرا بن اپنے ساتھ لے کر قافلے کے ساتھ مصر سے چل پڑے - ادھر بھائیوں کے لئے زندگی کے شیریں لمحات تھے ادھر شام کے علاقے کنعان میں بورھے کا گھر غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا - سارا گھر نہ افسردہ اور غم زدہ تھا -

لیکن - ادھر یہ قافلہ مصر سے چلا اور ادھر اچانک یعقوب (علیہ السلام) کے گھر میں ایک واقعی رونما ہوا جس سے سب کو تعجب میں ڈال دیا - یعقوب (علیہ السلام) کا جسم کانپ رہا تھا - انہوں نے بڑے اطمینان اور اعتماد سے پکار کر کہا : اگر تم بد گوئی نہ کرو اور میری طرف نادانی اور جھوٹ کی نسبت نہ دو تو میں تم سے کہتا ہوں کہ مجھے اپنے پیارے یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو آرہی ہے ، میں محسوس کر رہا ہوں کہ رنج و غم اور زحمت و مشکل کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں اور وصال و کامیابی کا زمانہ آنے کو ہے ، خاندان یعقوب (علیہ السلام) اب لباس ماتم اتار دے گا اور لباس مسرت زیب ترن کرے گا لیکن میرا خیال نہیں کہ تم ان باتوں پر یقین کرو گے ( وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعَبِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِي )

” فصلت“ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) میں یہ احساس اسی وقت پیدا ہوا جب قافلہ مصر سے چلنے لگا۔ قاعدتا حضرت یعقوب (علیہ السلام) سے کہا: آپ اسی پرانی گمراہی میں ہیں (قَالُوا تَأْتِيهِمْ مِنْكُمْ أَنْتُمْ لَكُمْ الْقَدِيمِ) یعنی اس سے بڑھ کر گمراہی کیا ہوگی کہ یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو آ رہی ہے، مصر کہا اور شام کو کنعان کہا، کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ہمیشہ خواہ و خیال کی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنے خیالات و تصورات کو حقیقت سمجھتے ہیں، آپ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہیں، بہر حال آپ تو پہلے بھی اپنے بیٹوں سے کہہ چکے ہیں کہ مصر کی طرف جاؤ اور رمیرے یوسف (علیہ السلام) کی تلاش کرو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ضلالت و گمراہی سے مراد عقیدے اور نظر سے کی گمراہی نہیں ہے بلکہ یوسف (علیہ السلام) سے متعلق مسائل کے سمجھنے میں گمراہی مراد ہے۔

بہر کیف ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس عظیم کہنہ سال اور روشن ضمیر پیغمبر سے کیسا شدید اور جسارت آمیز سلوک کرتے تھے۔

ایک جگہ انہوں نے کہا: ہمارا باپ ”ضلال مبین“ (کھلی گمراہی) میں ہے اور یہاں انہوں نے کہا: تم اپنی اسی دیرینہ گمراہی میں ہو۔

وہ پیر کنعان کے دل کی پاکیزگی اور روشنی سے بے خبر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کا دل بھی انہی کے دل کی طرح تاریک ہے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ آئندہ کے واقعات اور دور و نزدیک کے مقامات اس کے آئینہ دل میں منعکس ہوتے ہیں۔ کئی رات دن بیت گئے۔ یعقوب اسی طرح انتظار کہ جس کی گہرائی میں مسر و شادمانی اور سکون و اطمینان موجزن تھا حالانکہ ان کے پاس رہنے والوں کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یوسف (علیہ السلام) کا معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے۔

معلوم نہیں یعقوب (علیہ السلام) پر یہ چند دن اور راتیں کس طرح گزریں۔ آخر کار ایک دن آیا جب آواز آئی وہ دیکھو مصر سے کنعان کا قافلہ آیا ہے۔

گزشتہ سفروں کے برخلاف فرزندان یعقوب (علیہ السلام) شاداں و فرخاں شہر میں داخل ہوئے اور بڑی تیزی سے باپ کے گھر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ”بشیر“ بوڑھے یعقوب (علیہ السلام) کے پاس آیا (وہی ”بشیر“ جو وصال کی بشارت لایا تھا اور جس کے پاس یوسف (علیہ السلام) کا پیرا ہن تھا) اس نے آتے ہیں پیرا ہن یعقوب (علیہ السلام) کے چہرے پر ڈال دیا۔ یعقوب (علیہ السلام) کی آنکھیں تو بے نور تھیں۔ وہ پیرا ہن کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایک آشنا خوشبو ان کے مشام جان میں تر گئی ہے۔ یہ ایک پر کیف زریں لمحہ تھا۔ گویا ان کے وجود کا ہر ذرہ روشن ہو گیا ہو آسمان و زمین مسکرا اٹھے ہوں۔ ہر طرف قہقہے بکھر گئے ہوں، نسیم رحمت چل اٹھی ہو اور غم و اندوہ کا گرد و غبار لپیٹ کر لے جا رہی ہو درو دیوار سے خوشی کے نعرے سنائی دے رہے تھے اور یعقوب (علیہ السلام) اسی ساری فضا کے ساتھ تبسم کناں تھے۔ ایک عجیب پوجانی کیفیت تھی جو اس بوڑھے انسان پر طاری تھی۔ اچانک انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں ہیں اور وہ ہر جگہ دیکھ رہے ہیں۔ دنیا اپنی تمام زیبائوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: جب بشارت دینے والا آیا تو اس نے وہ (پیرا ہن) ان کے چہرے پر ڈال دیا تو اچانک وہ بینا ہو گئے (فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَى وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا)۔

بہائیوں اور گر دوں پیش والوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو امانڈ آئے اور یعقوب (علیہ السلام) نے پورے اعتماد سے کہا: میں نہ کہتا تھا کہ میں خدا کی طرف سے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے (قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ)۔

اس حیران کن معجزہ پر گہری فکر میں ڈوب گئے۔ ایک لمحہ کے لئے اپنا تاریک ماضی ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، خطا، اشتباہ اور تنگ نظری سے پر ماضی۔

لیکن کتنی اچھی بات ہے کہ جب انسان اپنی غلطی کو سمجھ لے تو فوراً اس کی اصطلاح کی فکر کرے فرزندان یعقوب (علیہ السلام) بھی اسی فکر میں گم ہو گئے۔ انہوں نے باپ کا دامن پکڑ لیا اور ”کہ ا: باباجان! خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے گناہوں اور خطاؤں کو بخش دے“ (قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا)۔

”کیونکہ ہم گناہگار اور خطا کار تھے“۔ (إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ)۔

بزرگوار اور باعظمت بوڑھا جس کا ظرف سمندر کی طرح وسیع تھا، اس نے کوئی ملامت و سرزنش کئے بغیر ان سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد

تمہارے لئے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کروں گا (قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي)۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہاری

توبہ قبول کر لے گا اور تمہارے گناہوں سے صرف نظر کر لے گا کیونکہ ” وہ غفور و رحیم ہے “ ( إِنَّهُ هُوَ الْعَفُورُ الرَّحِيمُ ) -

چند اہم نکات

۱۔ یعقوب (علیہ السلام) نے پیراہن یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو کیسے محسوس کی؟  
یہ سوال بہت سے مفسرین نے اٹھا یا ہے اور اس پر بحث کی ہے عام طور پر مفسرین نے اسے یعقوب (علیہ السلام) یا یوسف (علیہ السلام) کا معجزہ قرار دیا ہے لیکن چونکہ قرآن نے اسے اعجاز یا غیر اعجاز ہونے کے لحاظ سے پیش نہیں کیا اور اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے ، اس کی سائنسی توجیہ معلوم کی جاسکتی ہے ۔  
موجودہ زمانے میں ” ٹیلی پیتھی “ ایک مسئلہ علمی ہے ( اس میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے دور رہنے والے افراد کے درمیان فکری ارتباط اور روحانی رابطہ ہو سکتا ہے ۔ اسے ” انتقال فکر “ کہتے ہیں ) ایسے افراد جو ایک دوسرے سے نزدیکی تعلق رکھتے ہیں یا جو بہت زیادہ روحانی طاقت رکھتے ہیں یہ تعلق ان کے درمیان پیدا ہو تا ہے ۔ شاید ہم میں سے بہت سے افراد نے اپنی روز مرہ کی زندگی میں اس کا سامنا کیا ہو کہ بعض اوقات کسی کی والدہ یا بھائی اپنے اندر بلا سبب بہت زیادہ اضطراب اور پریشانی محسوس کرتے ہیں اور زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ خبر پہنچتی ہے کہ اس کے بیٹے یا بھائی کو فلاں دور دراز علاقے میں ایک ناگوار حادثہ پیش آیا ہے ۔  
ماہرین اس قسم کے احساس کو ٹیلی پیتھی اور دور دراز کے علاقوں سے انتقال فکر کا عمل قرار دیتے ہیں ۔  
حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے واقعہ میں بھی ممکن ہے یوسف (علیہ السلام) سے شدید محبت اور آپ روحانی عظمت کے سبب آپ میں وہی احساس پیدا ہو گیا ہو جو یوسف (علیہ السلام) کا کرتہ اٹھاتے وقت بھائیوں میں پیدا ہوا تھا ۔  
البتہ یہ بات بھی ہر ح ممکن ہے کہ اس واقعے کا تعلق انبیاء کے دائرہ علم کی وسعت سے ہو ۔  
بعض روایات میں بھی انتقال فکر کے مسئلے کی طرف جاذب نظر اور عمدہ اشارہ کیا گیا ہے مثلاً :  
کسی نے امام باقر (علیہ السلام) سے عرض کیا : کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں بغیر کسی مصیبت یا ناگوار حادثے کے غمگین ہو جاتا ہوں یہاں تک کہ میرے گھر والے اور میرے دوست بھی اس کے اثرات میرے چہرے پر دیکھ لیتے ہیں ۔  
امام (علیہ السلام) نے فرمایا : ہاں ، خدا نے مومنین کو ایک ہی بہشتی طینت سے پیدا کیا ہے اور اسکی روح ان میں پھونکی ہے لہذا مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس وقت کسی ایک شہر میں ان میں سے کسی ایک خاص بھائی کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو باقیوں پر اس کا اثر ہوتا ہے ۔ 2  
بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کرتہ نہ تھا بلکہ ایک جنتی پیراہن تھا جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) خلیل اللہ کی طرف سے خاندانِ یعقوب (علیہ السلام) میں یاد گار کے طور پر چلا آ رہا تھا اور جو شخص حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی طرح بہشتی قوت شامہ رکھتا تھا وہ اس کی خوشبو دور سے محسوس کر لیتا تھا ۔ 3

۲۔ انبیاء کے حالات میں فرق:

یہاں پر ایک اور مشہور اعتراض سامنے آتا ہے ۔ فارسی زبان کے اشعار میں بھی اعتراض بیان کیا گیا ہے ۔  
کسی نے یعقوب (علیہ السلام) سے کہا :  
زمصرش بوی پیراہن شنیدی چرا درچاہ کنعانش نہ دیدی  
یعنی .. آپ نے مصر سے پیراہن کی خوشبو سونگھ لی لیکن آپ کو کنعان کے کنویں میں یوسف (علیہ السلام) کیوں دکھائی نہ دیا؟

کیسے ہوسکتا کہ اس عظیم پیغمبر نے اتنے دور دراز کے علاقے سے یوسف (علیہ السلام) کی قمیص کی خوشبو سونھ لی جب کہ بعض نے یہ فاصلہ اسی فرسخ لکھا ہے اور بعض نے دس دن کی مسافت بیان کی ہے لیکن اپنے ہی علاقے کنعان کے اندر جب کہ یوسف (علیہ السلام) کو اس کے بھائی نے کنویں میں پھینک رہے تھے اور ان پر وہ واقعات گزر رہے تھے اس سے یعقوب (علیہ السلام) آگاہ نہ ہوئے ؟

قبل ازیں انبیاء اور ائمہ کے علم غیب کی حدود کے بارے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس سوال کا جواب ہر گز مشکل نہیں رہتا ۔ امور غیب کے متعلق ان کا علم پرور نگار کے ارادے اور عطا کئے ہوئے علم پر منحصر ہے ۔ جہاں خدا چاہتا ہے وہ جانتے ہیں چاہے واقعے کا تعلق کسی دور دراز علاقے سے ہو اور جہاں وہ نہ چاہے نہیں جانتے چاہے معاملہ کسی نزدیک ترین علاقے سے مربوط ہو ۔ جیسے کسی تاریک رات میں ایک قافلہ کسی بیا بان سے گزر رہا ہو اور ۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا ہو ۔ ایک لمحے کے لئے بجلی خاموش ہو جائے اور پھر تاریکی ہر طرف چھا جائے اس طرح سے کہ کوئی چیز نظر نہ آئے ۔

شاید امام جعفر صادق علیہ السلام علم امام کے بارے میں مروی یہ حدیث اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے ، آپ فرماتے ہیں :

جعل الله بينه وبين الامام عموداً من نور ينظر الله به الى الامام و ينظر الامام به اليه فاذا اراد علم شيء نظر في ذلك النور فعرّفه

خدا نے اپنے اور امام و پیشوائے خلق کے درمیان نور کا ایک ستون بنایا ہے ۔ اسی سے خدا امام کی طرف دیکھتا ہے اور امام بھی اسی طریق سے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتا ہے اور جب امام کوئی چیز جاننا چاہتا ہے تو نور کے اس ستون میں دیکھتا ہے اور اس سے آگاہ ہوجاتا ہے ۔ 4

ایک شعر جو پہلے ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد سعدی کے مشہور اشعار میں ایسی ہی روایات کے پیش نظر کہا گیا ہے :

بگفت احوال مابرق جہان است گہی پیدا و دیگر دم نہان است  
گہی برکام اعلا نشینیم گہی تا پشت پای خود نبینیم

یعنی اس نے کہا ہمارے حالات چمکنے والی بجلی کی طرح ہیں جو کبھی دکھائی دیتی ہے اور کبھی چھپ جاتی ہے ۔ کبھی ہم آسمان کی بلندیوں پر بیٹھتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے پیچھے بھی دکھائی نہیں دیتا ۔  
”جہان“ یہاں ”جہندہ“ یعنی چمکنے والی کے معنی میں ہے اور ”برق جہان“ کا معنی ہے چمکنے والی آسمانی بجلی ۔ اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے تعجب کا مقام نہیں کہ ایک دن مشیت الہی کی بناء پر یعقوب (علیہ السلام) کی آزمائش کے لئے وہ اپنے قریب رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ نہ ہوں اور کسی دوسرے دن جب کہ دور آزمائش ختم ہو چکا تھا اور مشکلات کے دن بیت چکے تھے انہوں نے مصر سے قمیص یوسف (علیہ السلام) کی مہک سونگھ لی ہو۔

۳۔ بینائی کیسے لوٹ آئی ؟

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی آنکھوں کا نور بالکل ضائع ہو نہیہو گیا تھا بلکہ ان کی آنکھیں کمزور ہو گئیں تھی اور بیٹھے کی ملاقات کے امکانات پیدا ہوئے تو ان میں ایک ایسا ہیجان پیدا ہوا کہ وہ پہلی حالت پر واپس آگئیں لیکن آیات کا ظہور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بالکل نابینا ہو گئے تھے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں لہذا ان کی بینائی معجزانہ طور پر واپس آئی ۔ قرآن کہتا ہے :

فارتد بصيراً  
بینائی کی طرف لوٹ آیا ۔

۴۔ استغفار کا وعدہ :

مندرجہ بالا آیات میں ہے کہ بھائیوں کے اظہارِ ندامت پر حضرت یوسف (علیہ السلام) نے کہا :

یغفر الله لكم

خدا تمہیں بخش دے گا ۔

لیکن انہوں نے حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے سامنے اعتراف گناہ اور اظہارِ ندامت کیا اور استغفار کا تضایا کیا تو انہوں نے کہا: میں بعد میں تمہارے لئے استغفار کروں گا ۔

جیسا کہ روایات میں آیا ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس تقاضا پر شبِ جمعہ وقت سحر عمل کریں جو کہ اجابتِ دعا اور توبہ کی قبولیت کے لئے مناسب وقت ہے 5

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے انہیں کس طرح قطعی جواب دیا جب کہ ان کے باپ نے آئندہ پر چھوڑ دیا ؟۔

ہو سکتا ہے یہ فرق اس بناء پر ہو کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) بخشش کے امکان کے بارے میں بات کر رہے ہوں یعنی یہ گناہ قابلِ بخشش ہے لیکن حضرت یعقوب (علیہ السلام) اس کی فعلیت کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں یعنی کیا کیا جائے کہ جس سے بخشش ہو جائے ( غو کیجئے گا ) ۔

۵۔ توسل جائز ہے :

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے استغفار کا تقاضا کرنا نہ صرف یہ کہ عقیدہ توحید کے منافی نہیں ہے بلکہ لطف الہی کے حصول کا ذریعہ ہے ورنہ کیسے ممکن تھا کہ یعقوب (علیہ السلام) کہ جو نبی تھے بیٹوں کا یہ تقاضا

قبول کرتے کہ ان کے لئے استغفار کی جائے اور کیسے ممکن تھا کہ ان کے توسل کا مثبت جواب دیتے۔  
یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ اولیاء اللہ سے توسل اجمالاً ایک جائز امر ہے اور جو اسے ممنوع اور اور اصل توحید کے خلاف سمجھتے ہیں وہ متون قرآن سے آگاہی نہیں رکھتے یا پھر غلط تعصبات نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

۶۔ سیاہ رات چھٹ گئی:

مندربالا آیات ہمیں یہ عظیم درس دیتی ہیں کہ مشکلات و حوادث جتنے بھی سخت اور دردناک ہوں اور ظاہری اسباب و علل جتنے بھی محدود اور نارسا ہوں اور کامیابی و کشائش میں کتنی ہی تاخیر ہو جائے ان میں سے کوئی چیز بی لطف پر وردگار پر امید رکھنے سے مانع نہیں ہوسکتی۔ ہاں یہ وہی خدا ہے جو نابینا آنکھ کو پیراہن کے ذریعے روشن کردیتا ہے اور پیراہن کو خوشبودار کے فاصلے سے دیگر علاقوں کی طرف منتقل کردیتا ہے اور گمشدہ عزیز اور محبوب کو سالہا سال بعد لوٹا دیتا ہے اور جدائی سے مجروح و لوں پر مرہم رکھتا ہے اور جانکاه تکالیف کو شفا بخشتا ہے۔

جی ہاں اس سر گزشت میں توحید اور خدا شناسی کا یہ عظیم درس ہے کہ کوئی چیز بھی خدا کے ارادے کے سامنے پیچیدہ نہیں ہے۔

#### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ یوسف / 99 تا 101

۹۹۔ فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَوَى إِلَيْهِ أَبُوهُمْ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ -  
۱۰۰۔ وَرَفَعَ أَبُوهُمْ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا أَبَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلْنَا رَبِّي خَفًّا وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَعَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ.  
۱۰۱۔ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَالْحَقِّي بِالصَّالِحِينَ.

ترجمہ

۹۹۔ جس وقت یوسف کے پاس پہنچے تو وہ اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے اور کہا : سب کے سب مصر میں داخل ہو جاؤ ، انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے

۱۰۰۔ اور ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب کے سب ان کے لئے سجدے میں گئے اور اس نے کہا: ابا جان : یہ اس خواب کی تعبیر ہے کہ جو پہلے میں نے دیکھا تھا، خدا نے اسے حقیقت میں بدل دیا اور اس نے مجھ سے نیکی کی جب مجھے زندان سے نکالا اور آپ کو اس بیابان سے (یہاں) لے آیا اور جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان خرابی پیدا کرچکا تھا ، اور میرا پر وردگار جسے چاہتا ہے ( اور مناسب دیکھتا ہے ) اس کے لئے صاحب لطف ہے کیونکہ وہ دانا اور حکیم ہے۔

۱۰۱۔ پروردگار! تونے مجھے حکومت کا ( عظیم ) حصہ بخشا ہے اور تونے مجھے خوابوں کا تعبیر کا علم دیا ہے تو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور تو دنیا و آخرت میں میرا سر پرست ہے ، مجھے مسلمان مارنا اور صالحین کے ساتھ ملحق فرمانا۔

۱۔ ”تفندون“ ”فند“ (بروزن ”نمد“) کے مادہ سے ، فکر کی کمزوری اور حماقت کے معنی میں ہے۔ اسے ”جھوٹ“ کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ فساد اور خرابی کے معنی میں ہے۔ لہذا ”لولان تفندو“ کا معنی ہے : اگر تم مجھے بے وقوف اور فاسد العقل نہ کہو۔

- 2- اصول کافی جلد ۲ ص ۱۳۳۔  
 3- ان روایات کے بارے میں مزید آگاہی کے لئے نور الثقلین کی دوسری جلد ص ۴۶۴ کی طرف رجوع کریں۔  
 4- شرح نہج البلاغہ از خونی جلد ۵ ص ۲۰۰۔  
 5- تفسیر قرطبی میں ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ شب جمعہ کو جو روز عاشور کے برابر تھی، ان کے لئے اسفغان کریں (تفسیر قرطبی - جلد ۶ ص ۳۴۹۱)

تفسیر

یوسف (علیہ السلام)، یعقوب (علیہ السلام) اور بھائیوں کی سرگزشت کا اختتام عظیم ترین بشارت لئے ہوئے مصر سے فافلہ کنعان پہنچا۔ بوڑھے یعقوب بیٹا ہو گئے۔ عجیب جو ش و خروش تھا۔ سالہا سال سے جو گھرانہ غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا وہ خوشی اور سرور میں ڈوب گیا۔ ان سب نعمات الہی پر وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔ یوسف (علیہ السلام) فرمائش کے مطابق اس خاندان کو اب مصر کی طرف روانہ ہونا تھا۔ سفر کی تیاری پر لحاظ سے مکمل ہو گئی یعقوب (علیہ السلام) ایک مرکب پر سوار ہوئے جب کہ ان کے مبارک لبوں پر ذکر و شکر خدا جاری تھا اور عشق وصال نے انہیں اس طرح قوت و توانائی بخشی کہ وہ گویا وہ نئے سے جواب ہو گئے تھے۔ بھائیوں کے گزشتہ سفر تو خوف و پریشانی سے گزرے لیکن ان کے بر خلاف یہی سفر ہر قسم کے فکر و اندیشہ سے خالی تھا۔ یہاں تک کہ سفر کی

کوئی تکلیف تھی بھی تو اس انتظار میں پنہاں مقصد کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

وصال کعبہ چنان می دو اندام بشتاب کہ خار ہای مگیلاں می آید

کعبہ مقصود کے وصال نے مجھے اتنا دوڑا یا کہ خار مگیلاں ریشم معلوم ہوتے تھے۔

رات و دن گویا بڑی آہستگی سے گزر رہے تھے کیونکہ اشتیاق وصال میں ہر گھڑی ایک دن بلکہ ایک سال معلوم ہو رہی تھی مگر جو کچھ تھا آخر گزر گیا۔ مصر کی آبادیاں دور سے نمایاں ہوئیں، مصر کے سر سبز کھیت، آسمان سے باتیں

کرنے والے درخت اور خوبصورت عمارتیں دکاھنی دینے لگیں۔

لیکن.. قرآن اپنی دائمی سیرت کے مطابق ان سب مقدمات کو جو تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتے ہیں حذف کرتے ہوئے کہتا ہے: جب وہ یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف اپنے ماں باپ سے بغل گیر ہوئے (فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ أَوَىٰ إِلَيْهِ أَبُوهُ)۔

”اوی“ جیسا کہ راغب نے کہا ہے اصل میں کسی چیز کو دوسری چیز سے منضم کرنے کے معنی میں ہے یوسف (علیہ السلام) کا اپنے تئیں ماں باپ سے منضم کرنا، ان سے بغل گیر ہونے کے لئے کنایہ ہے۔

آخر کار یعقوب (علیہ السلام) کی زندگی کا شیرین ترین لمحہ آگیا۔ دیدار وصال کا یہ لمحہ فراق کے کئی سالوں بعد آیا تھا۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وصال کے یہ لمحات یعقوب (علیہ السلام) اور یوسف (علیہ السلام) پر کیسے گزرے، ان شیرین لمحات میں ان دونوں کے احساسات و جذبات کیا تھے، عالم شوق میں انہوں نے کتنے آنسو بہائے اور عالم عشق میں کیا نالہ ہوا۔

پھر یوسف (علیہ السلام) نے ”سب سے کہا: سر زمین، مصر میں قدم رکھیں کہ انشاء اللہ یہاں آپ بالکل امن و امان میں ہوں گے“ کیونکہ مصر یوسف (علیہ السلام) کی حکومت میں امن و امان کا گہوارہ بن چکا تھا (وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) اپنے ماں باپ کے استقبال کے لئے شہر کے دروازے کے باہر تک آئے تھے اور اور شاید جملہ ”دخلو علی یوسف“ کہ جو دروازے سے باہر سے مربوط ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے حکم دیا تھا کہ وہاں خیمے نصب کئے جائیں اور ماں باپ اور بھائیوں کی پہلے پہل وہاں پذیرائی کی جائے۔ جب وہ بارگاہ یوسف (علیہ السلام) میں پہنچے ”تو اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا“ (وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ)۔ نعمت الہی کی اس عظمت اور پروردگار کے لطف کی اس گہرائی اور وسعت نے بھائیوں اور ماں باپ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ”سب کے سب اس کے سامنے سجدے میں گر گئے“ (وَحَرُّوا لَهُ سُجَّدًا)۔

اس موقع پر یوسف (علیہ السلام) نے باپ کی طرف رخ کیا ”اور اعتراض کیا: اباجان! یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا“ (وَقَالَ يَا أَبَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ)۔ کیا ایسا ہی نہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ سورج، چاند اور گایرہ ستارے میرے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ دیکھئے! جیسا کہ آپ نے پیش گوئی کی تھی ”خدا نے اس خواب کو واقعیت میں بدل دیا ہے“ (فَدَّ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا)۔ اور پروردگار نے مجھ پر لطف و احسان کیا ہے کہ اس نے مجھے

زنداد سے نکالا ہے“ ( وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ ) -  
یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنی زندگی کی مشکلات میں صرف زندان مصر کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن میرے بھائیوں کی وجہ سے کنعان کے کنوئیں کی بات نہیں کی۔  
اس کے بعد مزید کہا : خدا نے مجھ پر کس قدر لطف کیا کہ آپ کو کنعان کے اس بیابان سے یہاں لے آیا جب کہ شیطان میرے اور میرے بھائی کے درمیان فساد انگیزی کر چکا تھا (وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي) -  
یہاں یوسف (علیہ السلام) ایک مرتبہ اپنی وسعت قلبی اور عظمت کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ کوتاہی کس شکس نے کی صرف سر بستہ اور راجمالی طور پر کہتے ہیں کہ شیطان نے اس کام میں دخل اندازی کی اور وہ فساد کا باعث بنا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کا گزشتہ خطاؤں کا گلہ کریں۔  
سر زمین کنعان کو ”بدو“ یعنی ”بیابان“ کہنا بھی جاذب نظر ہے۔ اس طرح سے مصر اور کنعان کا تمدنی فرق واضح کیا گیا ہے۔

آخر میں یوسف (علیہ السلام) کہتے ہیں : یہ سب نعمات و عنایات خدا کی طرف سے ہیں کیونکہ میرا پروردگار مرکزِ لطف و کرم ہے اور جس امر میں چاہتا ہے لطف کرتا ہے ، وہ بندوں کے کاموں کی تدبیر کرتا ہے اور ان مشکلات کو آسان کرتا ہے (إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ) -

وہ جانتا ہے کہ کون حاجت مند ہیں اور کون اہل ہیں کیونکہ ”وہ علیم و حکیم ہے“ (إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ) -  
اس کے بعد یوسف (علیہ السلام) حقیقی مالک الملک اور دائمی ولی۔ نعمت کی طرف رخ کرتے ہیں اور شکر اور تقاضے کے طور پر کہتے ہیں :

”پروردگار! تونے ایک وسیع حکومت کا ایک حصہ مجھے مرحمت فرمایا ہے“ ( رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ ) - ” اور تونے مجھے تعبیر خواب کے علم کی تعلیم دی ہے“ ( وَ عَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ )۔ اور اسی علم نے جو ظاہراً سادہ اور عام ہے میری زندگی اور تیرے بندوں کی ایک بڑی جماعت کی زندگی میں کس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا ہے اور یہ علم کس قدر پر برکت ہے۔

” تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ایجاد کیا ہے“ ( فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ )۔ اور اسی بناء پر تمام چیزیں تیری قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ ” پروردگار! دنیا و آخرت میں تو میرا ولی ، ناصر ، مدبر اور محافظ ہے“ (أَنْتَ وَلِيٌّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)۔ ”مجھے اس جہان سے مسلمان اور اپنے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے لے جا“ (تَوْفَّقَنِي مُسْلِمًا)۔ اور مجھے صالحین سے ملحق کر دے“ (وَأَجْعَلْنِي بِالصَّالِحِينَ)۔  
یعنی میں تجھ سے ملک کے دوام اور اپنی مادی حکومت اور زندگی کی بقاء کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ تو سب فانی ہیں اور صرف دیکھنے میں دل انگیز ہیں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری عاقبت اور انجام کار بخیر ہو اور میں راہ ایمان و تسلیم کے ساتھ رہوں اور تیرے لئے جان دوں اور صالحین اور تیرے باخلوں دوستوں کی صف میں قرار پاؤں ، میرے لئے یہ چیزیں اہم ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا غیر خدا کے لئے سجدہ جائز ہے؟

جیسا کہ ہم پہلی جلد ( جلد اول ص ۱۶۱ ) ( اردو ترجمہ ) میں فرشتوں کے آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ پرستش و عبادت کے معنی میں سجدہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی مذہب میں کسی شخص کے لئے پرستش جائز نہیں ہے اور تو حید عبادت جو مسئلہ توحید کا اہم حصہ ہے اور جس کی تمام پیغمبروں نے دعوت دی ہے ، کاپی مفہوم ہے۔

لہذا یوسف (علیہ السلام) کہ جو خدا کے پیغمبر تھے نہ وہ اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ انہیں سجدہ کیا جائے اور ان کی عبادت کیا جائے اور نہ ہی یعقوب (علیہ السلام) جیسے عظیم پیغمبر ایسا کام کرسکتے تھے اور نہ ہی قرآن اسے ایک اچھے یا کم از کم جائز و مباح کام کے طور پر یاد کرسکتا تھا۔

اس بناء پر مذکورہ سجدہ یا خدا کے لئے ”سجدہ شکر“ کے طور پر تھا۔ اسی خدا کے لئے سجدہ شکر جس نے یہ تمام عنایات و نعمات اور مقام عظیم یوسف (علیہ السلام) کو دیا تھا اور جس نے خاندان یعقوب (علیہ السلام) کی مشکلوں اور مصیبتوں کو دور کیا تھا۔ اس صورت میں اگر چہ سجدہ خدا کے لئے تھا لیکن چونکہ یوسف (علیہ السلام) کو عطا کی گئی نعمت کی عظمت کے لئے تھا خود یوسف (علیہ السلام) کا احترام بھی اس سے ظاہر ہوتا تھا اور اس لحاظ سے ”لہ“ کی ضمیر جو مسلماً یوسف (علیہ السلام) کی طرف لوٹتی ہے اس معنی کے ساتھ پوری طرح مناسب ہو گی۔

یا یہ کہ یہاں ”سجدہ“ کا وسیع مفہوم مراد ہے یعنی خضوع اور انکساری ، کیونکہ سجدہ ہمیشہ اپنے مشہور معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ہر قسم کی انکساری اور تواضع کے معنی میں بھی استعمال ہوجاتا ہے لہذا بعض مفسرین نے کہا کہ اس زمانے میں خم ہ وکر انکساری اور تواضع کا اظہار کرتے تھے اور تعظیم و احترام بجالانے کا یہ طریقہ رائج تھا۔ ان مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیت میں ”سجداً“ سے مراد یہی ہے ۔

لیکن ”خروا“ کا مفہوم ہے ”زمین پر گر پڑنا“۔ اس لفظ کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سجدہ خم ہونے اور سر نیچا کرنے کے معنی میں نہیں تھا ۔

بعض دیگر عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) ، بھائیوں اور ان کی والدہ کا سجدہ خدا کے لئے تھا لیکن یوسف (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی طرح ان کے قبلہ تھے اسی لئے عربوں کی تعبیرات میں بعض اوقات کہا جاتا ہے :  
فلان صلی للقبلہ

یعنی فلاں شخص نے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ۔ ۱

البتہ پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے بالخصوص جب کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس سلسلے میں متعدد روایات بھی موجود ہیں ۔ فرمایا:

کان سجودہم للہ

یعنی ..کا سجدہ خدا کے لئے تھا ۔

یہ بھی الفاظ ہیں :

کان سجودہم عبادہ للہ

ان کا سجدہ اللہ کی عبادت کے طور تھا ۔ ۲

نیز کچھ اور احادیث میں ہے :

کان طاعة للہ و تحیة لیوسف

یہ سجدہ اللہ کی اطاعت کے عنوان سے اور یوسف (علیہ السلام) کے احترام کے لئے تھا ۔ ۳

جیسا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے واقعہ میں بھی سجدہ اس خدائے بزرگ و برتر کے لئے تھا کہ جس نے ایسی بدیع اور عجیب و غریب مخلوق پیدا کی تھی ۔ وہ سجدہ عبادتِ خدا کے ساتھ ساتھ حضرت آدم (علیہ السلام) کے احترام اور عظمت مقام کی دلیل بھی تھا ۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک شخص کوئی بہت ہی اچھا اہم کام انجام دیتا ہے اور ہم اس کام کی بناء پر خدا کے لئے سجدہ کریں کہ جس نے ایسا بندہ پیدا یا ہے تو یہ سجدہ خدا کے لئے بھی ہے اور اس شخص کے احترام کے لئے بھی ۔

۲۔ شیطانی وسوسے :

” نزع الشیطان بینی و بین اخوتی “ میں لفظ ” نزع“ کسی کام میں فساد و افساد کے ارادے سے داخل ہونے کے معنی میں ہے ۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایسے معاملات میں شیطانی وسوسے ہمیشہ بہت اثر رکھتے ہیں ۔ لیکن ہم اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں صرف اس قسم کے وسوسوں سے کچھ بھی نہیں ہوسکتا ۔ اٹل فیصلہ اور آخری مصمم ارادہ خود انسان کو کرنا ہوتا ہے بلکہ وہی اپنے دل کا دریچہ شیطان کے لئے کھولتا ہے اور اسے اندر داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے لہذا مندرجہ بالا آیت سے اختیار و ارادہ کی آزادی کے برخلاف کوئی مفہوم نہیں نکلتا ۔

البتہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اپنی عظمت و بزرگواری ، وسعت ، ظرف اور کشادہ دلی کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ بھائیوں کو اس معاملے میں زیادہ شرمندہ کریں کہ جو خود ہی بہت شرمندہ تھے ۔ اس لئے آخری ارادہ کرنے والے کی طرف اشارہ نہیں کیا اور صرف شیطانی وسوسوں کا ذکر کیا ہے جو دوسرے درجے کے عامل ہیں ۔

۳۔ امن و امان خدا کی عظیم نعمت :

حضرت یوسف (علیہ السلام) نے مصر کی تمام تر نعمات میں سے امن و امان کا ذکر کیا ہے اور ماں باپ اور بھائیوں سے کہا کہ مصر میں داخل ہوجاؤ انشاء اللہ امن و امان میں رہو گے ۔ یہ امر نشانہ دہی کرتا ہے کہ امن و امان کی نعمت تمام نعمتوں کی جڑ ہے اور حقیقت میں ایسا ہی ہے کیونکہ جب امن و امان ختم ہو جائے تو تمام رفاہی امور اور رمادی و روحانی نعمتیں مظرے میں پڑ جاتی ہیں ۔ بے امنی کے ماحول میں نہ اطاعتِ خدا مقدور میں رہتی ہے اور نہ زندگی میں سر بلندی اور آسودگی فکر باقی رہتی ہے اور نہ ہی سعی و کوشش اور اجتماعی مقاصد کی پیش رفت کے لئے جہاد ہوسکتا ہے ۔ ہوسکتا ہے یہ جملہ ضمناً اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ یوسف (علیہ السلام) چاہتے ہیں کہ یہ بتائیں کہ مصر میری

حکومت و سلطنت میں کل کے فراعنہ کی سی سر زمین نہیں ہے۔ وہ خود غرضیاں، خود پرستیاں، مظالم، لوٹ مار، گھٹن اور شکنجے سب کے سب ختم ہو گئے ہیں۔ ایک مکمل امن و امان کا ماحول ہے۔

۴. مقام علم کی اہمیت: حضرت یوسف (علیہ السلام) آخر میں ایک مرتبہ پھر علم تعبیر خواب کا ذکر کرتے ہیں اور اس عظیم اور بغر نزاع کے حکومت کی بنیاد اس ظاہراً آسان اور سادہ علم کو قرار دیتے ہیں۔ یہ امر دراصل علم و دانش کی اہمیت و تاثیر پر زیادہ سے زیادہ تاکید کرنے کے لئے ہے۔ چاہے وہ علم سادہ اور عام قسم کا ہی کیوں نہ ہو.. لہذا کہتے ہیں:

رب قد آتیتنی من الملک و علمتی من تأویل الاحادیث

۵. اختتام خیر:

ہو سکتا ہے انسان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن مسلم ہے کہ اس کی زندگی کے آخری لمحات اس کی ساری زندگی اور سر نوشت سے زیادہ اصلاحی اور تعمیری ہیں کیونکہ عمر کا دفتر ان کے ساتھ بند ہو جاتا ہے اور آخری فیصلہ زندگی کے انہیں آخری صفحات وابستہ ہے۔ اسی لئے صاحب ایمان اور سمجھدار لوگ ہمیشہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمر کے یہ لحظے نورانی اور درخشاں ہوں۔ یوسف (علیہ السلام) بھی اس مقام پر خدا سے یہی چاہتے ہیں اور کہتے ہیں:

توفنی مسلماً و الحقنی بالصالحین

مجھے دنیا سے ایمان کے ساتھ لے جا اور میرا شمار صالحین کے زمرے میں کر۔  
یہ گفتگو خدا سے موت کا تقاضا کرنے کے لئے نہیں جیسا کہ ابن عباس نے گمان کیا ہے اور کہا ہے:  
یوسف (علیہ السلام) کے سوا کسی پیغمبر نے خدا سے موت کا تقاضا نہیں کیا۔ ان کے پاس اپنی حکومت کے تمام اسباب و وسائل موجود تھے لیکن ان کی روح میں عشقِ الہی کا شعلہ بھڑک اٹھا اور انہوں نے لقاۃ الہی کی آرزو کی۔  
لیکن.. یوسف (علیہ السلام) کا تقاضا شرط اور حالت کا تقاضا تھا یعنی انہوں نے یہ تقاضا کیا تھا کہ موت کے وقت وہ ایمان و اسلام کے حامل ہوں جیسا کہ ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) نے بھی اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی۔  
فلا تموتن الا و انتم مسلمون  
میرے بچو! کوشش کرو کہ دنیا سے جاتے وقت باایمان اور فرمانِ خدا کے سامنے سر تسلیم خد اکنے ہوئے ہو (بقرہ - ۱۳۲)

بہت سے مفسرین نے بی یہی معنی انتخاب کیا ہے۔

۶. کیا یوسف (علیہ السلام) کی والدہ مصر آئی تھیں؟

مندرجہ بالا آیات کے ظاہری معنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی والدہ اس وقت زندہ و سلامت تھیں اور وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کے ساتھ مصر آئی تھیں اور اس نعمت کے شکرانے کے طور پر انہوں نے بھی سجدہ کیا تھا لیکن بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ ان کی والدہ ”راحیل“ فوت ہو چکی تھیں اور یہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی خالہ تھیں جو مصر آئی تھیں اور وہ ماں کی جگہ شمار ہوتی تھیں موجودہ تورات کے سفر تکوین کی فصل ۳۵ اور جملہ ۱۸ میں ہے:

بنیامین کے پیدا ہونے کے بعد راحیل فوت ہو گئیں۔

بعض روایات جو وہب بن منیہ سے اور کعب الاحبار سے نقل ہوئی ہیں ان میں بھی یہی بات مذکور ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انہوں نے یہ بات تورات سے لی ہے۔

بہر حال ہم قرآن کے ظاہری مفہوم سے بغیر کسی یقینی مدرک کے آنکھیں بند کر کے اس کی توجیہ و تاویل نہیں کر سکتے اور ظاہر قرآن یہی ہے کہ اس وقت یوسف (علیہ السلام) کی ماں زندہ تھیں۔

۷. باپ کو سر گزشت نہ سنانا:

امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

جس وقت یعقوب (علیہ السلام) یوسف سے ملاقات کے لئے پہنچے تو ان سے کہا: میرے بیٹے دل چاہتا ہے کہ میں پوری تفصیل جانوں کہ بھائیوں نے تم سے کیا سلوک کیا۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) نے باپ سے تقاضا کیا کہ وہ اس معاملے کو جانے دیں لیکن یعقوب (علیہ السلام) نے انہیں

قسم دے کہا کہ بیان کریں -  
یوسف (علیہ السلام) نے واقعات کا کچھ حصہ بیان کیا ، یہاں تک کہ بتا یا: بھائیوں نے مجھے پکڑ لیا اور کنویں میں بٹھا یا -  
مجھے حکم دیا کہ کرتا اتار دوں تو میں نے ان سے کہا : میں تمہیں اپنے باپ (علیہ السلام) یعقوب (علیہ السلام) کے احترام  
کی قسم دیتا ہوں کہ میرے بدن سے کرتا نہ اتارو اور مجھے برہنہ نہ کرو - ان میں سے ایک پاس چھری تھی اس نے وہ  
چھری نکال اور چلا کر کہا : کرتا اتارو۔  
یہ جملہ سنتے ہی یعقوب (علیہ السلام) کی طاقت جواب دے گئی ، انہوں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے - جب ہوش میں  
آئے تو بیٹے سے چاہا کہ اپنی بات جاری رکھے لیکن یوسف (علیہ السلام) نے کہا : آپ (علیہ السلام) کو ابراہیم ، (علیہ  
السلام) اسماعیل اور اسحاق (علیہ السلام) کے خدا کی قسم مجھے اس کام سے معاف رکھیں -  
جب یعقوب (علیہ السلام) نے یہ سنا تو اس معاملے سے صرف نظر کر لیا۔  
یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) ہر گز نہیں چاہتے تھے کہ ماضی کے تلخ واقعات اپنے دل میں لائیں یا باپ  
کے سامنے انہیں دھرائیں اگرچہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی جستجو کی حسّ انہیں مجبور کرتی تھی -

#### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ یوسف / 102 تا 107

- ۱۰۲۔ ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ -  
۱۰۳۔ وَمَا أَكْثَرَ النَّاسَ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ -  
۱۰۴۔ وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ -  
۱۰۵۔ وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ -  
۱۰۶۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ -  
۱۰۷۔ أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ -

ترجمہ

- ۱۰۲۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کہ جس کی ہم تجھے وحی کرتے ہیں تو (ہر گز) ان کے پاس نہیں تھا جب انہوں  
نے مضمم ارادہ کیا اور جب منصوبہ بنا رہے تھے -  
۱۰۳۔ اور اگرچہ تو اصرار کرے تو زیادہ تر لوگ ایمان نہیں لائیں گے -  
۱۰۴۔ اور تو اس پر (ہر گز) ان سے اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا، یہ نہیں ہے مگر یہ کہ عالمین کے لئے یاد دہانی۔  
۱۰۵۔ اور (خدا کی) بہت سے نشانیاں آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں کہ وہ جن کے پاس سے گزرتے ہیں اور ان سے  
منہ پھیر لیتے ہیں -  
۱۰۶۔ اور ان میں کہ جو خدا پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اکثر مشرک ہیں -  
۱۰۷۔ کیا وہ اس سے مامون ہیں کہ خدا کی طرف سے گھبر نے والا عذاب ان پر آجائے یا قیامت کی گھڑی اچانک ان پر  
آجائے جب کہ وہ متوجہ نہ ہوں -

- 1-تفسیر المیزان و تفسیر فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں -  
2-تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۶۷۔  
3-تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۶۸۔  
4 مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۶۵۔

یہ دعویٰ عام طور پر مشرک ہیں

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ تمام ہوا۔ اس میں عبرت اور اصلاح کے بہت سے درس موجود ہیں۔ اس میں گرانہیا قیمتی اور ثمر بخش نکات موجود ہیں اور یہ تاریخی واقعہ ہر قسم کی فضولیات اور خرافات سے پاک کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ اب قرآن روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں (ذَلِكِ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ)۔

تو ہرگز ان کے پاس نہیں تھا جبکہ وہ مصمم ارادہ کر رہے تھے اور منصوبہ بنا رہے تھے (وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ)۔ ان باریکیوں اور تفصیلات کو صرف خدا جانتا ہے یا وہ شخص جو اس موقع پر موجود تھا اور چونکہ تو وہاں موجود نہیں تھا لہذا صرف وحی الہی ہے جو ایسی خبریں تجھ تک پہنچ جاتی ہیں۔

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ اگرچہ تورات میں آیا ہے اور قاعدتاً حجاز والے اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتے تھے پھر بھی پوری تفصیلات کے ساتھ تمام واقعہ حتیٰ کہ جو کچھ خصوصی مجالس میں ہوا تھا لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ جس میں کوئی اضافہ نہ کیا گیا ہو اور خرافات شامل نہ کی گئی ہوں۔ ان حالات میں لوگوں کو چاہیے کہ ان سب نشانیوں کو دیکھنے کے بعد اور ان خدائی نصیحتوں کو سننے کے بعد ایمان لے آئیں اور غلط راستے سے پلٹ جائیں مگر اے پیغمبر! اگرچہ تو اس پر اصرار کرے کہ یہ ایمان لے آئیں ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے (وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ)۔

لفظ ”حرص“ لوگوں کے ایمان لانے کے لئے پیغمبر کے شدید لگاؤ اور شوق کی دلیل ہے لیکن صرف آپ (علیہ السلام) کا شوق اور حرص کافی نہ تھا۔ زمینوں اور طرفوں کی قابلیت بھی شرط نہ تھی۔

یعقوب (علیہ السلام) کے بیٹے کہ جو وحی و نبوت کے ماحول میں پلے بڑھے تھے جب وہ ہوا و بوس میں گرفتار ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اپنے بھائی کو نابود کرنے پر تل سکتے ہیں تو پھر دوسروں سے کیا توقع کیا جاسکتی ہے کہ وہ ہوا و بوس کے دیوار شہوت بھوٹ پر غالب آجائیں اور سب کے سب ایک ہی دفعہ پوری طرح خدا کی طرف رخ کریں۔

یہ جملہ ضمنی طور پر پیغمبر کی ایک طرح سے تسلی اور دلجوئی کے لئے ہے کہ وہ لوگوں کے کفر و گناہ پر اصرار سے ہرگز مایوس نہ ہو جائیں اور اس راہ میں ہم سفروں کی کمی سے ملول خاطر نہ ہوں، جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات میں بھی ہے مثلاً:

فلعلک باخع نفسك علىٰ اثارهم ان لم يؤمنوا بهذا الحديث اسفاً

اے پیغمبر! گویا تو چاہتا ہے کہ قرآن ان کے ایمان نہ لانے پر شدت تاسف سے اپنی جان گنوا بیٹھے (کہف۔ ۶)

قرآن مزید کہتا ہے کہ دراصل تیری دعوت کو قبول نہ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی عذر و بہانہ نہیں ہے کیونکہ علاوہ اس کے کہ اس میں حق کی نشانیاں واضح ہیں ”تو نے اس کے بدلے ان سے ہرگز کوئی اجر مزدوری نہیں چاہی“ کہ جسے وہ مخالفت کا بہانہ بنا سکیں (وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ)۔

”یہ ایک عمومی دعوت ہے اور سب جہانوں کے لئے اور عالمین کے لئے ایک دھانی ہے“ اور یہ عام و خاص تمام انسانوں کے لئے بچھا یا گیا ایک دسترخوان ہے (إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ)۔

وہ دراصل اس لئے گمراہ ہوئے کہ ان کے پاس کھلی اور بینا آنکھ اور سننے والے کان نہیں ہیں ”آسمان و زمین میں بہت سے خدائی آیات ہیں کہ وہ جن کے قریب سے گزر جاتے ہیں اور ان سے منہ پھیر لیتے ہیں“ (وَكَايُنُّ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ)۔

یہی حوادث کہ جنہیں ہر روز وہ اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ صبح کے وقت آفتاب افق مشرق سے سر نکالتا ہے۔ اس کی سنہری کرنیں پہاڑوں دروں، صحراؤں اور دریاؤں پر پڑتی ہیں اور شام کے وقت افق مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور رات کی گہری سیاہ چادر ہر جگہ کو ڈھانپ دیتی ہے۔

عجیب و غریب نظام کے یہ اسرار، یہ طلوع و غروب، سبزو، پرندوں، حشرات اور انسانوں میں زندگی کا یہ شور و غوغا، یہ ندیوں زمزمہ، نسیم سحری کا یہ ہمہمہ اور یہ سب عجیب و دلنشین نقش و وجود کے درو دیوار پر ہیں۔ اس قدر آشکار ہیں کہ جو کوئی ان میں اور ان کے خالق میں غور و فکر نہ کرے وہ ایسے ہی ہے جیسے دیوار پر کوئی نشان تھا۔ بہت چھوٹے چھوٹے امر ہیں جو ظاہراً کوئی اہمیت نہیں رکھتے، جن کے قریب سے ہم بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں لیکن اچانک گہرائی تک پہنچنے والا ماہر پیدا ہوتا ہے جو کئی ماہ اور سالوں کے مطالعہ کے بعد عجیب و غریب اسرار معلوم کرتا ہے کہ جن سے دنیا کے منہ مارے تعجب کے کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔

اصولی طور پر اہم بات یہ ہے کہ ہم جانیں کہ اس عالم ک وئی چیز معمولی اور بے اہمیت نہیں ہے کیونکہ ہر چیز خدا کی

مصنوع و مخلوق ہے۔ وہ خدا کہ جس کا علم لامتناہی اور جس کی حکمت بے پایاں ہے۔ بے وقعت وہ لوگ ہیں جو اس عالم کو بے اہمیت اور سرسری سی چیز سمجھتے ہیں۔ لہذا اگر وہ ان آیاتِ قرآنی پر کہ جو تجھ پر نازل ہوئی ہیں ایمان نہیں لاتے تو اس پر تعجب نہ کر کیونکہ وہ آیاتِ خلقت پر بھی ایمان نہیں لائے کہ جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: وہ جو ایمان لے آتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کا ایمان خالص نہیں ہے بلکہ اس میں شرک کی آمیزش ہے ( وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِإِلَهِهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ) جو سکتا ہے وہ خود سمجھتے ہوں کہ وہ خالص مومن ہیں لیکن شرک کی رنگیں عموماً ان کے

افکار، گفتار اور کردار میں موجود ہوتی ہیں۔

ایمان صرف یہ نہیں کہ انسان صرف وجود خدا کا اعتقاد رکھتا ہو بلکہ ایک خالص موحدوہ ہے جس کے قلب و جان میں خدا کے علاوہ کسی شکل میں کوئی معبود نہ ہو۔ اس کی گفتار خدا کے لئے، اس کے اعمال خدا کے لئے اور اس کا ہر کام اسی کے لئے انجام پائے۔

خدا کے قانون کے علاوہ کسی قانون کو قبول نہ کرے اور اسکے غیر کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالے اور خدا یہ فرامین ک و دل و جان سے قبول کرے چاہے وہ اس کے میلان کے مطابق ہوں یا نہ ہوں۔ خدا او ربوائے نفس کے انتخاب کے دورا بے پر ہمیشہ خدا کو مقدم شمار کرے۔ یہ بے ہر قسم کے شرک سے پاک ایمان۔ عقیدے کا شرک، گفتاگر اور عمل کا شرک، اگر ہم واقعاً ہر پہلو کے بارے میں باریک بینی سے کام لیں تو دیکھیں گے کہ سچے، خالص اور حقیقی موحد بہت کم ہیں۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں ہے کہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

الشرك اخفى من ديبب النمل

انسانی اعمال میں شرک چھوٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ ( سفینة البحار جلد ۱ ص ۱۶۹۷ )

یہ بھی روایت ہے:

ان اخوف ما اخاف عليكم الشرك الاصغر قالوا وما الشرك الاصغر يا رسول الله؟ قال الريا، يقول الله تعالى يوم القيامة اذا جاء الناس باعمالهم اذهبوا الي الذين كنتم تراءون في الدنيا، فانظروا هل تجدون عندهم من جزاء؟! رسول الله نے فرمایا:

خطر ناک ترین چیز کہ جس کا مجھے تم سے خوف ہے شرکِ اصغر ہے۔

اصحاب نے پوچھا:

یا رسول اللہ: شرکِ اصغر کیا ہے:

فرمایا:

ریا کاری، قیامت کے دن جب لوگ اپنے اعمال کے ساتھ بارگاہِ خد امینحاضر ہوں گے تو پروردگار انہیں کہ جو دنیا میں ریا کرتے تھے، فرمائے گا: ان کے پاس جاؤ کہ جن کے لئے تم ریا کرتے تھے اور دیکھو کہ ان کے ہاں سے تمہیں کوئی اجر ملتا ہے؟ 1

امام محمد باقر علیہ السلام سے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

شرک طاعة و ليس شرک عبادة المعاصی التي ترتکبون و هي شرک طاعة اطاعوا فيها الشيطان فاشركوا بالله في الطاعة لغيره اس آیت سے مراد اطاعت میں شرک کرنا ہے نہ کہ عبادت میں شرک کرنا اور جن گناہوں کے لوگ مرتکب ہوتے ہیں وہ شرک طاعت

ہے کیونکہ اس میں وہ شیطان کی اطاعت کرتے ہیں اور اس عمل کی بناء پر خدا کے لئے اطاعت میں شریک کے قائل

ہوتے ہیں۔ 2

بعض دوسری روایات میں ہے کہ مراد ”شرکِ نعمت“ ہے اس معنی میں کہ کوئی نعمت خدا کی طرف سے انسان کو پہنچے اور وہ کہے کہ یہ نعمت فلاں شخص کی طرف سے مجھے پہنچی ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو میں مرجاتا یا میری زندگی تباہ ہوجاتی اور میں بے چارہ رہ جاتا۔ (نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۷۶)۔

یہاں غیر خدا کو روزی اور نعمات بخشنے میں خدا کا شریک شمار کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت میں شرک سے مراد کفر، انکار خدا اور ظاہری طور پر بت پرستی کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ

امام علی بن موسیٰ رضا (علیہ السلام) سے نقل ہوا ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

شرک لا یبلغ بہ الکفر

ایسا شرک جو کفر کے درجے تک نہ پہنچے -

البتہ وسیع مفہوم کے لحاظ سے شرک میں یہ تمام امر شامل ہیں -

زیر بحث آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ایمان نہیں لائے ، جو خدا کی واضح آیات کے قریب سے بے خبر گزرتے ہیں اور جو اپنے اعمال میں مشرک ہیں خدا تعالیٰ انہیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے : کیا یہ لوگ اپنے آپ کو اس امر سے مامون سمجھتے ہیں کہ اچانک اور بغیر کسی تمہید کے انہیں عذاب الہی آگھیرے ، احاطہ کرنے والا ایسا عذاب کہ جو ان کے سب کو آگھیرے ( أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ ) . اور یا یہ کہ ناگہاں قیامت آپہنچے اور عظیم خدائی عدالت لگ جائے اور ان کا حساب کتاب شروع ہو جائے کہ جب وہ بے خبر اور غافل ہوں ( أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ) -

”غاشیہ“ ڈھانپنے والی چیز اور ڈھکنے کے معنی میں ہے - دیگر چیزوں کے علاوہ ہگوڑے کی زین پر ڈالنے جانے والے بڑے کپڑے کو بھی غاشیہ کہتے ہیں جو اسے ڈھانپ دیتا ہے - یہاں پر اس سے مراد وہ سزا ہے جو تمام بد کاروں کا گھیر لے گی - 3

”ساعة“ سے مراد قیامت ہے جیسا کہ بہت سی دوسری قرآنی آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے - البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ ”ساعة“ بولناک حوادث کے لئے کنایہ ہو کیونکہ قرآنی آیات بار بار کہتی ہیں کہ قیامت کے دن کا آغاز بہت ہی زیادہ بولناک حوادث کے ایک سلسلے سے ہوگا - مثلاً زلزلے ، طوفان اور بجلیاں یاموت کی گھڑی کی طرف اشارہ ہے - پہلو تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے -

سورہ یوسف / 108 تا 111

۱۰۸- قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ-

۱۰۹- وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رَجُلًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى أَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْأَجْرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ -

۱۱۰- حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ -

۱۱۱- لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ -

ترجمہ

۱۰۸- کہہ دو : یہ میرا راستہ ہے کہ میں اور میرے پروکار پوری بصیرت سے لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں - خدا منزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں -

۱۰۹- اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجا مگر شہر والوں میں سے ان مردوں کو کہ جن کی طرف ہم نے وحی کی ہے - کیا ( تیری دعوت کے مخالفین نے ) زمین میں سیر نہیں کی کہ وہ دیکھیں کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام ہوا اور آخرت کا گھر پر بیز گاروں کے لئے بہتر ہے کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے -

۱۱۰- ( انبیاء نے اپنی دعوت اور دشمنوں نے اپنی مخالفت اسی طرح جاری رکھی ) یہاں تک کہ پیغمبر مایوس ہو گئے اور انہوں نے گمان کیا کہ ( حتی مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی ) ان سے جھوٹ بولا تو اس موقع پر جاری مدد ان کے پاس آئی- ہم جس شخص کو چاہتے ہیں نجات دیتے ہیں اور زیاں کار قوم کے لئے ہماری سزا اور عذاب کو پلٹا یا نہیں جاسکتا -

۱۱۱- ان کی سرگزشتوں میں صاحبانِ فکر کے لئے درس عبرت ہے - یہ واقعات جھوٹی بات نہیں تھے بلکہ ( آسمانی وحی ہے اور ) گزشتہ آسمانی کتب ) سے ہم آہنگ ہیں جو اس کے سامنے ہیں اور ہر چیز ( کہ جو سعادت انسانی کی بنیاد ہے ) کی تشریح اور ہدایت و رحمت ہے ایسے گروہ کے لئے کہ جو ایمان لایا ہے -

.....

1- تفسیر فی ظلال جلد ۵ ص ۵۳.

2- نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۷۵ و اصول کافی جلد ۲ ص ۲۹۲.

3- ”غاشیہ“ یہاں اس لئے مونث ہے کہ یہ لفظ ”عقوبہ“ کی صفت ہے کہ جو مقدر ہے -

عبرت کے زندہ درس

زیر نظر پہلی آیت میں پیغمبر اسلام سے اپنے آئین ، دین ، روش اور خط کو مشخص کرنے کے لئے کہا گیا ہے ۔ فرمایا گیا ہے : کہہ دو : میری راہ اور طریقہ یہ ہے کہ سب کو اللہ کی طرف ( کہ جو ایک اکیلا خدا ہے ) دعوت دوں ( قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي اُدْعُو اِلَى اللّٰهِ ) ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : یہ سفر میں نے بے خبری یا تقلیداً اختیار نہیں کیا بلکہ میں خود او میرے پروکا ر دنیا کے سب لوگوں کو اس راستے کی طرف آگاہی اور بصیرت سے بلاتے ہیں ( عَلَيَّصِيْرَةٌ اَنَا وَمَنْ اَتَّبَعَنِي ) ۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم کا پیر و کار ہر مسلمان اپنے مقام پر حق کی طرف بلانے والا ہے اسے چاہیے کہ اپنی گفتار اور کردار سے دوسروں کو راہ خدا کی طرف دعوت دے ۔ نیز یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ ” رہبر کو کافی بصیرت ، بینائی اور آگاہی کا حامل ہونا چاہیے ورنہ اس کی دعوت حق کی طرف نہیں ہوگی ۔ اس کے بعد بطور تاکید کہا گیا ہے : خد یعنی وہ ذات جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں ۔ ہر قسم کے عیب ، نقص ، شبیہ اور شریک سے

پاک او رمزہ ہے ( و سبحان اللّٰہ ) ۔

مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے : ” میں مشرکین میں سے نہیں ہوں “ اور میں اس کے لئے کسی قسم کے شبیہ و شریک کا قائل نہیں ہوں ( وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ) ۔

واقعاً ایک سچے رہبر کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ صراحت سے اپنے پروگراموں اور اہداف کا اعلان کرے او روہ خود اور اس کے پیرو کار بھی ایک مشخص پروگرام کی پیروی کریں ۔ نہ یہ کہ اس کا ہدف ، روش اور طریقہ ابہام میں ہو یا یہ کہ ہر ایک الگ الگ راہ پر چل رہا ہو ۔ اصولی طور پر سچے رہبروں کو جھوٹے رہبروں سے جد پہچاننے کا یہی ایک راستہ ہے کہ یہ صراحت سے گفتگو کرتے ہیں اور ان کا راستہ واضح ہوتا ہے جب کہ جھوٹے کاموں کا چھپائے رکھتے ہیں اور ہمیشہ مبہم پہلو دار باتیں کرتے ہیں ۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) سے متعلق آیات کے بعد اس آیت کا انا اس طرف اشارہ ہے کہ میری راہ و رسم خد اکے عظیم پیغمبر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی راہ و رسم سے جدا نہیں ہے ۔ وہ بھی ہمیشہ یہاں تک کہ گوشہ زندان میں بیٹھ کر بھی خدائے واحدو قہار کی طرف دعوت دیتے تھے اور اس کے اغیار کو اسماء بے مسمیٰ شمار کرتے تھے کہ جو تقلیداً جاہلوں کے ایک گروہ سے دوسرے تک پہنچے تھے ۔ جی ہاں ! میری روش او تمام انبیاء کی روش یہی ہے ۔

گمراہ اور نادان قوموں کی طرف سے انبیاء پر ہمیشہ یہ اعتراض ہوتا تھا کہ وہ انسان کیوں ہیں ، یہ ذمہ داری فرشتے کے کندھے پر کیوں نہیں رکھی گئی ؟ طبعاً زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی پیغمبر اسلام پر ان کی عظیم دعوت کے جواب میں یہی اعتراض کرتے تھے لہذا قرآن مجید ایک مرتبہ پھر اعتراض کا جواب دیتا ہے : ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجے مگر یہ کہ وہ مرد تھے کہ جن کی طرف وحی نازل ہوتی تھی ، ایسے مرد کہ جو آباد شہروں اور عوامی مراکز سے اٹھتے تھے ( وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوحِي اِلَيْهِمْ مِنْ اٰهْلِ الْقُرٰى ) ۔

وہ بھی انہی شہروں اور آباد یوں میں دوسرے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے او رلوگوں سے میل جول رکھتے تھے ۔ ان کی مصیبتوں ، تکلیفوں ، ضرورتوں اور مشکلوں سے اچھی طرح آگاہ تھے ۔

آیت میں لفظ ” من اهل قرى“ آیا ہے ، یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ ”قرية“ ہر قسم کے شہر آبادی کو کہا جاتا ہے او ر یہ لفظ ”بدو“ کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے جس کا معنی ہے بیان ۔ ہوسکتا ہے یہ ضمنی طور پر اس طر اشارہ ہو کہ انبیاء الہی ہر گز بیابانوں نشینوں میں سے نہیں ہوتے تھے ( جیسا کہ بعض مفسرین نے تصریح بھی کی ہے ) کیونکہ بیابانوں میں گردش کرنے والے عام طور پر جہالت ، نادانی اور قساوت قلبی میں گرفتار ہوتے ہیں اور مسائل زندگی اور روحانی و مادی ضروریات سے بہت کم آگاہی رکھتے ہیں ۔

یہ ٹھیک ہے کہ سر زمین حجاز میں صحرا نورد اعراب او ربدو بہت زیادہ تھے لیکن پیغمبر اسلام مکہ میں مبعوث ہوئے کہ جو اس وقت نسبتاً بڑا شہر تھا اور یہ ٹھیک ہے کہ کنعان کا علاقہ سر زمین مصر کہ جس میں یوسف (علیہ السلام) حکومت کرتے تھے کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اسی بناء پر حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اس کے بارے میں لفظ ”بدو“ استعمال کیا لیکن ہم جانتے ہیں پیغمبر خد احضرت یعقوب (علیہ السلام) اور ان کے بیٹے کبھی بھی صحرا نورد اور بیابان نشین نہیں تھے بلکہ ایک چھوٹے سے قصبے کنعان میں زندگی بسر کرتے تھے ۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے : یہ جو تیری دعوت کے خلاف ہیں ، جب کہ تیری دعوت توحید کی طرف ہے ان کے لئے بہتر ہے کہ جائیں اور گزشتہ لوگوں کے آثار اور نشانات دیکھیں تاکہ یہ سمجھ سکیں کہ ان کی مخالفتوں کا انجام کیا ہو گا ۔ کیا انہوں

نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ وہ دیکھ سکتے کہ گذشتہ قوموں کا انجام کیا ہوا ( أَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ) -

کیونکہ یہ ”زمین میں سیر“ روئے زمین پر گردش - گزشتہ لوگوں کے آثار کا مشاہدہ اور عذاب الہی کی تباہ کن ضربوں کے نتیجے میں ان کے محلوں اور آبادیوں کی ویرانی بہترین درس ہے - یہ زندہ اور محسوس درس ہے اور ایسا درس ہے جو سب کے لئے قابل لمس ہے -

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اور آخرت کا گھر پر بیز گاروں کے لئے مسلماً بہتر ہے ( وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا ) - کیا تمام عقل سے کام نہیں لیتے اور اپنی فکر و نظر کو کام میں نہیں لاتے ( أَفَلَا تَعْقِلُونَ ) کیونکہ یہاں کا گھر تو ناپائیدار ہے - یہاں تو طرح طرح کے مصائب و آلام و تکلیفیں ہیں لیکن وہاں کا گھر جاودانی ہے اور ہر قسم کے نج و تکلیف اور پریشانی سے خالی ہے -

بعد والی آیت میں انبیاء کی زندگی کے حساس ترین اور زیادہ بحرانی لمحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : خدائی پیغمبر حق کی طرف دعوت دینے کی راہ میں استقامت دکھاتے تھے اور ڈٹے رہتے تھے اور دوسری طرف گمراہ اور سرکش قومیں اپنی مخالفت کو اس طرح جاری رکھتی تھیں کہ آخر کار انبیاء مایوس ہو جاتے اور گمان کرنے لگتے کہ شاید مومنین کے چھوٹے سے گروہ نے بھی ان سے جھوٹ بولا ہے اور اپنی دعوت کے راستے میں وہ تن نہا ہیں - اس وقت کے جب ہر طرف سے ان کی امید ختم ہو گئی تو ہماری طرف سے نصرت و کامیابی آپہنچی جسے ہم چاہتے ہیں اور اہل پاتے ہیں ، نجات دیتے ہیں

( حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَرَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ ) - ۱

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : ہمارا عذاب و عقاب گنہگار اور مجرم قوم سے پلٹا ہی انہیں جائے گا ( وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنْ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ) -

یہ ایک سنت الہی ہے کہ جب مجرمین اپنے کام پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے اوپر ہدایت کے دروازے بند کر لیتے ہیں اور ان پر اتمام حجت ہو جاتی ہے تو پھر خدا ہی عذاب اور سزائیں ان کا تعاقب کرتی ہیں اور پھر کسی کی قدرت میں نہیں کہ انہیں پلٹا سکے -

اس آیت کی تفسیر کے متعلق اور یہ کہ ”ظنوا انہم قد کذبوا“ کس گروہ کے بارے میں ہے ، مفسرین کی مختلف آراء ہیں - جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے یہی تفسیر بہت سے علماء نے انتخاب کی ہے - اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کا معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا تھا کہ وہ گمان کرنے لگتے کہ بغیر کسی استثناء کے تمام لوگ ان کی تکذیب کریں گے یہاں تک کہ اظہار ایمان کرنے والے مومنین بھی اپنے عقیدے میں ثابت قدم نہیں ہیں -

اس کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ”ظنوا“ کا فاعل مومنین ہیں - یعنی مشکلات اور بحران کا عالم یہ ہوتا کہ ایمان لانے والے یہ خیال کرتے کہ کہیں انبیاء کی طرف سے دیا جانے والی نصرت و کامیابی کا وعدہ غلط نہ ہو اور یہ سوئے ظن اور تزلزل نئے ایمان لانے والوں میں پیدا ہو نا کوئی بعید نہیں ہے -

بعض نے آیت کی ایک اور تفسیر بھی کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”انبیاء بلا کش و سبہ بشر تھے - جب انہیں زیادہ طولانی حالات کا سامنا ہوتا تو حالات کی اس سنگینی کا اثر ان پر بھی ہوتا - وہ دیکھتے کہ تمام دروازے بند ہو گئے ہیں اور رکشائش کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا ، طولانی حوادث کے تھپیڑ مسلسل انہیں پڑتے اور جن مومنین کے صبر کا پیمانہ لیریز ہو جاتا ان کی فریاد متواتر ان کے کانوں سے تکرارتی رہتی -

جی ہاں ! اس حالت میں ایک ناپائیدار لمحے میں طبیعت بشری کی بناء پر بے اختیار یہ فکر ان کے دماغ سے ٹکراتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کامیابی کا وعدہ ہی غلط ثابت ہو جائے یا ممکن ہے کامیابی کا وعدہ ایسے شرائط سے مشروط ہو کہ جو حاصل نہ ہوئی ہوں لیکن بہت جلد وہ اس فکر پر غالب آجاتے اور اسے صفحہ دل سے محو کر دیتے اور رامید کی بجلی ان کے دلوں میں کوندنے لگتی اور اس کے ساتھ ہی کامیابی کے آثار اور ہر اول دستے ظاہر ہوتے -“

اس تفسیر کے لئے انہوں نے سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۴ سے شاہد پیش کیا ہے :

حتى يقول الرسول و الذين آمنوا معه نصر الله

یعنی - گزشتہ قومیں شدائد و مصائب کے بھنور میں اس طر پھنس گئیں اور وہ خود سے لرزنے لگیں یہاں تک کہ ان کے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والے پکار کے کہتے تھے : کہاں ہے خدا کی نصرت . لیکن انہیں جواب دیا جاتا تھا :

الا ان نصر الله قريب

مفسرین کی ایک جماعت مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں یہ احتمال ذکر کرنے کے بعد اسے بعید قرار دیا ہے کیونکہ مقام انبیاء سے اس قدر بھی بعید ہے ۔  
بہر حال پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے ۔

اس سورہ کی آخری آیت ایک جامع مضمون کی حامل ہے ۔ اس میں وہ تمام مباحث مختصر سے الفاظ میں جمع کر دیئے گئے ہیں جو اس سورہ میں گزرے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) ، ان کے بھائیوں ، گزشتہ انبیاء و مرسلین اور مومن و غیرہ قوموں کی سر گزشتہ اور حالات زندگی میں غور و فکر کرنے والے تمام صاحبانِ عقل کے لئے عبرت کے عظیم درس موجود ہیں ( لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ) ۔

گزرے ہوؤں کی سر گزشتہ ایک آئینہ جس میں فتح و شکست ، کامیابی و ناکامی ، خو بختی و بد بختی اور سر بلندی و ذلت سب کچھ بھی دیکھا جاسکتا ہے ، خلاصہ یہ کہ انسان اس آئینے میں وہ کچھ دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت اور منزلت رکھتا ہے اور وہ کچھ بھی دیکھ سکتا ہے جو اس کی زندگی میں اہمیت و منزلت نہیں رکھتا ۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں گزشتہ قوموں اور عظیم رہبروں کے تمام تجربہ بات کا ماحصل نظر آتا ہے ۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جس کا مشاہدہ کم عمر والے انسان کو تمام عالم بشریت کی عمر کے برابر طولانی زندگی والا کر دیتا ہے ۔

لیکن صرف اولوالباب اور صاحبانِ فکر ہی ہیں جو اس عجیب و غریب آئینہ سے ان نقوشِ عبرت کو دیکھ سکتے ہیں ۔ مزید فرمایا گیا ہے : جو کچھ کہا گیا ہے کوئی گھڑا ہوا افسانہ اور خیالی داستان نہیں ہے (مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى) ۔

یہ آیات جو تجھ پر نازل ہوئی ہیں اور گزشتہ لوگوں کو صحیح تاریخ کے چہرے سے پردہ ہٹاتی ہیں تیرے دماغ اور فکر کی پیداوار نہیں ہیں ” بلکہ یہ ایک عظیم آسمانی وحی ہے ، گزشتہ انبیاء کی بنیادی کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی شہادت دیتی ہے “ (وَلَكِنْ تَصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ) ۔

علاوہ ازیں جس چیز کی انسان کو ضرورت ہے اور جو کچھ اس کی سعادت اور تکامل کے لئے درکار ہے وہ ان آیات میں آیا ہے ( وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ ) ۔

اسی بناء پر یہ جستجو کرنے والوں کے لئے سرمایہ ہدایت ہے اور تمام ایمان لانے والوں کے باعثِ رحمت ہے (وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ) ۔

گویا مندرجہ بالا آیت میں اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہے کہ کو بصورت اور دل انگیز داستانیں و بہت ہیں اور تمام قوموں میں ہمیشہ خیالی اور دلکش افسانے بہت رہے ہیں ۔ کہیں کوئی یہ تصور نہ کرے کہ یوسف (علیہ السلام) کی سر گزشتہ یا قرآن میں آنے والے دیگر انبیاء کے واقعات بھی اسی قبیل سے ہیں ۔

یہ امر بہت اہم ہے کہ یہ عبرت انگیز اور جھنجھوڑنے والے واقعات عین حقیقت ہیں اور ان میں ذرہ بھر انحراف نہیں اور نہ کوئی خارجی چیز ان میں شامل کی گئی ہے ۔ اسی بناء پر ان کی تاثیر بہت زیادہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خیالی افسانہ کتنا ہی جاذبِ نظر ، بلا دینے والا اور مرتب و منظم ہو اس کی تاثیر ایک حقیقی واقعے کی نسبت کچھ بھی نہیں ہے ۔ کیونکہ :

اولاً:- جس وقت سننے والا پڑھنے والا داستان کے زیادہ بیجان انگیز لمحات تک پہنچتا ہے اور اس سے لرزے لگتا ہے تو اچانک یہ خیال بجلی کی کرنٹ کی طرح اس کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک خیالی تصوراتی چیز سے زیادہ کچھ نہیں ہے ۔

ثانیاً:- یہ واقعات اور داستانیں دراصل انہیں پیش کرنے والے کی فکر کو بیان کرتی ہیں ۔ وہ اپنے افکار اور خواہشات کا نچور داستان کے بیروں کے کردار میں مجسم کرتا ہے ۔

لہذا ایک خیالی داستان ایک انسان کی فکر سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور یہ چیز ایک عینی حقیقت سے بہت مختلف ہے ۔ خیالی بات کہنے والے کی نصیحت اور وعظ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی لیکن انسانوں کی حقیقی تاریخ کی یہ صورت نہیں ہے وہ تو نتیجہ خیز ، پر برکت اور ہر لحاظ سے راہ کشا ہوتی ہے ۔

سورہ یوسف (علیہ السلام) کا اختتام

پروردگارا !

ہمیں چشم بینا ، گوش سنوا اور قلب دانا مرحمت فرما ۔

تاکہ ہم گزشتہ لوگوں کی سر گزشتوں سے اپنی نجات کے راستے تلاش کرسکیں اور ان مشکلات سے نکل جائیں کہ جن میں اس وقت ہم غوطہ زن ہیں ۔

خدا وندا !

ہمیں تیز نگاہ عطا فرما ۔

تاکہ ہم اقوامِ عالم کے انجام سے سبق حاصل کریں اور کایابی کے بعد اختلاف و انتشار کی بناء پر دردناک ترین شکستوں سے دوچار ہونے والی اقوام کو ہم دیکھیں اور اس طرح ہم اس راستے پر نہ چلیں جس پر وہ قومیں چلی ہیں ۔  
بارالہا !

ہمیں ایسی خالص نیت عطا فرما ۔ کہ

ہم نفس کے دیو کے سر پر پاؤں رکھ دیں اور ایسی معرفت عطا فرما ۔ کہ

ہم کامیابی پر مغرور نہ ہوں اور ایسی گزشت و بخشش عطا فرما کہ

اگر دوسرا ہم سے بہتر اکام انجام دے تو وہ کام ہم اس کے سپرد کر دیں ۔

اگر یہ چیزیں تو ہمیں مرحمت فرمادے تو ہم تمام مشکلات پر کامیابی حاصل کرسکتے ہیں اور ہم اسلام و قرآن کا چراغ ساری دنیا میں روشن رکھ سکتے ہیں ۔

.....

۱. 'حتیٰ' محذوف جملے کے لئے غایت و انتہا کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے : ان الرسل اقاموا علی دوتہم و الکافرین بہم علی مخالفتہم حتیٰ اذا تینس الرسل

## تفسیر نمونہ جلد 10

آسمان و زمین اور سبزہ زار خدا کی نشانیاں ہیں

اس سورہ کے آغاز میں ہم پھر قرآن کے حروف مقطعات کا سامنا کر رہے ہیں ۔ ایسے الفاظ قرآن کی ۲۹ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں ۔ یہاں آنے والے حروف دراصل ”الم“ اور ”الر“ کا مرکب ہیں جو چند دیگر سورتوں کی ابتداء میں الگ الگ آئے ہیں ۔ درحقیقت یہ وہ واحد سورہ ہے جس کی ابتداء میں ”الم“ نظر آتا ہے اور چونکہ ہر سورہ کی ابتداء میں جو حروف مقطعات آتے ہیں وہ اس سورہ کے مضامین کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتے ہیں لہذا احتمال ہے کہ یہ ترکیب جو سورہ رعد کی ابتداء میں آئی ہے اس طرف اشارہ ہے کہ سورہ رعد کے مضامین ان دونوں قسم سورتوں کے مضامین کے جامع ہیں جن کی ابتداء میں ”الم“ اور ”الر“ آیا ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ ان سورتوں کے مضامین میں غور و خو کرنے سے اس امر کی تائید ہو تی ہے ۔

قرآن کے حروف مقطعات کی تفسیر کے بارے میں اب تک ہم نے سورہ بقرہ ، سورہ آل عمران ، اور سورہ اعراف کے آغاز میں تفصیلی بحث کی ہے کہ جس کی تکرار کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے ۔

بہر حال اس سورہ کی سب سے پہلی آیت عظمت قرآن کے بارے میں گفتگو کرتی ہے ۔

” یہ عظیم آسمانی کتاب کی آیات ہیں ” تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ“ ۱

اور جو کچھ تیرے پر وردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے “ (وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ الْحَقُّ)۔ اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حقائق عینی بیان کرنے والا جہاں آفرینش اور اس کے انسان سے روابط عینی کا شاہد ہے ۔

یہ ایسا حق ہے جو باطل میں ملا ہو انہیں ہے ۔ اسی لئے اس کی حقانیت کی نشانیاں اس کے چہرے سے ہویدار ہیں اور یہ مزید استدلال کی ضرورت نہیں رکھتا ۔

لیکن اس کے باوجود بوالہوس اور نادان لوگ ، کہ جن کی اکثریت ہے ، ان آیات پر ایمان نہیں لاتے (وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ)۔

کیونکہ اگر انسان کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور وہ پاک دل معلم کی پیروی نہ کرے کہ جو راہ حیات میں اس کی ہدایت اور تربیت کرے اور اس طرح ہوا و ہوس کی پیروی کرنے میں بھی آزاد ہو تو اکثر وہ اپنے آپ کو ان کے اختیار

میں دے دیں تو پھر اکثریت راہِ حق پر چلے گی۔

اس کے بعد تو حید اور عالم آفرینش میں خدا کی نشانیوں کے اہم دلائل کی تشریح کی گئی ہے اور خاکی انسان کو آسمانوں کی وسعت میں گردش کرنے پر ابھارا گیا ہے اور اس کے لئے ان عظیم کرون، ان کے نظام حرکت اور ان کے اسرار کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ وہ اس کی لامتناہی اور بے پایاں قدرت و حکمت کو جان سکے، کس قدر خوبصورتی سے فرمایا گیا ہے : خدا وہی ہے جو آسمانوں کو جیسا تم دیکھتے ہو بغیر ستون کے قائم کئے ہوئے ہے یا وہ انہیں غیر مرئی ستونوں کے ساتھ بلند کئے ہوئے ہے ( اللہ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا )۔ ۲

”بَغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا“ کے بارے میں دو تفسیریں بیان کی ہیں :

پہلی یہ کہ ”جس طرح تم دیکھتے ہو آسمان بغیر ستون کے ہے (گویا اصل میں ایسے تھا : (ترونها بغیر عمد) -

دوسری یہ کہ ”ترونها“ صفت ہے ”عمد“ کے لئے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ آسمانوں کو بغیر کسی مرئی ستون کے بلند کیا گیا ، جس کا لازمہ ہے کہ آسمان کے لئے ستون جو غیر مرئی ہے -

پہلی بات امام علی بن موسیٰ رضا (ع) سے حسین بن خالد کی حدیث میں آئی ہے ، وہ کہتا ہے :

میں نے امام ابو الحسن (ع) رضا (ع) سے پوچھا : یہ خدا کہتا ہے ”والسماوات الحیک“ ( اس آسمان کی قسم جو راستوں کا حامل ہے ) اس سے کیا مراد ہے ؟

امام (ع) نے فرمایا :

اس آسمان کے زمین کی طرف راستے ہیں -

حسین بن خالد کہتے ہیں : میں نے عرض کیا:

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آسمان زمین کے ساتھ ارتباطی راستہ رکھتا ہو حالانکہ خدا فرماتا ہے : آسمان ستون کے بغیر ہیں اس پر امام نے فرمایا:

سبحان اللہ ! لیس اللہ یقوم : بغیر عمد ترونها

سبحان اللہ ! کیا خدا نے نہیں فرمایا : بغیر ایسے ستون کے جو قابل مشاہدہ ہو؟

فقلت بلیٰ

راوی کہتا ہے : میں نے کہا جی ہاں

فقال ثم عمد ولكن لاترونها

فرمایا : پس ستون تو ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے - 3

اس حدیث کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیر بحث آیت کی تفسیر میں آئی ہے ، اس آیت نے ایک سائنسی حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھا یا ہے کہ جو نزول آیات کے وقت کسی پر آشکار نہیں تھی کیونکہ اس نے زمانے میں بطليموس کی ہیئت اپنی پوری طاقت کے ساتھ دنیا کے سائنسی مسائل اور لوگوں کے افکار و نظریات پر حکمران تھی اور اس کے مطابق آسمان ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکے کی طرح کرات کی شکل میں تھے - ظاہر ہے اس طرح تو ان میں کوئی بھی معلق اور ستون کے بغیر نہ تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے تھا لیکن ان آیات کے نزول کے تقریباً ایک ہزار سال بعد انسانی علم اس مقام پر پہنچا ہے کہ پیاز کے چھلکوں والے افلاک کی بات موبومی ہے -

واقعی یہ ہے کہ آسمانی کرات میں سے ہر ایک اپنے مدار اور جگہ سے بغیر کسی سہارے کے ثابت اور معلق ہے اور وہ واحد چیز جو انہیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے وہ قوتِ جاذبہ اور دافعہ کا اعتدال ہے کہ جن میں سے ایک ان کے کرات کے جرم سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری ان کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے -

جاذبہ و دافعہ کا یہ اعتدال غیر مرئی ستون کی شکل میں آسمانی کرات کو اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے -

اس سلسلے میں ایک حدیث جو امیر المومنین علی (ع) سے نقل ہوئی ہے بہت ہی جاذب نظر ہے - اس حدیث کے مطابق امام علیہ السلام نے فرمایا :

هذه النجوم التي في السماء مدائن مثل مدائن في الارض مربوطة كل مدينة الى عمود من نور. 4

یہ ستارے جو آسمان میں ہیں یہ زمین کے شہروں کی طرح شہر ہیں کہ جن میں سے ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ ( ہر

ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ ) نور کے ایک ستون کے ذریعے مربوط ہے -

کیا اس زمانے کے افق ادبیات میں قوتِ جاذبہ کی امواج اور ان کے قوتِ دافعہ میں اعتدال کے لئے ”غیر مرئی ستون“

اور ”نورانی ستون“ سے بڑھ کر روشن اور رسا تعبیر ہو سکتی تھی ؟ 5

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : خدا نے بغیر ستون کے ان آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد کہ جو اس کی لامتناہی عظمت و قدرت

کی واضح نشانی ہیں عرش کا کنٹرول سنبھالا، یعنی عالم ہستی کی حکومت اپنے قبضے میں لی (ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ)۔  
 ”عرش“ کے معنی اور اس پر خدا کے تسلط کے مفہوم کے سلسلے میں سورہ اعراف کی آیہ ۵۴ کے ذیل میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ 6-

آسمانوں کی خلقت اور ان پر پروردگار کی حکومت کا ذکر کرنے کے بعد سورج اور چاند کی تسخیر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : وہ وہی ہے جس نے سورج اور چاند کا مسخر کیا اور انہیں فرماہر دار اور خدمت گزار قرار دیا (وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا تسخیر ہو گی کہ یہ سب اس کے فرمان کے سامنے سرنگوں ہیں نیز انسانوں اور تمام زندہ موجودات کے خدمت گزار ہیں ، نور چھڑکتے ہیں۔ ایک عالم کو روشن کرتے ہیں ، موجودات کا بستر گرم کرتے ہیں ، موجودات زندہ کی پرورش کرتے ہیں اور دریاؤں میں مد جزر پیدا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمام حرکتوں اور ہر کتوں کا سر چشمہ ہیں۔

لیکن جہان مادہ کا یہ نظام جاودانی اور ابدی نہیں ہے اور شمس و قمر میں سے ہر ایک ، ایک مدت معین تک اپنے راستے پر حرکت جاری رکھے ہوئے ہے (كُلُّ يَجْرِى لِأَجَلٍ مُّسَمًّى)۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ یہ حرکات ، گر دشیں ، آمد و شد اور تبدیلیاں بغیر کسی حساب و کتاب کے اور بے نتیجہ و بے فائدہ نہیں ہیں بلکہ ” وہی ہے جو تمام کاموں کا تدبیر کرتا ہے “ اور ہر حرکت کے لئے حساب اور ہر حساب کے لئے ہدف اور مقصد نظر میں رکھتا ہے (يُدَبِّرُ الْأُمْرَ)۔

” وہ اپنی آیات تمہارے لئے شمار کرتا ہے اور ان کی باریکیاں تفصیل سے بیان کرتا ہے تاکہ تمہیں لقائے پروردگار اور دوسرے جہان کا یقین پیدا ہو “ (يُقْضَىٰ الْأَيَّاتُ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ)۔

گزشتہ آیت انسان کو آسمانوں پر لے جاتی ہے اور عالم بالا میں اسے آیات الہی کی طرف متوجہ کرتی ہے دوسری آیت انسان کو تو حیدی آیات کے مطالعے کی دعوت دیتی ہے ، انسان کو زمین ، پہاڑوں ، نہروں ، انواع و اقسام کے پہلوں اور سورج کے طلوع و غروب پر غور کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ وہ سوچ بچار کرے کہ اس مقام آسائش و آرام پہلے کیا تھا اور وہ اس شکل میں کیسے آیا۔

قرآن کہتا ہے : وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلا یا (وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ)۔ اس نے اسے یوں پھیلا یا کہ وہ انسانی زندگی اور نباتات و حیوانات کی پرورش کے قابل ہو۔ تند اور خطر ناک گڑھوں اور ڈھلوانوں میں پہاڑ داخل کر دیئے اور انہیں پتھروں کو مٹی میں تبدیل کر کے پر کیا اور ان کی سطح کو قابل حیات بنایا حالانکہ ابتداء میں ان کے پیچ و خم ایسے تھے جن میں انسان کے لئے زندگی بسر کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

اس جملے میں ” مد الارض “ سے یہ احتمال بھی ہے کہ جیسا کہ ماہرین ارض بھی کہتے ہیں ابتداء میں ساری زمین پانی کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی۔ پھر پانی گڑھوں میں چلا گیا اور خشکیاں تدریجاً پانی سے نمایاں ہوئے لگیں اور دن بدن ان میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ انہوں نے موجودہ صورت حال اختیار کر لی۔

اس کے بعد پہاڑوں کی پیدائش کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : خدا نے زمین میں پہاڑ بنائے (وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ)۔

وہی پہاڑ... کہ جن کا قرآن کی دوسری آیات میں ” اوتاد “ ( یعنی ” اونچی میخیں “ ) کے طور پر تعارف کروایا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے پہاڑوں نے ایک دوسرے میں پنجے ڈالے ہوئے ہیں اور زرہ کی طرح ساری سطح زمین کو ڈھانپا ہوا ہے تاکہ اندرونی دباؤ بھی ختم کر سکیں اور باہر سے چاند کی بہت زیادہ قوت جاذبہ اور مد جزر کو بھی روکے رکھیں ، اس طرح سے تزلزل اور دائمی زلزلوں کو ختم کر سکیں اور کرۂ زمین کو انسانی زندگی کے آرام و سکون کے لئے ہر قرار رکھیں۔

زمین کے پھیلانے اور بچھانے کے بعد پہاڑوں کا ذکر گویا اس طرف اشارہ ہے کہ زمین نہ اس طرح سے پھیلائی گئی ہے کہ اس میں کوئی پستی و بلندی نہ ہو کیونکہ اس صورت میں بارشیں اور پانی اس پر نہ ہوتے اور یا ہر جگہ ایک جوہڑ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی اور اس کی سطح پر دائمی طوفان جاری رہتے لیکن پہاڑوں کی پیدائش سے ان دونوں صورتوں میں امان مل گئی ہے اور نہ ساری زمین پہاڑوں اور دروں پر مشتمل ہے کہ زندگی کے قابل ہی نہ ہو یہ زمین مجموعی طور پر ہموار بھی ہے اور اس میں پہاڑ اور درے بھی ہیں جو نوع بشر اور دیگر زندہ موجودات کی زندگی کے لئے بہترین ترکیب ہے۔

اس کے بعد ان پانیوں اور دریاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو روئے زمین پر چلتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے : اور اس میں دریا جاری ہیں (وَأَنْهَارًا)۔

زمین کی آبیاری کا نظام پہاڑوں سے ارتباط کا دریا وں سے تعلق بہت جاذب نظر ہے کیونکہ زمین کے بہت سے پہاڑوں کی چوٹیوں اور دروں کے شگافوں میں برف کی صورت میں یہ دریا سٹور ہوتے ہیں جو تدریجاً پانی کی شکل اختیار کرتے ہیں اور قانون جاذبہ کے مطابق بلند ترین مقامات سے زیریں اور کشادہ علاقوں کی طرف سفر کرتے ہیں اور بغیر کسی قوت کی احتیاج کے سال بھر طبیعی طور پر بہت وسیع زمینوں کی آبیاری کرتے ہیں اور انہیں سیراب کرتے ہیں اگر زمینوں میں مناسب ڈھلوان نہ ہوتی اور پانی اس شکل میں پہاڑوں پر ذخیرہ نہ ہوتا تو زیادہ تر خشک علاقوں کی آبیاری کا امکان نہ ہوتا اور اگر آبیاری ممکن بھی ہوتی تو بہت زیادہ مخرج کی ضرورت پڑتی۔

اس کے بعد غذائی مواد اور ان پھلوں کا ذکر ہے کہ جو زمین ، پانی اور سورج کی روشنی سے وجود میں آتے ہیں اور انسانی غذا کا بہترین وسیلہ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے : اور تمام پھلوں میں سے جوڑا جوڑا زمین پر قرار دئیے گئے ہیں (وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلْنَا فِيهَا رَوْحِينَ آتْنَيْنِ)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ پھل بھی زندہ موجودات ہیں اور ان میں بھی نر اور مادہ نطفے موجود ہوتے ہیں کہ جو تلقیح سے بار آور ہوتے ہیں۔ دانش مند ”لینہ“ اور مشہور ماہر نباتات ”سوننڈی“ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواسط میں یہ بات معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ عالم نباتات میں زوجیت اور جفت کا معاملہ تقریباً عمومی اور کلی قانون ہے اور نباتات بھی حیوانات کی طرح نر اور مادہ کے نطفہ کی آمیزش سے بار آور ہوتے ہیں اور پھل دیتے ہیں جب کہ قرآن مجید نے اس سے گیارہ سو سال پہلے اس حقیقت کو فاش کر دیا تھا۔ یہ خود قرآن مجید کا ایک علمی معجزہ ہے کہ جس سے اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لینہ سے پہلے بہت سے ماہرین اجمالی طور پر بعض نباتات میں نر اور مادہ کا وجود معلوم کر چکے تھے یہاں تک کہ عام لوگ بھی جانتے تھے کہ اگر کھجور کے درخت بور نہ دیں یعنی نر کا نطفہ مادہ حصوں پر نہ چھڑ کا جائے تو وہ پھل نہیں دے گا لیکن کوئی شخص ٹھیک طرح سے یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ قانون تقریباً سب کے لئے ہے یہاں تک کہ لینہ اسے معلوم کرنے میں کامیاب ہوا مگر جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن صدیوں پہلے اس حقیقت کے چہرے سے پر دہ ہٹا چکا تھا۔

انسان اور دیگر تمام زندہ موجودات کی زندگی ، بالخصوص نباتات ، گیہا پھلوں کی زندگی رات و دن کے دقیق نظام کے بغیر ممکن نہیں لہذا آیت کے دوسرے حصے میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : خدا رات کے ذریعے دن کو ڈھانپ دیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے (يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ)۔

کیونکہ اگر رات کا سکون بخش پر دہ نہ ہوتو سورج کا دائمی نور تمام سبزو اور نباتات کو جلا دے اور صفحہ زمین پر پھلوں کا بلکہ تمام زندہ موجودات کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔

کرہ مہتاب میں اگر چہ دن ہمیشہ نہیں رہتا لیکن وہاں دنوں کی لمبائی کرہ زمین کے پندرہ رات دن کے برا بر اور دن کے وسط میں کرہ مہتاب کا درجہ حرارت اتنا زیادہ ہوجاتا ہے کہ اگر پانی یا کوئی دوسری بہنے والی چیز ہو تو ابلنے لگے بلکہ اس کا درجہ حرارت اس سے بھی بڑھ جائے۔ کوئی زندہ موجود کہ جسے ہم زمین پر پہچانتے ہیں عام حالات میں یہ گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا : جو امور بیان کئے گئے ہیں ان میں آیات اور نشانیاں ہیں ، ان کے لئے جو غور و فکر کر تے ہیں (إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ)۔

وہ لوگ جو اس بدیع اور تعجب خیز نظام میں سوچ بچار کرتے ہیں .... نور و ظلمت کے نظام میں ، آسمانی کرات اور ان کی گردش کے نظام میں ، آفتاب و مہتاب کی نورافشانی اور ان کی انسانوں کے لئے خدمت گزاری کے نظام میں ، زمین بچھانے کے نظام میں ، پہاڑوں اور دریاؤں کی پیدائش کے اسرار میں اور نباتات اور پھلوں کے نظام میں .... جی ہاں ! جو لوگ اس نظام میں غور و فکر کرتے ہیں وہ ان میں قدرتِ لایزال کی آیات اور پروردگار کی حکمتِ بے پایاں واضح اور روشن طور پر دیکھتے ہیں۔

زیر بحث آخری آیت میں زمین شناسی اور نباتات شناسی کے جاذبِ نظر نکات کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ، ایک حساب شدہ نظام خلقت کی نشانی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ زمین میں مختلف قطععات اور ٹکڑے موجود ہیں کہ ایک دوسرے کے پاس ہمسائیگی میں ہیں (وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ)۔

باوجودیکہ یہ سب قطععات ایک دوسرے سے متصل اور روبرو ہیں ، ہر ایک کی ساخت اور استعداد خود اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعض محکم ہیں اور بعض نرم ، بعض نمکین ہیں اور بعض شیریں اور ان میں سے ہر ایک خاص نباتات ، درختوں ، پھلوں اور زراعتوں کی پرورش کی استعداد رکھتا ہے۔

انسان اور زمین میں رہنے والے جانداروں کی ضروریات چونکہ بہت زیادہ اور مختلف ہیں لہذا زمین کا ہر قطعہ گویا ان

میں سے ایک ضرورت کو پورا کرنے کی ماموریت رکھتا ہے اور اگر سب قطعاً ایک ہی طرح کے ہوتے یا یہ استعدادیں ان میں صحیح طور پر تقسیم نہ ہوتیں تو انسان غذائی مواد، دواؤں اور دیگر ضروریات کے لحاظ سے کیسی کیسی کمیابیوں میں گرفتار ہوتا لیکن ماموریت کی اس حساب شدہ تقسیم کی وجہ سے مختلف قطعاً زمین کو پرورش کی مختلف استعدادیں دئے جانے کے باعث یہ ضروریات مکمل طور پر پوری ہو جاتی ہیں۔

نیز یہ کہ ”اسی زمین میں انواع و اقسام کے انگوروں، اور زروعوں اور رکھجوروں کے باغات اور پودے موجود ہیں“  
(وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَزُرْعٍ وَنَخِيلٍ) 7

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ درخت اور ان کی مختلف انواع و اقسام کبھی تو ایک ہی پایہ و بنیاد پر اگتی ہیں اور کبھی مختلف پایوں اور بنیادوں پر (صِنَوَانٌ وَغَيْرُ صِنَوَانٍ) 8۔

”صنوان“ جمع ہے ”صنو“ کی کہ جو دراصل شاخ کے معنی میں ہے کہ جو درخت کے اصلی تنے سے نکلتی ہے اس بنا پر ”صنوان“ کا معنی ہے ”ایک تنے سے پھوٹنے والی مختلف شاخیں۔“

یہ جاذب نظر ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان شاخوں میں سے ہر ایک پھل کی ایک خاص قسم دیتی ہے۔ یہ جملہ درختوں کی پیوند کی استعداد کے مسئلے کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔ کبھی ایک ہی پایہ اور شاخ پر چند مختلف پیوند لگائے جاتے ہیں اور ان پیوندوں میں سے ایک نشو و نما حاصل کرتا ہے اور اس سے پھل کی ایک خاص قسم حاصل ہوتی ہے... مٹی ایک، جڑ ایک اور شاخ ایک لیکن اس کا پھل اور محصول مختلف ہوتا ہے۔

زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ”وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں (يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ)۔“

ان تمام چیزوں کے باوجود ”ہم ان میں سے بعض درختوں کو بعض دوسرے درختوں پر پھل کے لحاظ سے برتری اور فضیلت دیتے ہیں“ (وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ)۔

یہاں تک کہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک ہی درخت میں ای ایک ہی شاخ میں ایک ہی جنس کے پھل لگتے ہیں مگر ان کا ذائقہ اور رنگ مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح پھلوں میں دنیا میں ہم نے بہت دیکھا کہ ایک ہی پودے میں بلکہ ایک ہی شاخ پر بالکل مختلف رنگوں والے پھل اگے ہوتے ہیں۔

یہ کیسی تجربہ گاہ ہے اور کیسی اسرار آمیز لیبارٹری درختوں کی شاخوں میں لگائی جاتی ہے کہ جو بالکل ایک ہی مواد سے بالکل مختلف ترکیبات کو جنم دیتی ہے کہ جن میں سے ہر ایک انسانی ضروریات کے ایک حصے کو پورا کرتی ہے۔ کیا ان اسرار میں سے ہر ایک کسی ایک حکیم و عالم مبداء کے وجود کی دلیل نہیں کہ جو اس نظام کی رببری کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ان امور میں عظمتِ خدا کی نشانیاں ہیں، ان کے لئے جو تعقل اور سوچ بچار رکھتے ہیں (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ)۔

سورہ رعد / 1 تا 4

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۱۔ الْمَرُّ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ۔

۲۔ اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ۔

۳۔ وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ اثْنَيْنِ يُغِشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔

۴۔ وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَبَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزُرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنَوَانٌ وَغَيْرُ صِنَوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

ترجمہ

۱۔ المر یہ (آسمانی) کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ تیرے پر وردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

۲۔ خدا وہی ہے جس نے آسمان کو قابل مشابہہ ستون کے بغیر پیدا کیا پھر عرش کا کنٹرول سنبھالا (اور تدبیر عالم کی مہار اپنے ہاتھ میں لی) اور آفتاب و مہتاب کو مسخر کیا کہ ان میں سے ہر ایک معین زمانے تک حرکت رکھتے ہیں، وہی کاموں کی تدبیر کرتا ہے، (تمہارے لئے) آیات کی تشریح کرتا ہے تاکہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین حاصل کر لو۔

۳۔ وہ وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں اور اس میں تمام پھولوں کے دو جفت پیدا کئے۔

وہی دن کو رات ( کا سیاہ پردہ ) اوڑھا تا ہے ۔ ان میں ان کے لئے آیات ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں ۔  
 ۴۔ اور روئے زمین میں ایسے قطعات ہیں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ نیز  
 انگور کے باغات ، کھیتیاں اور نخلستان ہیں کہ جو کبھی ایک ہی پائے پر اگتے ہیں اور کبھی دوپایوں پر ۔ وہ سب ایک ہی  
 پانی سے سیراب ہوتے ہیں ۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض کو پہل لحاظ سے ایک دوسرے پر بر تری دیتے ہیں ۔ ان  
 میں ان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقل استعمال کرتے ہیں ۔

.....

- ۱۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا کہ ”تک“ اسم اشارہ بعید ہے ، اس کا انتخاب قریب کے اشارہ ” ہذہ“ کی بجائے قرآنی آیات کی عظمت و رفعت کے لئے کنایہ ہے ۔
- ۲۔ ”عمدہ“ ( بر وزن ” صمد “ ) اور ” عمد “ ( بروزن ”دھل“ ) دونوں عمود بمعنی ”ستون“ کی جمع ہیں اگر چہ ادبی لحاظ سے پہلے جمع اور دوسرے کو اسم جمع سمجھا جا تا ہے ( مجمع البیان ۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں )۔
- 3۔ یہ حدیث تفسیر پر بان میں تفسیر علی بن ابراہیم اور تفسیر عیاشی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے ۔ ( برہان جلد ۲ ص ۲۷۸ )
- 4۔ سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۷۴ منقول از تفسیر علی بن ابراہیم قمی۔
- 5۔ مزید وضاحت کے لئے کتاب ” قرآن و آخرین پیامبر “ ص ۱۶۶ کے بعد کی طرف رجوع فرمائیں ۔
- 6۔ تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۱۸۰ کی طرف رجوع فرمائیں ۔
- 7۔ ”اعناب“ ”عنب“ کی جمع ہے اور ” نخل “ ” نخل “ کی جمع ہے اور شاید جمع کا صیغہ یہاں انگور او رکھجور کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہو کیونکہ ان دو قسموں کے پھلوں میں سے ہر ایک کی شاہد مثال ہیں ذائقے اور رنگ کے اعتبار سے کئی سو اقسام ہیں ۔
- 8۔ ”صنو“ کے لئے ایک اور معنی بھی ذکر ہوا ہے او روہ ہے ” شبیہ“ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معنی بھی مذکورہ بالا معنی سے لیا گیا ہے ۔

چند اہم نکات

- ۱۔ توحید اور قیامت میں تعلق:
- زیر بحث پہلی آیت کے آغاز میں اسرار خلقت اور توحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن آیت کے آخر میں ہے :
- یفصل الآيات لعلکم بلقاء ربکم توقنون
- خدا تمہارے لئے اپنی آیات کی تشریح کرتا ہے تاکہ تم قیامت او رمعاد پر ایمان لے آؤ۔
- یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مسئلہ توحید اور مسئلہ معاد کے درمیان کونسا تعلق ہے کہ جس کی بناء پر ان کا ذکر ایک دوسرے کے نتیجے کے حوالے سے کیا گیا ہے ۔
- اس نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اعادہ کی بھی قدرت رکھتا ہے جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت ۲۹ میں ہے :
- کما بدأکم تعدون
- جیسے اس نے تمہیں ابتداء میں پیدا کیا ہے ویسے ہی پلٹا ئے گا ۔
- اور سورہ یس کے اواخر میں ہے :
- کیا وہ خدا کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے ، ان کی مثل ایجاد کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ۔
- ثانیاً جیسا کہ ہم معاد و قیامت می بحث میں کہا ہے کہ اگر عالم آخرت نہ ہو تو اس جہان کی خلقت فضول اور بیہودہ ہوگی کیونکہ یہ زندگی اس وسیع جہان کی خلقت کا مقصد نہیں ہوسکتی ۔ قرآن مجید معاد سے مربوط آیات ( مثلاً سورہ واقعہ ۶۲ ) میں کہتا ہے :
- ولقد علمتم النشأة الاولى فلولا تذکرون
- تم نے جو اس جہان کو دیکھا تو پھر دھیان کیوں نہیں دیتے کہ یقیناً اس کے بعد ایک اور جہان ہو گا ۔ 1

۲۔ قرآن کی سائنسی معجزات :

قرآن مجید میں بہت سے آیات ایسی ہیں جو ایسے سائنسی اسرار کے ایک پہلو سے پر دہ اٹھاتی ہیں کہ جو اس زمانے کے ماہرین کی نظروں سے پوشیدہ تھے اور یہ امر خود قرآنی اعجاز اور عظمت کی نشانی ہے ۔ وہ محققین کہ جنہوں نے اعجاز قرآن کے سلسلے میں بحث کی ہے اکثر و بیشتر ان آیات کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ ان میں سے ایک آیت سطور با لا میں ذکر ہو ئی ہے کہ جو عالم نباتات میں زوجیت اور جفت ہونے کے بارے میں گفتگو

کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ عالم نباتات میں زوجیت کا مسئلہ جزوی طور پر عرصہ قدیم سے جانا پہچاناتھا لیکن ایک کلی اور عمومی قانون کے طور پر پہلی مرتبہ یورپ میں اٹھارہویں صدی کے وسط میں ایک اٹلی سائنسدان ”لینہ“ نے اس کا انکشاف کیا لیکن قرآن مسلمانوں کو ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی قبل اس کی خبر دے چکا تھا۔ یہ مسئلہ سورہ لقمان کی آیہ ۱۰ میں بھی بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

و انزلنا من السماء ماءً فانبثنا فیہا من کل زوج کریم  
ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے ہم نے زمین پر زوج اور جفت سے مفید گیا ہ اگا یا۔  
بعض دوسری آیات میں بھی اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ سورج اور چاند کی تسخیر:

ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا کہ خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے ایسی آیات ہیں کہ جو کہتی ہیں کہ آسمانی کرات، زمینی موجودات اور رات دن وغیرہ سب انسان کے لئے مسخر ہیں، ایک موقع پر ہے:

و سخر لکم الانہار  
خدا نے تمہارے لئے دریاؤں کو مسخر کیا ہے۔ (ابراہیم - ۳۲)

ایک اور موقع پر ہے:

و سخر لکم الفلک

تمہارے لئے کشتی کو مسخر کیا ہے۔ (ابراہیم - ۳۲)

ایک اور جگہ ہے:

و سخر لکم اللیل و النہار

رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے۔ (نحل - ۱۲)

اور مقام پر ہے:

سخر لکم الشمس و القمر

سورج اور چاند تمہارے لئے مسخر کئے ہیں۔ (ابراہیم - ۳۲)

ایک اور جگہ پر ہے:

و هو الذی سخر لبحر لتأکلوا منه لحمًا طریاً

تمہارے لئے دریا مسخر کیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاؤ (نحل - ۱۴)

ایک اور مقام پر ہے:

الم تر ان الله سخر لکم ما فی الارض

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ خدا نے ان تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے جو روئے زمین پر ہیں (حج - ۶۵)

ایک اور موقع پر ہے:

و سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعاً منہ

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے لئے مسخر کیا ہے (جا ئیہ - ۱۳)

ان تمام آیات سے مجموعی طور پر اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ:

اولاً: انسان اس جہان کا اکمل اور ترقی یافتہ موجود ہے اور اسلام کی جہان بینی کی نظر سے اسے اس قدر مقام دیا گیا ہے کہ دوسرے تمام موجودات کو اس انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے کہ جو ”خلیفۃ اللہ“ ہے اور اس کا دل مقام نور خد ابے۔

ثانیاً: ان آیات میں تسخیر ان معنی میں نہیں کہ یہ تمام چیزیں انسان کے تحت فرمان ہیں بلکہ اس قدر ہے کہ یہ اس کے

فائدے اور منافع کے لئے اور اس کی خدمت کے لئے حرکت کر رہے ہیں۔

مثلاً: آسمانی کرات اس کے لئے نور افشانی کرتے ہیں یا ان سے دیگر فوائد حاصل ہوتے ہیں، وہ اس کی تسخیر میں ہیں۔ کوئی مکتب و مذہب اس قدر بلند انسانی مقام کا قائل نہیں اور کسی فلسفہ میں انسان یہ حیثیت اور مقام نہیں رکھتا... اور یہ دین

اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے انسانی وجود کی اہمیت اس حد تک بلند کر دی ہے کہ جس سے آگاہی انسانی تربیت

اور ارتقاء کے لئے گہرے اثرات مرتب کرتی ہے کیونکہ جب انسان یہ سوچے کہ خدا نے یہ تمام عظمتیں اسے بخشی ہیں

اور۔

ایر و باد ماہ خورشید در کار ند

یعنی .. بادل، ہوا ، چاند ، سورج سب محو کار ہیں اور سب اس کے فرماہر دار اور خدمت گزار ہیں ۔  
ایسا انسان غفلت اور پستی کے لئے تیار نہیں ہوتا ، اپنے آپ کو خواہشات و شہوات کا اسیر نہیں کرتا اور ثروت و مقام اور  
زور کا غلام، نہیں بناتا.... وہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آسمانوں کی اوج پر پر واز کرتا ہے ۔  
کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سورج اور چاند انسان کے مسخر نہیں ہیں حالانکہ وہ اپنی نورافشانی سے حیاتِ انسانی کو  
روشن اور گرم کئے ہوئے ہیں ۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہوتو کرہ ارض پر کوئی جنبش و حرکت نہ ہو۔  
دوسری طرف سورج کی قوتِ جذبہ زمین کی حرکت کو اس کے مدار میں منظم کرتی ہے ۔  
دریاؤں اور سمندروں کا مدو جزر چاند کی مدد سے پیدا ہوتا ہے کہ جو خود بہت سی برکات اور منافع کا سرچشمہ ہے ۔  
کشتیاں ، دریا، نہریں اور دن رات ہر ایک کسی نہ کسی طرح انسان کی خدمت کرتے ہیں اور اس کے فائدے کے لئے رواں  
دواں ہیں ۔  
ان تسخیرات اور ان کے حساب شدہ نظام میں غور و فکر کیا جائے تو یہ خالق کی عظمت ، قدرت اور حکمت کی واضح  
دلیل ہیں ۔

### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ رعد / 5 تا 6

۵۔ وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَيْدَا كُنَّا تُرَابًا إِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَرَبَّهُمْ وَأُولَئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۔  
۶۔ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمُثَلَّثَاتُ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَعْفَرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ۔  
ترجمہ

۵۔ اور اگر تو (کسی چیز پر) تعجب کرنا چاہتا ہے تو ان کی گفتگو عجیب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم مٹی  
لوگنے تو ہم دوبارہ زندہ ہو گے اور کیا (ہم نئی خلقت کے ساتھ پلٹ آئیں گے۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو اپنے پروردگار  
سے کافر ہو گئے ہیں اور یہ وہ ہیں جن کی گردن میں زنجیریں اور یہ اہل نار ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔  
۶۔ وہ تجھ سے حسنہ (اور رحمت) سے پہلے جلدی سے سینہ (اور عذاب) کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے عبرت  
انگیز بلانیں اور مصیبتیں نازل ہوئی ہیں اور اگر چہ لوگ ظلم کرتے ہیں تیرا پروردگار ان کے لئے صاحبِ مغفرت ہے  
اور تیرا پروردگار عذابِ شدید بھی رکھتا ہے ۔

1- مزید وضاحت کے لئے کتاب ” معاد و جہان پس از مرگ “ کی طرف رجوع کریں ۔

قیامت کے بارے میں کافروں کا تعجب

عظمت الہی کی نشانیوں کے بارے میں جو آیات گزری ہیں ان کے بعد زیر بحث پہلی آیت میں مسئلہ معاد پیش کیا گیا ہے او  
ر مسئلہ مبداء و معاد میں جو خاص ربط اور تعلق ہے اس کی بنیاد پر اس بحث کو پختگی دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اگر تم  
کسی چیز پر تعجب کرنا چاہتے ہو تو ان کی اس بات پر تعجب کرو کہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں  
نئی خلقت دی جائے گی (وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ أَيْدَا كُنَّا تُرَابًا إِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ)۔  
یہ وہی تعجب ہے جو تمام جاہل قوموں کو مسئلہ معاد کے بارے میں تھا ۔ وہ موت کے بعد حیاتِ نواور خلقتِ جدید کو  
محال سمجھتے تھے حالانکہ گزشتہ آیات میں اور دیگر قرآنی آیات میں اس مسئلے کا اچھی طرح سے جواب دیا گیا ہے اور  
وہ یہ کہ آغازِ خلقت اور تجدیدِ خلقت میں کیا فرق ہے وہ ذات جو آغازِ خلقت میں انہیں پیدا کرنے پر قادر تھی وہ اس پر

بھی قادر ہے کہ ان کے بدن کو حیات نو عطا کرے۔ گویا یہ اپنی خلقت کی ابتدا کو بھول چکے ہیں تبھی تو اس کی تجدید کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

پہلے کہتا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے کافر ہو گئے ہیں (أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ) کیونکہ اگر یہ لوگ خدا کو اور اس کی ربوبیت کو قبول کرتے تو پھر معاد اور تجدید حیاتِ انسانی کے بارے میں شک نہ کرتے لہذا مسئلہ معاد میں ان کی خرابی مسئلہ توحید و ربوبیتِ الہی کے بارے میں ان کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ دوسرا یہ کہ کفر اور بے ایمانی اختیار کرنے کی وجہ سے اور توحید کے پرچم آزادی کے سائے سے نکل جانے کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو طوق و زنجیر میں گرفتار کر لیا ہے۔ انہوں نے بت پرستی، ہوسپرستی، مادہ پرستی اور جہالت و خرافات کے طوق اپنے ہاتھوں اپنی گردن میں ڈالے ہیں ” اور ان کی گردن میں یہ طوق ہیں “ ( وَأُولَئِكَ الْأَعْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ)۔

” اور اس کیفیت اور کردار کی وجہ سے ایسے لوگ یقیناً اہل دوزخ ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے “ اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی نتیجہ اور توقع نہیں ہے ( وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ )۔

بعد والی آیت میں مشرکین کی ایک اور غیر منطقی بات پیش کی گئی ہے۔ فرمایا: بجائے اس کے کہ وہ تیرے ذریعے خدا سے رحمت کا تقاضا کرتے عذاب، کیفر کردار اور سزا میں تعجیل کا تقاضا کرتے ہیں ( وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ)۔ یہ قوم اس قدر ہٹ دھرم اور جاہل کیوں ہے۔ لوگ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اگر تو سچ کہتا تو ہم اس طرح یا اس رحمتِ خدا نازل کر، الٹا کہتے ہیں کہ اگر تیری بات سچی ہے تو ہم پر عذابِ خدا نازل کر۔

کیا ان کا خیال ہے کہ خدا کی سزا اور عذاب کی بات غلط ہے ” حالانکہ گزشتہ زمانوں میں سرکش امتوں پر عذاب نازل ہوئے “ جن کی خبریں صفحاتِ تاریخ پر اور زمین کے دل پر ثبت ہیں ( وَقَدْ خَلَّتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمُثَلَّثَاتُ )۔ 2

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: لوگوں کی برائیوں، قباحتوں اور ظلم و ستم کے مقابلے میں خدا صاحبِ مغفرت ہے اور شدید العقاب بھی ہے ( وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَى ظَلْمِهِمْ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ)۔

اس کی شدتِ عقاب و سزا اس کی رحمتِ عام کے لئے ہر گز رکاوٹ نہیں جیسا کہ اس کی رحمتِ عام شدتِ عقاب و سزا کا وٹ نہیں ہے۔

یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ظالموں کو موقع دیتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں کریں کیونکہ ایسے مواقع پر تو وہ شدید العقاب ہے۔ پروردگار کی یہ دو صفات یعنی ”ذو مغفرت“ اور ”شدید العقاب“ کے آثار کا تعلق خود انسان کے وجود سے ہے۔

.....

- ۱۔ ”ان تعجب فعجب قولہم“۔ اس جملے کا درحقیقت یہ معنی ہے کہ اگر تو چاہتا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں تعجب کرے تو ان کی بات پر تعجب کرو کیونکہ یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے اور ”فعجب قولہم“ دراصل جملہ شرطیہ کی جزا ہے۔
- 2۔ ”مثلاث“، مثلاً، کی جمع ہے۔ یہ بلاؤناور سزاؤں کے معنی میں ہے جو گزشتہ امتوں پر اس طرح سے نازل ہوئیں کہ ضرب المثل ہوگئیں۔

چند اہم نکات

۱۔ خلقتِ نو کے بارے میں تعجب کیوں؟ قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی مشکلات میں سے ایک مشرک قوموں کے سامنے معادِ جسمانی کے اثبات کا مسئلہ تھا کیونکہ وہ لوگ ہمیشہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کس طرح انسان مٹی ہونے کے بعد دوبارہ حیات کی طرف پلٹ آئے گا۔ یہ جو محل بحث آیات میں ہے:

ء اذ انا كنا تراباً ء انا لفي خلق جديد

کیا جب ہم مٹی ہو جائیں تو دوبارہ حیاتِ نو پائیں گے۔

ایسی تعبیرات تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قرآن کی سات دیگر آیات میں موجود ہیں، جو یہ ہیں:

مومنون -۳۵۔ مومنون ۸۲ نمل -۶۷۔ صافات -۵۳ ق ۳ اور واقعہ -۴۷

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اعتراض ان کی نگاہ میں بہت ہی اہم تھا۔ تبھی تو ہر جگہ اسی کا سہارا لیتے تھے لیکن قرآن مجید بہت ہی مختصر عبارتوں میں انہیں دو ٹوک اور قاطع جواب دیتا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف کی آیہ ۲۹ میں:

کما بداء کم تعودون

جیسا کہ ابتداء میں تمہیں پیدا کیا گیا ہے اسی طرح پھر لوٹا ئے جاؤ گے۔

چند الفاظ میں یہ ایک دندان شکن جواب ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے :

وہو اھوان علیہ

تمہاری بازگشت تو تمہارے آغاز سے بھی سادہ اور آسان ہے۔ ( روم - ۲۷ )

کیونکہ ابتداء میں تم کچھ بھی نہیں تھے لیکن اب کم از کم بوسیدہ ہڈی یا مٹی کی صورت میں تو تم موجود ہو۔ بعض مقامات پر قرآن لوگوں کو ہاتھ پکڑ کر وسیع کائنات زمین و آسمان میں عظمت قدرتِ خدا کا مشاہدہ کرواتا ہے اور رکھتا ہے : کیا وہ ذات جو یہ سب کرات ، کہکشائیں ، ثوابت اور سیارے پیدا کر سکتی ہے اس کے اعادہ پر قادر نہیں ہے (پس۔ ۸)۔

۲. کیا خدا ستمگر وں کو بخش دیتا ہے : مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ پر ور دگار لوگوں کے ظلم کے باوجود صاحبِ مغفرت و بخشش ہے۔ مسلم ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ خد اپنی عفو و بخشش ان ظالموں کے شامل حال کرتا ہے جو اپنے ظلم پر اصرار کرتے ہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ظالموں کو بھی اس وسیلے سے بازگشت اور اپنی اصلاح کا امکان فراہم کرے ورنہ دوسرے جملے میں ان کے انجام کی طرف اشارہ موجود ہے کہ ” تیرا پر ور دگار شدید العقاب ہے “

ضمناً اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہانِ کبیرہ ( کہ جن میں سے ایک ظلم ہے ) بھی قابلِ بخشش ہیں ( تمام تر شرائط کے ساتھ ) یہ آیت اور اس جیسی دیگر آیات اس غلط بات کا دو ٹوک اور قاطع جواب دیتی ہے جو قدیم زمانے سے معتزلہ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے کہ جو کہتے ہیں کہ گناہانِ کبیرہ کبھی بھی نہیں بخشے جائیں گے ۔ بہر حال پروردگار کی ” وسیع مغفرت “ اور اس کے ” شدید عقاب “ کا ذکر در حقیقت سب کو میانہ راہ پر اور خوف و رجا کے درمیان لے آتا ہے کہ جس کا اہم عامل انسان کی تربیت ہے کہ نہ بالکل رحمت الہی سے مایوس ہو جائے چاہے اس کا جرم سنگین بھی ہو اور نہ ہی کبھی اپنے آپ کو اس کی سزا سے مامون سمجھے چاہے اس کا گناہ خفیف ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے روایت ہے :

لولا عفو الله وتجاوزه ما هنا احد العیش ، ولولا وعید الله و عقابہ لاتکل کل واحد

اگر خدا کی عفو و بخشش نہ ہوتی تو زندگی پر گز کسی کے حلق میں گوارانہ ہوتی اور اگر خدائی تہدیدیں اور سزائیں نہ ہوتیں تو ہر شخص اس کی رحمت کے نام پر جو چاہتا انجام دیتا۔ 1

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ گناہ انجام دیتے ہوئے بڑے غرور سے کہتے ہیں کہ ” خد اکرم ہے “ در حقیقت انہوں نے خدا کے کرم پر بھروسہ نہیں کیا وہ جھوٹ بولتے ہیں اور اصل میں وہ پروردگار کی سزا اور عذاب سے بے اعتنائی کرتے ہیں ۔

.....

1- مجمع البیان ص ۲۷۸ جلد ۵ و ۶ زیر بحث آیت کے ذیل میں ، تفسیر قرطبی جلد ۶ ص ۳۱۴۔

سورہ رعد / 7

۷. وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ.

ترجمہ

۷۔ اور وہ جو کافر ہو گئے کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر آیت ( اور معجزہ ) کیوں نازل نہیں ہوا۔ تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر گروہ کے لئے ہدایت کرنے والا ہوتا ہے ( اور یہ تو سب بہانے ہیں نہ کہ حقیقت کی جستجو )۔

پھر بہانہ سازی

گزشتہ آیات میں کچھ اشارہ مسئلہ توحید کے متعلق کئے گئے ہیں اور ایک اشارہ مسئلہ ” معاد کی طرف کیا گیا ہے ۔ اس

کے بعد زیر بحث آیت میں ہٹ دھرم مشرکین کی طرف سے ”نبوت“ کے بارے میں ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کفار کہتے ہیں: اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں کوئی معجزہ اور نشانی نازل نہیں ہوئی (وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ)۔

واضح ہے کہ پیغمبر کی ذمہ داریوں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی حقانیت کی سند کے طور پر اور وحی الہی سے اپنے تعلق کے ثبوت میں معجزات پیش کرے اور متلاشیان حق نبوت کی دعوت میں شک و تردید کے موقع پر حق رکھتے ہیں کہ معجزے کا مطالبہ کریں لیکن اگر نبوت کے دلائل دوسرے طریقے سے آشکار اور واضح ہوں تو پھر وہ حق نہیں رکھتے لیکن ایک نکتہ کی طرف بھر پور توجہ کرنا چاہیے کہ مخالفین انبیاء ہمیشہ حسن نیت کے حامل نہیں ہوتے تھے معجزات حق معلوم کرنے کے لئے طلب نہیں کرتے تھے بلکہ ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے لئے بھی ہر وقت معجزے اور عجیب و غریب خارق عادت کا تقاضا کرتے تھے۔ ایسے معجزات کہ جنہیں ”معجزاتِ اقتراحی“ کہا جاتا ہے ہر گز کشفِ حقیقت کے لئے نہیں تھے۔ اسی لئے انبیاء ان کا تقاضا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ در حقیقت ان ہٹ دھرم کفار کا یہ خیال تھا کہ پیغمبر (ص) کا دعویٰ ہے کہ میں ہر چیز انجام دینے پر قادر ہوں اور معجزہ گر ہوں اور یہاں بیٹھا ہوں جو شخص بھی کسی معجزے کا تقاضا کرے گا وہ پیش کرودوں گا۔ لیکن انبیاء یہ حقیقت بیان کر کے ایسے لوگوں کی خواہشات ٹھکرا دیتے تھے کہ معجزات خدا کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے حکم سے انجام پاتے ہیں اور ہماری ذمہ داری لوگوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اسی لئے زیر بحث آیت میں ہے کہ خدا تعالیٰ اس گفتگو کے بعد فرماتا ہے: اے پیغمبر تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم و ملت کے لئے ہادی و رہنما ہوتا ہے

(إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ)۔

دو سوال اور ان کے جواب

۱۔ کافروں کا جواب کیسے ہوا؟ سوال پیدا ہوا کہ ”إِنَّمَا أَنْتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ“ کس طرح کافروں کی معجزہ طلبی کا جواب ہو سکتا ہے۔

جو بات مندرجہ بالا سطور میں کہی گئی ہے اس کی طرف توجہ دینے سے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر ایک ایسی شخصیت نہیں کہ ہر تقاضے، ہر مقصد اور ہر مراد کے لئے معجزہ ایجاد کر دے پہلے تو اس کی ذمہ داری ہے ”انذار“ اور انہیں ڈرانا جو بے راہ چلتے ہیں اور صراطِ مستقیم کی دعوت دینا۔ البتہ جس مقام پر انذار اور ڈرانے کی تکمیل کے لئے اور گمراہوں کی صراطِ مستقیم پر لانے کے لئے معجزے کی ضرورت ہو مسلم ہے کہ پیغمبر کوتاہی نہیں کرے گا۔ البتہ ان ہٹ دھرم لوگوں کے جواب میں ہر گز اس کی ایسی کوئی ذمہ داری نہیں جو بالکل راستے پر نہیں آتے۔

در اصل قرآن کہتا ہے کہ یہ کفار پیغمبر کی اصلی ذمہ داری بھول چکے ہیں اور وہ بے انذار، ڈرانا اور خدا کی طرف دعوت دینا اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی بنیادی ذمہ داری معجزہ دکھانا ہے۔

۲۔ ”لکل قوم ہاد“ سے کیا مراد ہے؟ کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ دونوں صفات ”منذر“ ہادی“ اور پیغمبر اکرم کی طرف لوٹتی ہیں۔ ان کے خیال میں دراصل یہ جملہ یوں ہے:

انت منذر و ہاد لکل قوم

تو ہر قوم اور ہر گروہ کے لئے ڈرانے والا اور ہادی ہے۔

لیکن یہی تفسیر مندرجہ بالا آیت کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ واؤ نے ”لکل قوم ہاد“ کو ”انما انت منذر“ سے جدا کر دیا ہے۔ ہاں البتہ اگر لفظ ”ہاد“ ”لکل قوم“ سے پہلے ہوتا تو یہ معنی پورے طور پر قابل قبول تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں مقصد یہ تھا حق کی طرف دعوت کرنے والوں کی دو قسمیں بیان کی جائیں۔ پہلی قسم ان کے دعوت کرنے والوں کی جو انذار کریں اور ڈرائیں اور دوسری قسم ان دعوت کرنے والوں کی جو ہدایت کریں۔

حتماً آپ سوال کریں گے کہ ”انذار“ اور ”ہدایت“ میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ”انذار“ اس لئے کہ گمراہی اور بے راہ روی سے راستے کی طرف پلٹا یا جائے اور صراطِ مستقیم پر پہنچایا جائے لیکن ”ہدایت“ اس لئے ہے کہ

لوگوں کو راستے پر آجانے کے بعد آگے لے جایا جائے۔

حقیقت میں ”منذر“ ”علتِ محدثہ“ یعنی ایجاد کرنے والے سبب کی طرح ہے اور ”ہادی“ ”علتِ مبقیة“ یعنی باقی رکھنے والے اور آگے لے جانے والے سبب کی مانند ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم ”رسول“ اور ”امام“ سے تعبیر کرتے

ہیں۔ رسول شریعت کی بنیاد رکھتا ہے اور امام شریعت کا محافظ اور نگہبان ہے (اس میں شک نہیں کہ دیگر مواقع پر خود ذات پیغمبر پر لفظ ”ہادی“ کا اطلاق ہوا ہے لیکن زیر بحث آیت میں ”منذر“ کے ذکر کے قرینے سے ہم سمجھتے ہیں کہ ”ہادی“ سے یہاں مراد وہ شخص ہے جو راہ پیغمبر کو جاری و ساری رکھے اور اس کی شریعت کا محافظ و نگہبان ہو۔)

متعدد روایات کہ جو پیغمبر اسلام سے مروی ہیں اور شیعہ سنی کتب میں موجود ہیں ان میں آپ نے فرمایا ہے کہ : میں منذر ہوں اور علی ہادی ہیں۔

یہ روایات مندرجہ بالا تفسیری کی مکمل طور پر تائید کرتی ہیں۔ چند ایک روایات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :

(۱) اسی آیت کے ذل میں فخر الدین رازی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں :

وضع رسول اللہ یدہ علی صدرہ فقال انا المنذر، ثم اوما الی منكب علی (ع) و قال انت الهادی بک یھتدی المھتدون من بعدی رسول اللہ نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر مارا اور فرمایا : میں منذر ہوں۔ پھر علی کے کندھے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا تو ہادی ہے اور تیرے ذریعے میرے بعد ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔ ۱

یہ روایت اہل سنت کے مشہور عالم علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسی طرح علامہ ابن صباغ مالکی نے ”فصول المہمہ“ میں ، گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں ، طبری نے اپنے تفسیر میں ، ابو حیان اندلسی نے اپنی تفسیر ”بحر المحیط“ میں ، علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح دیگر بہت سے علماء نے نقل کی ہے (۲) حموی نے جو اہل سنت کے مشہور عالم ہیں اپنی کتاب ”فرائد السمطین“ میں ابو ہریرہ اسلمی سے اس طرح نقل کرتے ہیں :

ان المراد بالھادی علی (ع)

ہادی سے مراد حضرت علی (ع) ہیں

(۳) ”حبیب السیر“ کے مولف میر غیاث الدین اپنی کتاب کی دوسری جلد ص ۱۲ پر اس طرح لکھتے ہیں :

قد ثبت بطرق متعددہ انہ لما نزل قولہ تعالیٰ ”انما انت منذر و لكل قوم ہاد“ قال لعلی ”انا المنذر و انت الهادی بک یا علی یھتدی المھتدون من بعدی“۔

متعدد طریق سے نقل ہوا ہے کہ جب آیت ”انما انت منذر و لكل قوم ہاد“ نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم نے حضرت علی (ع) سے فرمایا: ”میں منذر ہوں اور تو ہادی ہے اور میرے بعد ہدایت پانے والوں کی تیرے ذریعے ہدایت ہو گی۔“

اوسی نے ”روح المعانی“ میں ، شیلنجی نے ”نور الابصار“ میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے ”ینایع المودۃ“ میں یہی حدیث انہیں الفاظ میں یا اس کے قریب قریب الفاظ میں نقل کی ہے۔

اکثر روایات میں اس حدیث کے راوی اگرچہ ابن عباس ہیں تاہم یہ روایت ابن عباس میں منحصر نہیں ہے بلکہ حموی نے

کی نقل کے مطابق خود حضرت علی (ع) سے بھی مروی ہے ، آپ (ع) فرماتے ہیں :

المنذر النبئی و الهادی رجل من بنی ہاشم یعنی نفسہ

منذر پیغمبر ہیں ہادی بنی ہاشم میں سے ایک شخص ہے کہ اس سے مراد خود آپ کی ذات ہے۔ 2

.....

۱. تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۹ ص ۱۴۔

2. اس حدیث میں اگرچہ مسئلہ ولایت اور خلافت بلا فصل کی تصریح نہیں کی گئی تاہم اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہدایت اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے حضرت علی (ع) میں منحصر نہ تھی بلکہ تمام سچے علماء اور رسول اللہ کے خاص اصحاب یہ کام انجام دیتے تھے ، معلوم ہوتا ہے کہ ”ہادی“ کے طور پر حضرت علی (ع) کی تعارف آپ کے خاص امتیاز اور خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ آپ (ع) بہترین اور افضل ترین ہادی کے مصداق ہیں اور اس قسم کا مطلب ولایت اور خلافت پیغمبر سے جدا نہیں ہو سکتا۔

- ۸۔ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ -  
 ۹۔ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرِ الْمُتَعَالَى -  
 ۱۰۔ سَوَاءٌ مِنْكُمْ مَنْ أَسْرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ -

ترجمہ

- ۸۔ خدا ان تمام جنیوں سے آگاہ ہے جن کا ہر مادہ انسان یا مادہ جانور حامل ہے اور جسے رحم کرتے ہیں ( اور مقررہ مدت سے پہلے جنتے ہیں ) اور جسے زیادہ کرتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز کی مقدار معین ہے -  
 ۹۔ وہ غیب و شہود سے آگاہ ہے اور بزرگ و متعال ہے -  
 ۱۰۔ اسے فرق نہیں پڑتا کہ تم میں سے کچھ پنہاں گفتگو کرتے ہیں یا آشکار اور وہ جو رات کو خفیہ حرکت کرتے ہیں یا دن کی روشنی میں -

خدا کا بے پایاں علم

ان آیات میں پروردگار کی کچھ صفات بھی ہیں اور یہ آیات توحید اور معاد کی بحث کی تکمیل بھی کرتی ہیں۔ یہاں پر وردگار کے وسیع علم اور ہر چیز کے بارے میں اس کی آگاہی کے متعلق گفتگو ہے۔ وہی علم جو نظام آفرینش، عجائباتِ خلقت اور دلائل توحید کا سرچشمہ ہے۔ وہی علم جو قیامت اور اس کی عظیم عدالت کی بنیاد ہے۔ ان آیات میں علم کے دونوں پہلوؤں (نظام آفرینش کا علم اور بندوں کے اعمال کا علم) کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: خدا ان جنیوں (جو بچے شکم مادر میں ہوتے ہیں) سے آگاہ ہے کہ جنہیں ہر عورت اور ہر مادہ جانور (اپنے شکم میں) اٹھائے ہوتا ہے (اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَىٰ)۔

اور اسی طرح انہیں بھی جانتا ہے جنہیں رحم وقت مقررہ سے پہلے جن دیتے ہیں (وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ)۔  
 اور یونہی ان سے باخبر ہے جنہیں رحم وقت مقررہ سے زیادہ روک رکھتے ہیں (وَمَا تَزْدَادُ)۔  
 مندرجہ بالا تین جملوں کی تفسیر کے بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے بعض مفسرین حمل کی تین قسموں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ یعنی کبھی وقت مقررہ پر پیدا ہوتا ہے، کبھی وقت مقررہ سے پہلے (گویا درکار وقت کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے) اور کبھی وقت مقررہ کے بعد۔ خدا ان تمام کو جانتا ہے۔ وہ جنین کی تاریخ تولد اور لمحہ ولادت سے بے کم و کاست آگاہ ہے اور یہ ایسے امور میں سے ہے جسے کوئی شخص اور کوئی مشینری حتماً معین نہیں کر سکتی۔ یہ علم پروردگار کی ذات پاک سے مخصوص ہے اور اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ رحمتوں اور جنیوں کی استعداد بالکل مختلف ہوتی ہے اور کوئی شخص بھی ان اختلافات سے حتماً اور کاملاً آگاہ نہیں ہے۔

بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تین جملے حمل کی مختلف حالتوں کی طرف اشارہ ہیں۔ پہلا جملہ خود جنین کی طرف اشارہ ہے کہ رحم اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ دوسرا جملہ خونِ حُض کی طرف اشارہ ہے جو رحم میں گرتا ہے اور جنین اسے جذب کر لیتا ہے، اسے چوستا ہے اور اسے نگل لیتا ہے اور تیسرا جملہ اضافی خون کی طرف اشارہ ہے جو حمل کے دنوں میں کبھی کبھار باہر گرتا ہے یا ولادت کے وقت یا اس کے بعد رحم سے الگ ہوتا ہے۔  
 لیکن جو روایات تفسیر نور الثقلین میں اس آیت کے ذیل میں ائمہ اہل بیت (ع) سے نقل ہوئی ہیں وہ زیادہ تر اسی پہلے معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جو ہم متن میں ذکر کر چکے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں دیگر احتمالات بھی ذکر کئے گئے ہیں کہ جن میں سے کوئی بھی مختلف ہونے کے باوجود دوسرے سے متضاد نہیں ہے اور ہوسکتا ہے یہ آیت ان تمام تفاسیر کی طرف اشارہ ہو ارگ چہ ظاہری مفہوم وہی ہے جو پہلی تفسیر کے ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ لفظ ”تحمل“ جنین کے اٹھانے کا معنی دیتا ہے اور اس کے قرینہ سے ”تغیض“ اور ”تزداد“ کے الفاظ دورانِ حمل کی کمی اور بیشی کی طرف اشارہ ہیں۔

ایک حدیث جو امام محمد باقر علیہ السلام یا امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے، اس طرح

ہے:

الغیض کل حمل دون تسعة اشهر، وما تزداد کل شیء یزداد علی تسعة اشهر

”غیض“ ہر اس حمل کو کہتے ہیں جس کی مدت ۹ ماہ سے کم ہو اور ”ماتزداد“ ہر وہ چیز ہے جو ۹ ماہ سے زیادہ ہو۔

اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں :

كلمات المرأة الدم الخالص في حملها فانها تزداد و بعدد الايام التي زاد فيها في حملها من الدم  
جب عورت حمل کی حالت میں خالص خون دیکھے تو اس خون کے ایام کی تعداد کے برابر حمل کی مدت میں اضافہ ہو  
جاتا ہے۔ 3-

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے : ہر چیز خدا کے ہاں معین مقدار کی حامل ہے (وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ)۔ کہیں یہ خیال نہ ہو  
کہ مدت حمل کی یہ کمی بیشی بغیر کسی حساب کتاب کے اور بغیر کسی سبب کے ہے بلکہ اس مدت کی ہر گھڑی اور ہر  
لحظہ نیا ٹلا ہے۔

بعد والی آیت درحقیقت گزشتہ آیت میں بیان کی گئی بات کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : خدا غیب و شہود ( اور پنہاں و  
اشکار) سب کو جانتا ہے ( عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ)۔

غیب و شہود کے بارے میں اس کی آگاہی اس بناء پر کہ ”وہ بزرگ و برتر ہے ، ہر چیز کے لئے متعال ہے اور ہر چیز  
پر مسلط ہے “ اسی بناء پر وہ ہر جگہ حاضر ہے اور کوئی چیز اس کی نگاہ علم سے پوشیدہ نہیں ہے ( الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ )۔  
اس بحث کی تکمیل کے لئے اور اس کے علم کے پایاں کے بارے میں تاکید کے لئے مزید فرمایا گیا ہے ”خدا کے لئے ان  
لوگوں میں کوئی فرق نہیں کہ جو اپنی بات چھپاتے ہیں اور وہ جو آشکار کرتے ہیں وہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے ( سَوَاءٌ  
مِنْكُمْ مَنْ أَسَرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ )۔

نیز اس کے لئے ان لوگوں میں کچھ فرق نہیں کہ جو خفیہ طور پر رات کی تاریکی میں اور ظلمت کے پردوں میں قدم  
اٹھاتے ہیں اور وہ کہ جو آشکارا روز روشن میں اپنے کاروبار کے لئے نکلتے ہیں ( وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ

4-

چند اہم نکات

۱۔ قرآن اور جنین شناسی :

قرآن مجید میں بارہا جنین ، اس کے عجائب و غرائب اور نظام کی طرف توحید ، خدا شناسی اور حضرت حق کے علم  
بے پایاں کی ایک دلیل کے طور پر اشارہ ہوا ہے۔ البتہ جنین شناسی ایک بالکل نیا علم ہے۔ گزشتہ زمانے میں علماء اور  
سائنسدان جنین اور اس کے مختلف مراحل کے بارے میں بہت محدود اطلاعات رکھتے تھے لیکن علم اور سائنس کی پیش  
رفت کے ساتھ اس علم میں تیزی سے غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور اس خاموش اور بے آواز دنیا کے بہت سے اسرار و  
عجائب منکشف ہوئے ہیں اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ جنین کی خلقت ، اس کے تحول اور تکامل میں خدا شناسی کی  
ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

اس موجودہ کی کونخبر پا سکتا ہے کہ جو ہر کسی کی دسترس سے باہر ہو قرآنی الفاظ میں جو ”ظلمات ثلاث“ ( تین  
تاریکیوں ) میں موجود ہوا اور جس کی زندگی انتہائی ظریف اور دقیق ہو۔ کون اسے ضروری مقدار میں غذا بہم پہنچا سکتا  
ہے اور کون تمام مراحل میں اس کی ہدایت کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں جب خدا فرماتا ہے کہ ”خدا جانتا ہے کہ ہر مادہ جانور کے رحم میں کیا ہے“ تو اس کا یہ مفہوم نہیں  
کہ صرف اس کی جنسیت ( یعنی نر یا مادہ ہونے ) کے بارے میں آگاہ ہے بلکہ اس کی تمام مشخصات ، استعداد، ذوق اور  
طاقت کہ جو بالقوہ اس میں پوشیدہ ہے کے متعلق آگاہ ہے اور یہ وہ امور ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص کسی بھی  
ذریعے سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔

اس بناء جنین میں حساب شدہ نظاموں کی موجودگی اور دقیق و پیچیدہ ارتقاء میں اس کی راہبری ایک عالم و قدار مبداء کے  
بغیر ممکن نہیں۔

سورہ طلاق آیہ ۳ میں ہے :

قد جعل الله لكل شيء قدراً

خدا نے ہر چیز کے لئے ایک مقدار معین کی ہے

سورہ حجر آیہ ۲۱ میں ہے :

و ان كان من شيء عندنا خزائنه و ما ننزله الا بقدر معلوم

ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ایک معین مقدار کے سوا نازل نہیں کرتے۔

زیر بحث آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے :

وکل شیء عندہ بمقدار

اور تمام چیزوں کی اس کے یہاں مقدار ہے۔

یہ سب آیات اس امر کی طرف اشارہ ہیں کہ اس عالم کی کوئی چیز حساب کتاب کے بغیر نہیں ہے یہاں تک کہ طبیعی دنیا میں جن موجودات کو ہم بغیر حساب کتاب کے فرض کرتے ہیں وہ سب دقیق اور چچا تلا حساب رکھتی ہیں چاہے ہم اس سے جانیں یا نہ جانیں۔ اصولی طور پر خدا کے حکیم ہونے کا بھی اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ ہر چیز کی خلقت میں ایک پروگرام، حد اور مقدار معین ہوتی ہے۔ جن اسرارِ خلقت کو ہم نے آج علوم کے ذریعے معلوم کیا ہے وہ اس حقیقت کو پورے طور پر تاکید کرتے ہیں۔ مثلاً انسان کا خون کہ جو اس کے وجود کی زندگی کا سب سے اہم مادہ ہے اور جو تمام ضروری مواد کو انسانی بدن کے تمام خلیوں تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے، بیس سے زیادہ عناصر کا مرکب ہے ان عناصر کا تناسب اور کیفیت اس قدر مہم دقیق اور جچی تلی ہے کہ اس میں تھوڑے سے تغیر سے بھی انسانی سلامتی خطرے میں پڑجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے بدن کی خرابیوں کو پہنچانے کے لئے فوراً خون ٹیسٹ کرتے ہیں اور شوگر، چربی اور اورہ، آئرن اور دیگر اجزائے ترکیبی کا اندازہ لگا یا جاتا ہے اور ان اجزائی کمی بیشی سے فوراً بدن کی بیماریوں کے علل و اسباب معلوم کر لئے جاتے ہیں۔

ان کا خون ہی ایسی دقیق ترکیب نہیں رکھتا بلکہ یہی صورت تمام عالم ہستی کی ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھار وہ چیزیں ہم عالم ہستی کی بے نظمیوں خیال کرتے ہیں اور دراصل ہمارے علم کی نارسائی اور ناپختگی سے مربوط ہیں۔ ایک موحد اور سچا خدا پرست عالم کے بارے میں کبھی بھی ایسا تصور نہیں کر سکتا اور علوم کی تدریجی پیش رفت اسی حقیقت کی گواہ ہے۔

اس گفتگو سے ہم یہ سبق بھی سیکھ سکتے کہ انسانی معاشرہ جو پورے نظام ہستی کا ایک حصہ ہے اگر صحیح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہنیے کہ ”شیء عندہ بمقدار“ کا اصول اس کے سارے وجود پر حکمران ہو وہ ہر قسم کے افراط و تفریط سے بچے اور ہر اس کام سے پرہیز کرے جو بغیر کسی حساب کتاب کے ہو اور اسکے تمام اجتماعی اصول چچے تلے ہونے چاہئیں۔

۳۔ خدا کے لئے غیب و شہود برابر ہیں :

زیر بحث آیات میں یہ بات ذکر ہوئی ہے کہ غیب و شہود بارگاہِ خداوندی میں واضح اور روشن ہے۔ بنیادی طور پر غیب و شہود دو نسبتی مفہوم ہیں کہ جو ایسے موجود کے بارے میں استعمال ہوتے ہیں جس کا علم اور ہستی محدود ہوں۔ مثلاً ہم جو حواسِ خمسہ کے حامل ہیں تو جو کچھ ہماری آنکھوں، قوتِ سماعت اور دیگر حواس کی پہنچ کے اندر ہے وہ ہمارے ”شہود“ ہے اور جو کچھ ہماری دید و شنید سے باہر ہے ہمارے لئے وہ ”غیب“ ہے۔ فرض کیا اگر ہماری نگاہ کی قدرت لامحدود ہوتی، ہم اشیاء کے ظاہر و باطن کو دیکھ سکتے اور ذراتِ عالم کے اندر ہماری نظر اتر جاتی تو تمام چیزیں ہمارے لئے شہود“ ہو جاتیں۔ خدا کی ذات پاک کے علاوہ باقی تمام چیزیں چونکہ محدود ہیں لہذا ان تمام چیزوں کے لئے غیب و شہود موجود ہے لیکن ذاتِ الہی چونکہ لامحدود ہے اور ہر جگہ موجود ہے لہذا اس کے لئے تمام چیزیں شہود ہیں اور اس کی ذات پاک کے برے میں ”غیب“ کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

اگر ہم کہتے ہیں کہ خدا ”عالم الغیب و الشہادۃ“ ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے لئے غیب یا شہود ہے اس کے لئے یکساں اور شہود ہے۔

اگر ہم روشنی میں اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھیں تو کیا ممکن ہے کہ جو کچھ اس میں ہو ہم اس سے بے خبر رہ جائیں۔ عالم ہستی علم خدا کے سامنے اس بھی کئی درجے زیادہ واضح و آشکار ہے۔

۴۔ علم خدا کی طرف کے تربیتی آثار :

یہ جو ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھتے ہیں کہ خدا اپنی ہاں و آشکار چیزوں کو، رات اور دن کی آمد و رفت کو تمہاری تمام حرکات کو یکساں طور پر جانتا ہے اور اس کے علم کی بارگاہ میں یہ سب آشکار ہیں۔ اس حقیقت پر اگر ہم حقیقی ایمان رکھتے ہوں اور یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ہمارے اوپر ہر وقت نگران ہے تو اس سے ہماری روح، فکر، گفتار اور کردار میں ایک بہت گہرا انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام ایک سوال کیا : آپ کی زندگی کا پروگرام کیا ہے ؟ آپ نے چند امور بیان فرمانے کے بعد فرمایا :

علمت ان الله مطلع علی فاستحیبت

میرا ایک پروگرام یہ ہے کہ میں نے جان لیا ہے کہ خد امیرے تمام کاموں سے آگاہ ہے اور ان کے بارے میں باخبر ہے لہذا میں اس کی نافرمانی سے حیا کرتا ہوں۔

تاریخ اسلام میں اور حقیقی مسلمانوں کی روز مرہ زندگی میں ہم اس حقیقت کے بہت سے جلوہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک باپ بیٹا ایک باغ میں پہنچے۔ باپ باغ کے مالک کی اجازت کے بغیر پھل توڑنے کے لئے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کا بیٹا جو با معرفت نوجوان تھا کہنے لگا: ابا! نیچے اتر آؤ۔

باپ پریشان ہوا اور ڈرا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے فوراً نیچے اتر آیا۔ اس نے پوچھا: مجھے نظر نہیں آیا، کوتھا جو مجھے دیکھ رہا تھا؟ لڑکے نے کہا تمہارے اوپر سے۔

اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

بیٹے نے کہا، میری مراد خدا ہے، جو ہم سب سے مافوق اور ہم سب پر محیط ہے، کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان کے دیکھنے سے تو تمہیں خوف آتا ہے لیکن خدا جو تمہیں ہر حالت میں دیکھ رہا ہے اس سے تجھے کوئی خوف نہیں آتا۔ یہ کیا ایمان ہے۔

سورہ رعد / 11

۱۱۔ لَمْ تُعْقِبَاتُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُعَيِّرُوهُ مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَ لَهُ وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَالٍ۔

ترجمہ

۱۱۔ انسان کے لئے کچھ مامورین ہیں کہ جو پے درپے سامنے اور اس کے پیچھے سے اسے (غیر حتمی) حوادث سے محفوظ رکھتے ہیں لیکن خدا کسی قوم (اور ملت) کی سر نوشت کو نہیں بدلنا مگر یہ کہ وہ خود اسے تبدیل کریں اور جب خدا کسی قوم کے بارے میں (ان کے اعمال کی وجہ سے) بُرا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کے لئے رکاوٹ نہیں ہوتی اور خدا کے علاوہ ان کا کوئی سر پرست نہیں ہوگا۔

.....

۱۔ ”غیض“، ”غیض“ کے مادہ سے ہے۔ یہ اصل میں بہنے والی چیز کا نکل جانے اور اسے ٹھہرا لینے کے معنی میں ہے اسی لئے یہ لفظ نقصان اور فساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ”غیض“ ایسے مکان اور جگہ کو کہا جاتا ہے جس میں پانی کھڑا ہو جائے اور اسے نکل جانے ”لیلۃ غائضۃ“، تاریک رات کے معنی میں ہے (یعنی ایسی رات جو سارا نور نکل گئی ہو)۔

۲۔ تفسیر المیزان میں آیت کی اس تفسیر کی تائید کے ضمن میں صاحب تفسیر کی تائید کے ضمن میں صاحب تفسیر فرماتے ہیں کہ آئمہ اہل بیت (ع) کی بعض روایات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں اور جو کچھ ابن عباس سے نقل ہو ابے وہ بھی حتماً اسی معنی پر منطبق ہوتا ہے۔

3۔ نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۸۵۔

4۔ ”سارب“ اصل میں ”سرب“ (بر وزن ”ضرر“) کے مادہ سے ”جاری پانی“ کے معنی میں ہے۔ بعد از ان لفظ اس انسان کے بارے میں استعمال ہونے لگا جو کسی کام کے پیچھے چل رہا ہو۔

اصولی طور پر اس شخص کے لئے نور و ظلمت، تاریکی و روشنی اور غیب و شہود کوئی مفہوم نہیں رکھتے جو ہر جگہ حاضر و ناضر ہے۔ وہ یکساں طور پر ان سب سے آگاہ اور باخبر ہے۔

غیبی محافظ

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا علم الغیب و الشہادۃ ہونے کی بناء پر لوگوں کے پنہاں اور آشکار سے باخبر ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

زیر بحث آیت میں مزید اشاد فرمایا گیا ہے: اس کے علاوہ کہ خدا اپنے بندوں کا محافظ اور نگہبان ہے ”کچھ مامورین ہیں کہ جو پے در پے آگے اور پیچھے سے حوادث سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں“ (لَمْ تُعْقِبَاتُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ

يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ)۔ ۱

لیکن کوئی اس بناء پر کہ کوئی یہ اشتباہ نہ کرے کہ یہ حفاظت و نگہبانی بلا مشروط ہے اور انسان کہیں اپنے آپ کو ہر گزھے میں نہ گرا دے یا کہیں انسان ہر طرح کے گناہ کامرتکب نہ ہونے لگے اور اس طرح اپنے آپ کو عذاب کا سزا وار بنا

کر بھی توقع رکھے کہ خدا اور اس کے مامو محافظین اس کی حفاظت کریں ، مزید فرمایا گیا ہے : خداکسی قوم و ملت کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہ کرے ( إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ) دوبارہ اس لئے کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو کہ انسانی حفاظت کے مامورین ہونے کے باوجود مجازات و سزا اور خدا ئی امتحانات کا کیا معنی ہے ، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : جس وقت خدا کسی قوم کے لئے برائی کا راہہ کرتا ہے تو پھر دفاع اور بازگشت کی کوئی باگشت کی کوئی صورت نہیں ہے ( وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ )۔  
 ” اور خدا کے علاوہ ان کو کوئی والی و ناصر اور یارو مددگار نہیں ہو سکتا “ ( وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَالٍ )۔  
 اسی بناء پر جب کسی قوم کے لئے خدا کی طرف سے عذاب ، سزا اور نابودی کا فرمان صادر ہوجاتا ہے تو محافظین اور نگہبان الگ ہو جاتے ہیں اور انسان کو حوادث کے سپرد کردیتے ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ ”معقبات“ کیا ہیں ؟

جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں اور بعض میں اور بعض دوسرے بزرگ مفسرین نے کہا ہے ”معقبات“ جمع ہے ” معقبہ“ کی جب خود ” معقبہ“ بھی ” معقب“ کی جمع ہے اور یہ اس گروہ کو کہتے ہیں جس کے افراد بے در پدے ایک دوسرے کی نیابت میں کسی کا کے لئے نکلیں ۔

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے کچھ فرشتوں کی یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ رات دن باری انسان کے پاس آئیں اور آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت کریں ۔

بیشک انسان اپنی زندگی میں بہت سی آفات و بلیات سے دوچار ہے ۔ اندرونی و بیرونی حوادث ، طرح طرح کی بیماریاں ، جرائم اور مختلف قسم کے حادثات و خطرات کہ جو زمین و آسمان سے ابھر تے ہیں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں ۔ خصوصاً بچپن کے زمانے میں جب گردو پیش کی کیفیتوں سے انسان بہت کم آگاہ ہوتا ہے ، اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا، ہر قدم پر اسے کوئی نہ کوئی خطرہ در پیش ہوتا ہے او رکبھی تو انسان تعجب کرتا ہے کہ ان تمام حوادث سے بچہ طرح بچ نکلتا ہے اور بڑا ہو جاتا ہے خصوصاً ایسے گھر انوں میں جہاں ماں باپ مسائل سے بالکل آگاہ بھی نہیں ہوتے یا ان کے پاس وسائل نہیں ہوتے ۔ خاص طور پر دیہات میں پلنے بڑھنے والے وہ بچے جو محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں اور بیماری اور خطرات کے عوامل میں گھرے ہوتے ہیں ۔

اگر ان مسائل پر ہم حقیقی طور پر غور و فکر کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ ایک محافظ طاقت ہے کہ جو ان حوادث سے ہماری حفاظت کرتی ہے اور سپرد اور ڈھال کی طرح آگے اور پیچھے سے ہماری محافظ و نگہبان ہے ۔ بہت سے مواقع پر انسان کو خطر ناک حادثات پیش آتے ہیں اور وہ معجزانہ طور پر ان سے بچ نکلتا ہے اس طرح سے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سب چیزیں اتفاقی نہیں ہیں کہ بلکہ ایک محافظ طاقت اس کی نگہبانی کر رہی ہے ۔ پیشوا بیان ۔ اسلام سے مروی بہت سی روایات بھی اس پر تاکید کرتی ہیں ۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ زیر ۔ بحث آیت کی تفسیر میں آپ (ع) نے فرمایا :

بحفظ بامر الله من ان يقع في ركي عليه حائط او يصيبه شيء حتى اذا جاء القدر خلو بينه وبين يدفعونه الي المقادير و هما ملكان يحفظانه بالليل و ملكان من نهار يتعاقبانہ

حکم خدا سے انسان کی حفاظت ہوتی ہے ، کنوئیں میں گرنے سے یا دیوار پر آہڑنے سے یا کوئی اور حادثہ سے مگر جب حتمی مقدرات آپہنچیں تو محافظین ایک طرف ہا جاتے ہیں اور اسے حوادث کے سپرد کردیتے ہیں ۔ اور دو فرشتے انسان کی رات کو حفاظت کرتے ہیں اور ( ان کے علاوہ ) فرشتے دن کے وقت باری باری ذمہ داری پوری کرتے ہیں ۔ 2  
 ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

مامن عبد الا و معہ ملكان يحفظانه فاذا جاء الامر من عند الله خليا بينه وبين امر الله  
 کوئی بھی ایسا بندہ نہیں کہ جس کے ساتھ دو فرشتے نہ ہوں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہوں لیکن جب خدا کا قطعی فرمان آپہنچا ہے تو وہ اسے حوادث کے سپرد کردیتے ہیں ۔ 3-

(اس بناء پر وہ انسان کی حفاظت صرف ان حوادث سے کرتے ہیں جن کے بارے میں خدا کا قطعی حکم نہیں ہوتا )۔

نہج البلاغہ میں بھی حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا :

ان مع كل انسان ملكين يحفظانه فاذا جاء القدر خليا بينه وبينه

یعنی ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں کہ جو اس کی حفاظت کرتے ہیں لیکن جب حتمی مقدرات آپہنچے تو وہ اسے

چھوڑ دیتے ہیں ۔ 4

اسی طرح نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں فرشتوں کی تعریف اور ان کے مختلف گروہوں کے بارے میں ہے :  
و منهم الحفظة لعباده

ان میں سے ایک گروہ خدا کے بندوں کا محافظ ہے ۔

البتہ حسنی ذرائع سے یا طبعی علوم کے ذریعے ان فرشتوں کے وجود کے بارے میں عدم آگاہی ان کے وجود کی نفی کی دلیل نہیں ہو سکتی اور یہ بات زیر بحث آیت میں منحصر نہیں ہے بلکہ قرآن مجید اور اسی طرح دیگر مذاہب بہت سے ایسے امور کی خبر دیتے ہیں جو حسّ انسانی سے ماوراء ہیں کہ جن کے بارے میں انسان عام ذرائع سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا ۔

اس سے قطع نظر جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے کہ ہماری روز مرہ کی زندگی میں ہمیں اس محافظ قوت کی واضح نشانیاں نظر آتی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ بہت سے تباہ کن حوادث سے ہم معجزانہ طور پر نجات حاصل کرتے ہیں کہ جن کی تفسیر عام طریقے سے نہیں ہو سکتی یا جنہیں اتفاق قرار دینا مشکل ہے ۔  
خود راقم نے اپنی زندگی میں اس کے نمونے دیکھے ہیں کہ جو یقیناً حیرت انگیز ہیں کہ جو مجھ جیسے جلدی یقین نہ کرنے والے شخص کے لئے بھی غیر مرئی محافظ کے وجود کے لئے دلیل تھے ۔

۲۔ تبدیلی ہمیشہ خود ہمارے ہاتھوں سے آتی ہے :

”ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم“ یہ جمہ قرآن میں دو مواقع پر مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے اس میں ایک عمومی اور کلی قانون بیان کیا گیا ہے ۔ یہ ایک حیات ساز ، انقلاب آفرین ، اور خبر دار اور ہوشیار کرنے والا قانون ہے ۔ یہ قانون اسلام میں جہاں بینی اور معاشرہ شناسی کی بنیاد ہے ..... یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ تمہاری تقدیر پر چیز اور ہر شخص سے پہلے خود تمہارے ہاتھوں میں ہے اور قوموں کی خوش بختی و بد بختی کے سلسلے میں تبدیلی اور تغیر پہلے درجے میں خود انہی سے وابستہ ہے ۔ قسمت ، اقبال اتفاقات اور اوضاع فلکی کی تاثیر و غیرہ کوئی بھی بنیاد نہیں رکھتی ۔ اساس و بیاد یہی ہے کہ ہر شخص خود چاہے تو سر بلند اور کامیاب ہو یا اس کے علاوہ خود چاہے تو اپنے آپ کو ذلت ، زبوں حالی اور شکست کے سپرد کر دے ۔ یہاں تک کہ لطف الہی کسی ملت پر بغیر کسی مقدمہ اور تمہید کے نہیں آتا ۔ بلکہ یہ ملتوں کا اپنا ارادہ ، خواہش اور ان کے اندر وئی تغیرات ہیں کہ جو انہیں لطف خدا یا عذاب خدا کا مستحق بنا تے ہیں ۔

دوسرے لفظوں میں اسلام اجتماعی پروگرام کے ایک اہم ترین گوشے سے آگاہ کرنے والا یہ قانون ہم سے کہتا ہے کہ ہر قسم کے بیرانی تغیرات اور تبدیلیاں ملتوں اور قوموں کے اندرونی تغیرات پر منحصر ہوتی ہیں اور کسی قوم کو پیش آنے پر قسم کی فتح و شکست کا سر چشمہ اس کے اندر ہو تا ہے ۔ لہذا وہ لوگ کہ جو اپنا دامن بچانے کے لئے ہر وقت ” بیرونی عوامل “ کے پیچھے پھرتے ہیں اور ہمیشہ اقتدار پرست اور استعماری طاقتوں کو اپنی بد بختی کا عامل شمار کرتے ہیں بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ اگر کسی معاشرے کے اندر ان جہنمی طاقتوں کو کوئی مرکز حاصل نہ ہو تو یہ کچھ بھی نہیں کر سکتیں ۔

اہم بات یہ ہے کہ ان توسیع پسندوں ، استعماری قوتوں اور سپرد طاقتوں کی چھاؤنیاں اور مراکز اپنے معاشرے سے در ہم برہم کر دیں اور ان کی سر کوبی کریں تاکہ ان کے لئے نفوذ کی کوئی راہ ہی باقی نہ رہے ۔  
یہ طاقتیں شیطان کی مانند ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے بقول شیطان ان لوگوں پر دسترس حاصل نہیں کر سکتا جو ” عباد مخلصین “ ہیں ۔ وہ صرف ان لوگوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے جنہوں نے اپنے وجود کے اندر شیطان کے لئے کوئی جگہ بنا رکھی ہے ۔

قرآن کی اس بنیادی تعلیم کا تقاضا ہے کہ بد بختیوں اور ناکامیوں کو ختم کرنے کے لئے اندرونی انقلاب کی طرف بڑھیں ۔ ایک فکری اور ثقافتی انقلاب کی طرف ، ایک ایمانی اور اخلاقی انقلاب کی طرف ۔ بد بختیوں کے چنگل میں گرفتاری کے وقت اپنے کمزور پہلوؤں کو فوراً تلاش کرنا چاہیے ۔ ہمیں اپنی روح سے کمزوری کے داغ توبہ اور رحق کی طرف باز گشت کے پانی سے دھونے چاہئیں ۔ اس طرح ہم ایک نیا جنم لیں گے ، نیا نور بصیرت ملے گا اور نئی طاقت حرکت پیدا ہو گی اور اس کے ذریعے ہم اپنی ناکامیوں اور شکستوں کو کامیابی میں بدل سکتے ہیں ۔ یہ کامیابی اس طرح سے ممکن نہیں کہ ہم اپنے کمزور پہلوؤں کو خود خواہی اور خود غرضی کے پردوں میں چھپا دیں اور عوامل شکست کو اپنے معاشرے کے باہر سے تلاش کرتے پھریں ۔

پہلے مسلمانوں کی فتح و کامرانی اور رعبد والے مسلمانوں کی شکست کے عوامل پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ ان میں سے بہت سی مباحث سنگلاخ زمین پر بل چلانے اور بے سمت چلنے کے مترادف ہیں ۔ ہمیں چاہیے کہ کامیابی

اور ناکامی کے عوامل خود مسلمانوں کے فکری ، اعتقادی اور اخلاقی تغیرات میں تلاش کریں ۔ خود مسلمانوں کی عملی زندگی کا مطالعہ کریں نہ کہ اس سے ہٹ کر ۔

دور حاضر کے انقلابات کہ جن میں سے ایک ہماری ملت کا انقلاب ہے اسی طرح اگر ہم الجزائر ، افغانستان اور دیگر مقامات کی انقلابی جد و جہد کا مطالعہ کریں تو ہم ان میں واضح طور پر اس قرآنی اصل کی حاکمیت کا مشاہدہ کریں گے۔ یعنی ... سامراجی حکومتوں اور تو سب سے پسند طاقتوں نے تو اپنی روش نہیں بدلی لیکن جب ہم اندر سے تبدیل ہو گئے تو ہر چیز بدل گئی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ صرف وہی رہبر اور قائد کا میاب ہوئے ہیں کہ جنہوں نے اس بنیادی قانون کے مطابق اپنی ملت کی رہبری کی ہے اور اس میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے ۔

تاریخ اسلام اور دور حاضر کی تاریخ اس اساسی و بنیادی اور جاو دانی و دائمی قانون کی صداقت کے شواہد سے بھری پڑی ہے کہ جن کے تفصیلی ذکر سے ہماری بحث ہمیں اس تفسیر کی روش سے دور لے جائے گی ۔

### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ رعد / 12 تا 15

- ۱۲۔ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ.
- ۱۳۔ وَيَسْبِغُ الرَّعْدَ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ.
- ۱۴۔ لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطٍ كَفْتِهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ.
- ۱۵۔ وَاللَّهُ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۔

ترجمہ

- ۱۲۔ وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھا تا ہے کہ جو خوف کا بھی باعث ہے اور امید کا بھی نیزہ وہ بوجھل بادہ پیدا کرتا ہے ۔
- ۱۳۔ اور گرج اس کی تسبیح اور حمد کرتی ہے اور فرشتے (بھی) اس کے خوف سے (مشغول تسبیح ہیں) اور وہ صاعقہ بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس میں گرفتار کرتا ہے حالانکہ وہ (خدا کی ان آیات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود) خدا کے بارے میں مجادلہ میں مشغول ہیں اور اس کی قدرت لامتناہی (اور عذاب درناک) ہے ۔
- ۱۴۔ حق کی دعوت اس کی طرف سے ہے اور جو (مشرک) لوگ غیر خدا کو پکار تے ہیں ان کی پکار کا وہ کوئی جواب نہیں دیتے یہ لوگ اس شخص کی طرح ہیں جو پانی کی طرف اپنی ہتھیلیاں کھولتا ہے تاکہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن وہ کبھی نہیں پہنچے گا اور کافروں کا پکار ضلالت (اور گمراہی) کے سوال کچھ نہیں
- ۱۵۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً یا کرہاً خدا کے لئے سجدہ ریز ہے ۔ اسی طرح دن رات ان کے سائے بھی (سجدہ گزار ہیں) ۔

- ۱۔ مفسرین میں اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ ”لہ“ کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے ۔ مشہور تفسیر یہی ہے کہ یہ انسان کی طرف لوٹتی ہے جس کی طرف قبل کی آیت میں اشارہ ہوا ہے ۔ بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ یہ پیغمبر یا خدا کی طرف لوٹتی ہے لیکن یہ احتمال ذیل کی آیت سے مناسبت نہیں رکھتا (غور کیجئے گا)
- 2۔ تفسیر بر بان جلد ۲ ص ۳۸۳۔
- 3۔ تفسیر بر بان جلد ۲ ص ۳۸۳۔

عظمت الہی کی کچھ نشانیاں

قرآن یہاں ایک مرتبہ پھر آیات توحید ، عظمت پر وردگار کی نشانیاں اور اسرار آفرینش بیان کر رہا ہے ۔ عالم طبیعت میں نمودار ہونے والی مختلف قدرتوں کی نشاندہی کی گئی ہے نیز ان کے اسرار کی طرف مختصر اور پر معنی اشارے کرتے ہوئے خدا سے بندوں کو زیادہ قریب کر کے ان دلوں پر ایمان و معرفت کی نور پاشی کی گئی ہے ۔ پہلے ( بادلوں میں پیدا ہونے والی ) بجلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : وہ وہی ہے جو تمہیں وہ بجلی دکھا تا ہے جو خوف او رامید کاباعث ہے

( هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا ) ۔

ایک طرف تو اس کی شعاع درخشاں آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور رع د دار آواز جو اس سے اٹھتی ہے بعض اوقات تمہیں وحشت زدہ کر دیتی ہے ۔ اس سے جو آتش سوزی کے خطرات پیدا ہوتے ہیں وہ خوف و اضطراب پیدا کر دیتا ہے خصوصاً جو لوگ بیابانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں بیابانوں سے گزریے ہوتے ہیں انہیں اس سے بہت وحشت آتی ہے ۔ دوسری طرف عموماً چونکہ ساتھ ساتھ موٹے قطروں کی بارش بھی ہوتی ہے جو بیابانوں کے تشنہ کاموں اور پیاسوں کو خوشگوار پانی بخشتی ہے اور اس سے درخت اور زراعت سیراب ہوتے ہیں لہذا اس سے ان کے دل میں ایک امید بھی پیدا ہوتی ہے اور یوں وہ خوف و امید کے حصاس لمحے گزارتے ہیں ۔ اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے : وہ وہی ہے جو بوجھل اور پر بار بادل پیدا کرتا ہے کہ جو پیاسی زمینوں کی آبیاری کر سکتے ہیں (وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثَّقَالَ) ۔

رعد و برق کی برکتیں

ہم جانتے ہیں کہ سائنسی لحاظ سے برق اس طرح سے پیدا ہوتی ہے کہ بادل کے دو ٹکڑے مختلف بجلی کے لحاظ سے (مثبت اور منفی پول کی صورت میں) ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ان سے بالکل اس طرح سے کرنٹ پیدا ہوتا ہے جیسے بجلی کے دو تار جن میں مختلف (مثبت اور منفی فیز (Phase) کی بجلی آرہی ہو جب ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو بہت زیادہ کرنٹ پیدا ہوتا ہے اور اصطلاح کے مطابق ہو جاتے ہیں ۔ تاروں کے دو سے جب آپس میں ملتے ہیں تو ہمارے سامنے معمولی سا کرنٹ اور شعلہ پیدا ہوتا ہے اور ایک ہلکی سے آواز بھی پیدا ہوتی ہے جب کہ آسمانی بجلی کے ساتھ بادلوں کی وسعت کے اعتبار سے الیکٹریک ڈسچارج شدید ہوتا ہے کہ اس سے ”رعد“ اور گرج پیدا ہوتی ہے۔

بادل کا ٹکڑا جو مثبت رو ہوتی ہے جب زمین کے نزدیک ہو جائے کہ جس میں ہمیشہ منفی رو ہوتی تو زمین اور بادل کے درمیان کرنٹ پیدا ہو جاتا ہے جسے ”صاعقہ“ کہتے ہیں ۔ یہ برقی رو اس نے خطر ناک ہوتی ہے کہ اس کا ایک سر زمین کے بلند مقامات پر تے ہیں ۔ اصطلاح کے مطابق یہ بلند جگہیں منفی رو کی حامل تار کے سرے یا نوک میں بدل جاتی ہیں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ کسی بیابان میں ایک انسان عملی طور پر اس منفی تار کی نوک میں بدل جائے اور بہت وحشت ناک کرنٹ اس کے سر پر آگرے اور مختصر سے لمحہ میں وہ خاکستر ہو جائے ۔ لہذا بیابانوں میں رعد اور برق کے موقع پر فوراً درخت ، دیوار یا پہاڑ کے دامن میں یا کسی اونچی جگہ کی اوٹ میں پناہ لے لینا چاہئیے یا کسی گھرے میں لیٹ جانا چاہئیے ۔

بہر حال برق جو شاید بعض کی نگاہ میں عالم طبیعت کی شوخی ہے موجودہ سائنسی انکشافات سے ثابت ہوا ہے کہ اس کے بہت سے فوائد و برکات ہیں ۔ ذیل میں ہم ان فوائد کے تین پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

۱۔ آبیاری : بجلیاں عموماً بہت زیادہ حرارت پیدا کرتی ہیں جو بعض اوقات تقریباً ۱۵ / ہزار سنتی گریڈ ہوتی ہے ۔ یہ حرارت اس مقصد کے لئے کافی ہوتی ہے کہ اطراف کی زیادہ تر ہوا کو جلادے اور اس کے نتیجہ میں فوراً ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کم دباؤ کی صورت میں ہی بادل برستے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بجلی چمکنے اور گرنے کے بعد ہی اولے پڑنے شروع ہوجاتے ہیں اور بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگتے ہیں ۔ اس بناء پر در حقیقت بجلی کی ایک ذمہ داری آبیاری ہے ۔

۲۔ جرائم پرسم پاشی : جس وقت بر جلی اپنی اس حرارت کے ساتھ چمکتی ہے تو بارش کے قطرات اضافی آکسیجن کی

مقدار میں ترکیب ہوتے ہیں اور یہ بھاری پانی یعنی ہائیڈروجن پر آکسائیڈ پیدا کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ بھاری پانی کے آثار میں سے ایک یہ ہے وہ جراثیم کش ہوتا ہے۔ اسی بناء پر طبی مصارف میں اسے زخموں کو دھونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بھاری پانی کے یہ قطرات جس وقت زمین پر برستے ہیں تو بناتاتی بیماریوں کے جراثیم ختم کر دیتے ہیں۔ گویا پانی جراثیم پر خوب سم پاشی کرتا ہے۔ اسی بناء پر ماہرین نے کہا ہے کہ جس سال رعد و برکم ہو بناتاتی آفات اور بیماریاں زیاد ہوتی ہیں۔

۳۔ تغذیہ اور کھاد رسائی: بجلی، شدید حرارت اور کیمیائی ترکیب سے بارش کے قطرے کاربانک اسید<sup>۱</sup> (H2CO3 CARBONIC ACID) ہے رنگ و بو بھاپ جو کچھ ترش مزہ ہوتی ہے طب میں ہاضمے کی تقویت کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ (مترجم)

کی حالت اختیار کر لیتے ہیں یہ جب زمینوں پر چھڑکے جاتے ہیں، تو کیمیائی اثرات کی بدولت نباتات کے لئے ایک موثر کھا دکا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح سے نباتات کو غذا ملتی ہے۔

بعض ماہرین کے مطابق آسمانی بجلیوں کے ذریعے کرہ زمین کو سال بھر میں ملنے والی کھاد سینکڑوں لاکھ ٹن ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ پاؤں کے نیچے روندی جانے والی بظاہر ایک بے خاصیت چیز کس قدر پر بار اور رپر برکت ہے آبیاری بھی کرتی ہے، جراثیم پر رسم پاشی بھی کرتی ہے اور غذا بھی بنتی ہے۔ یہ عالم ہستی کے عجیب و غریب اور وسیع و عریض اسرار میں خدا شناسی کی طرف واضح راہنمائی کرنے والا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ یہ سب ایک طرف بجلی کی برکات ہیں اور دوسری طرف یہ آتش سوزاں کو بھی وجود دیتی ہے کہ جس کی ایک قسم ”صاعقہ“ ہے۔ یہ بجلی ہوسکتا ہے ایک یا کئی انسانوں کو یا درکتوں کو جلا ڈالے۔ یہ چیز اگر کم اور ناد رہے اور اس سے بچا بھی جا سکتا ہے تاہم خوف و ہراس کا عامل بن سکتی ہے۔ اس طرح سے یہ جو ہم نے آیت بالا میں پڑھا کہ برق خوف کا سبب بھی ہے اور امید کا بھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان تمام امور کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جملہ ”وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثَّقَالَ“ جو مندرجہ بالا آیت کے آخر میں آیا ہے وہ بجلی کی اسی خاصیت کے ساتھ مربوط ہو کہ جو بادلوں کی بارش کے انہی بھری ہوئی پشت والے قطروں سے بوجھل کرتی ہے۔ بعد والی آیت میں ”رعد“ کی آواز کا ذکر ہے کہ جو برق سے جدا نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے: رعد خدا کی تسبیح اور حمد کرتی ہے“ (وَيَسْبُحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ)۔

جی ہاں! عالم طبیعت کی یہ سخت آواز کہ جو بڑی آواز کے لئے ضرب المثل ہے چونکہ بجلی سے منسلک ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کو پورا کرتی ہیں اور بہت اہم اور سوچی سمجھی خدمات انجام دیتی ہیں کہ جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے عملی طور پر خدا کی تسبیح کرتی ہیں دوسری طرف ”رعد“ ”برق“ کی زبان۔ گویا ہے جو نظام آفرینش اور عظمت خلق کی ترجمانی کرتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے جسے ”زبان حال“ کہتے ہیں۔ ایک جامع کتاب، ایک قصیدہ، گرا، ایک خوبصورت اور دل انگیز مصوری کا نمونہ اور ایک مستحکم و منظم عمارت سب اپنی زبان حل سے اپنے لکھنے والے، کہنے والے، نقاش اور معمار کے علم و دانش اور ذوق و مہارت کی بات کرتے ہیں اور انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

اس عالم ہستی کا ہر ذرہ اسرار آمیز ہے اور بہت ہی دقیق اور حساب شدہ نظام رکھتا ہے۔ سب ذرات کائنات خدا پاکیزگی اور ہر قسم کے نقص و عیب سے اس کے منزہ ہونے کی حکایت کرتے ہیں (کیا ”تسبیح“ تنزیہ اور پاک جانتے کے علاوہ کچھ اور ہے؟) اور سب کے سب اس کی قدرت اور علم و حکمت کی خبر دیتے ہیں (کیا ”حمد“ صفات کمال بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟) ۱

فلاسفہ کی ایک جماعت نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس جہان کے تمام ذرات میں سے ہر ایک ایک قسم کا عقل و شعور رکھتا ہے اور اسی عقل و شعور کی بناء پر خدا کی تسبیح و تقدیس کرتا ہے نہ صرف زبان حال سے اور اپنے وجود سے کہ وجود خدا کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ زبان قال سے بھی اس کی تعریف کرتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ صدائے رعد اور عالم مادہ کے دیگر اجزاء اس کی تسبیح کرتے ہیں بلکہ ”تمام فرشتے بھی خدا کے خوف و خشیت سے اس کی تسبیح میں مشغول ہیں“ (وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ)۔ ۲

وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں فرمان، خدا پر عمل کرنے میں اور نظام ہستی کے بارے میں عائد شدہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے اور اس طرح کہیں وہ عذاب الہی میں گرفتار نہ ہوجائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جواحساس، مسئولیت رکھتے ہیں ان کے لئے ذمہ داریاں خوف کا باعث ہوتی ہیں ایک اصلاحی خوف کو جو انسان کو سعی و کاوش اور تحریک پر آمادہ کرتا اور ابھارتا ہے۔

”رعد و برق“ کے بارے میں مزید وضاحت کے لئے ”صواعق“ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خد اصواعق کو بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان کے ذریعے تکلیف پہنچاتا ہے (وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ)۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود عالم آفرینش، وسیع آسمان و زمین، نباتات، رعد و برق اور اس طرح کی دیگر چیزوں میں عظمتِ الہی کی آیات دیکھنے کے باوجود حوادثِ یہاں تک کہ ایک آسمانی شعلے کے سامنے انسانی طاقت بے بسی کا مشاہدہ کرنے کے باوجود بے خبروں کا ایک گروہ خدا کے بارے میں مجادلہ اور رجنگ کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے (وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ)۔

حالانکہ خدا کی قدرت لامتناہی ہے، اس کا عذاب دردناک ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ہے (وَهُوَ شَدِيدُ الْمَحَالِ)۔ ”محال“ اصل میں ”حیلہ“ سے ہے اور ”حیلہ“ ہر قسم کی مخفی اور پنہان چارہ اندیشی کے معنی میں ہے (غلط کو ششوں اور چارہ جوئیوں کے معنی میں نہیں کہ جس میں یہ لفظ فارسی زبان میں مشہور ہو چکا ہے)۔ یہ بات مسلم ہے کہ جو چارہ جوئی پر بہت زیادہ قدرت رکھتا ہے وہ وہی ہے جو قدرت کے لحاظ سے بھی غیر معمولی ہے اور علم و حکمت کے لحاظ سے بھی اور اس بناء پر وہ اپنے دشمنوں پر مسلط اور کامیاب ہوتا ہے اور کسی کو اس کے مرکزِ قدرت سے نکل بھاگنے کا یارا نہیں ہے اسی لئے مفسرین نے ہر ایک نے ”شدید المحال“ کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ سب نے اس کے مفہوم کی بنیاد مذکورہ معنی کو قرار دیا ہے۔ بعض نے اسے ”شدید القوة“، بعض نے ”شدید العذاب“، بعض نے ”شدید القدرة“ اور بعض نے ”شدید الاخذ“ کے معنی میں اور اس جیسے الفاظ میں اس کی تفسیر کی ہے۔ 3۔

زیر بحث آخری آیت دو مطالب کی طرف اشارہ کرتی ہے:- پہلا یہ کہ ”دعوتِ حق (اور حقیقی دعا)“ (لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ)۔ یعنی جس وقت ہم اسے پکاریں تو وہ سنتا ہے اور ہماری پکار کا جواب دیتا ہے اور وہ بندوں کی دعا سے آگاہی بھی رکھتا ہے اور ان کی آرزوؤں کو پورا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اس لئے اسے پکارنا اور اس کی مقدس ذات سے تقاضا کرنا حق ہے نہ کہ باطل اور بے بنیاد۔ دوسرا یہ ہے کہ بتوں کو پکارنا اور ان سے درخواست اور دعا کرنا دعائے باطل ہے کیونکہ ”جن لوگوں کو مشرکین خدا کے علاوہ پکارتے ہیں اور اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے حق کا سہارا لیتے ہیں وہ ہر گز انہیں جواب نہیں دیں گے اور ان کی دعا قبول نہیں کریں گے“ (وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَآ يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ)۔ جی ہاں باطل کو پکارنا ایسا ہی ہے کیونکہ وہ خیالی تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور بتوں کے لئے وہ جیسے بھی علم و قدرت کے قائل ہوں سب موبوم، بے پایہ اور بے اساس ہے۔ کیا عینیت، واقعیت اور مایہ خیر و برکت کے سوا ”حق“ کچھ اور ہے اور خیال، توہم اور مایہ شروفساد کے سوا ”باطل“ کچھ اور ہے۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآن کی روش ہے اس عقلی بات کو ثابت کرنے کے لئے وہ ایک خوبصورت حسی اور رسا مثال پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ کہ جو غیر خدا کو پکارتے ہیں، اس شخص کی طرح ہیں جو ایسے پانی کے کنارے بیٹھا ہو جس کی سطح اس کے دسترس میں نہ ہو اور وہ اس امید سے پانی کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ وہ اس کے دہن میں پہنچ جائے حالانکہ وہ ہر گز نہیں پہنچے گا۔ یہ کیسا بے ہودہ اور فضول خواب و خیال ہے (إِلَّا كَبَاسِطٍ كَفَيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ)۔

کیا کنویں کے کنارے بیٹھ کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر، اشارہ سے پانی منہ تک پہنچا یا جا سکتا ہے؟ ایسا کام کسی دیوانے اور سادہ لوح شخص کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ مذکورہ جملہ کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ بت پرستوں کو ایک شخص سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پوری طرح کھول کر افقی شکل میں پانی داخل کرتا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ پانی اس کے ہاتھ میں ٹھہر جائے حالانکہ پانی سے نکلتے ہی پانی کے قطرے انگلیوں کی طرف سے نکل جائیں گے اور کچھ باقی نہیں رہے گا۔ مفسرین نے اس جملے کے لئے ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی ہے اور وہ یہ کہ بت پرست جو اپنی مشکلات کے حل کے لئے بتوں کے پاس جاتے ہیں اس شخص کی طرح ہیں جو چاہتا ہے کہ پانی اپنی مٹھی میں بند رکھے۔ کیا کبھی پانی کو مٹھی میں بند رکھا جاسکتا ہے، یہ بات عربوں میں مشہور ضرب المثل سے لی گئی ہے کہ جب وہ اس شخص کے لئے کوئی مثال ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ جو بے ہودہ اور فضول کو شش کرتا ہے تو کہتے ہیں:

”هو كقايض الماء باليد“  
وہ اس شخص کی طرح ہے جو پانی کو ہاتھ سے پکڑنا چاہتا ہے۔  
ایک عرب شاعر کہتا ہے:

فاصبحت فيماكان بيني وبينها من الود مثل قايض الماء باليد

میری حالت تو یہ ہو گئی کہ میں اپنے اور اس کے درمیان محبت برقرار رکھنے کے لئے اس شخص کو طرح ہو گیا کہ جو پانی کو ہاتھ میں روک رکھے۔ 4

آیت کے آخر میں اس بات کی تاکید کے لئے قرآن کہتا ہے : کافروں کابتون سے دعا اور درخواست کرنا گمراہی میں قدم اٹھانے کے علاوہ کچھ نہیں ( وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ) ۔

اس سے بڑھ کر کیا گمراہی ہوسکتی ہے کہ انسان اس راستے میں اپنی کاوشیں صرف کرے کہ جو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا اور اس راستے میں وہ اپنے آپ کو خستہ و بے حال کر دے لیکن اسے کوئی نتیجہ اور فائدہ حاصل نہ ہو۔ زیر بحث آخری آیت میں یہ نشاندہی کرنے کے لئے کہ بت پرست عالم ہستی کے کارواں سے کس طرح الگ ہو گئے ہیں اور تنہا بے راہ روی میں سرگرداں ہیں فرمایا گیا ہے : آسمانوں اور زمین کے تمام رہنے والے اطاعت و تسلیم سے یا کراہت و ناپسندیدگی سے سر بسجود ہیں اور اسی طرح ان کے سائے بھی صبح و شام سجدہ ریز ہیں ( وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَظُلْمًا لَهُمْ بِالْعُدْوَةِ وَالْأَصَالِ ) ۔

.....

۱۔ ”تسبیح و تقدیس“ کہ جو مودات کرتی ہیں کے بارے میں مزید وضاحت انشا اللہ ” وان من شیء الا یسبح بحمده لکن لا تفقہون تسبیحہم “ ( بنی اسرائیل ۴۴ ) کے ذیل میں آئے گی ۔

۲۔ شیخ طوسی تبیان میں فرماتے ہیں : ”خفیة“ اور ”خوف“ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ”خفیة“ حالت کو بیان کرتا ہے اور ”خوف“ مصدر ہے ۔ یعنی پہلا حالت خوف کے معنی میں ہے اور دوسرا ڈرنے کے معنی میں ہے ۔

۳۔ بعض ”محال“ کو ”حیلة“ کے مادہ سے نہیں سمجھتے بلکہ ”محل“ اور ”ماحل“ کے مادہ سے قرار دیتے ہیں کہ جو مکر و جدال اور عذاب دینے اور سزا دینے کے لئے عزم و صمیم کرنے کے معنی سے لیا گیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے تین میں کہا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اگرچہ دونوں معانی قریب الاقرب ہیں ۔

4۔ تفسیر قرطبی جلد ۵، ص ۳۵۲۹۔

چند اہم نکات

۱۔ موجودات کے سجدہ کرنے سے کیا مرد ہے :

ایسے مواقع پر سجدہ خضوع و خشوع ، انتہائی قسم کی تواضع و انکساری اور سر تسلیم خم کرنے کے معنی میں ہے یعنی تمام فرشتے ، انسان اور سب صاحبان عقل و فکر خدا کے سامنے متواضع ہیں لیکن کچھ مخلوقات سجدہ ، تکوینی کے علاوہ سجدہ تشریحی کی بھی حامل ہیں ۔

سجدہ تشریحی یعنی اپنے ارادے اور رضا و رغبت سے کئے جانے والے سجدے ۔

جب سجدہ تکوینی کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی مخلوق موت و حیات ، نشو و تکامل اور سلامتی و بیماری وغیرہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے تو تسلیم و خضوع کی یہ حالت درحقیقت قوانین آفرینش کے لئے ان کی طرف سے ایک قسم کا سجدہ تکوینی ہے ۔

۲۔ طوعاً و کرہاً سے کیا مراد :

ہو سکتا ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ مومنین بارگاہ پروردگار میں رضا و رغبت سے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کے سامنے خضوع کرتے ہیں لیکن غیر مومنین اگرچہ ایسے سجدے کے لئے تیار نہیں ہیں تاہم ان کے وجود کے تمام ذرات قوانین آفرینش کے پیش نظر فرمان خدا کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں ، وہ چاہیں یا نہ چاہیں ۔

ضمناً توجہ رہے کہ ”کرہ“ ( بر وزن ”جرم“ ) اس کراہت کے معنی میں ہے جس کا سرچشمہ انسان کا اندر اور باطن ہے اور ”کرہ“ ( بروزن ”شرح“ ) اس کراہت کے معنی میں ہے جس کا عامل بیرونی اور خارجی ہو ۔ زیر بحث مقام پر چونکہ غیر مومنین خارج از ذات عوامل کے زیر اثر قوانین آفرینش کے مقہور و مغلوب ہیں اس لئے ”کرہ“ ( بر وزن ”شرح“ ) استعمال ہوا ہے ۔

”طوعاً و کرہاً“ کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ”طوعاً“ سے مراد عالم خلقت کے وہ واقعات ہیں جو ایک موجود کی فطری اور طبیعی رضا و رغبت کے موافق ہیں ( مثلاً زندہ رہنے کے لئے موجود زندہ کی رغبت ) اور ”کرہاً“ سے مراد وہ میلان ہے جو ایک وجود کو خارج سے لاحق ہو۔ مثلاً جراثیم کے حملے سے ایک زندہ موجود کی موت۔

۳۔ ”ظلال“ کا مفہوم: ”ظلال“ جمع ”ظل“ کی، جو ”سایہ“ کے معنی میں ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ ”سجود“ سے مراد صرف تشریحی سجدہ نہیں کیونکہ موجودات کے سایہ تو اپنا کوئی ارادہ و اختیار نہیں رکھتے بلکہ وہ تو روشنی کے چمک کے قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، اس بناء پر ان کا سجدہ تکوینی ہے یعنی وہ قوانین آفرینش کے سامنے سر تسلیم کم کئے ہوئے ہیں۔ البتہ لفظ ”ظلال“ کے ذکر کا یہ مطلب نہیں کہ زمین و آسمان کی تمام موجودات کا وجود مادی ہے اور ان سب کا سایہ ہوتا ہے بلکہ یہ صرف ان موجودات کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا سایہ ہوتا ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ شہر کے علماء اور ان کے فرزندوں نے فلاں مجلس میں شرکت کی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے فرزندوں نے شرکت کی کہ جن کے فرزند تھے۔ اس جملے سے ہر گز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شہر کے تمام علماء صاحب اولاد ہیں (غور کیجئے گا بہر حال سایہ اگرچہ ایک عدی چیز کے علاوہ کچھ نہیں کہ جو روشنی کا فقدان اور نہ ہونا ہی ہے لیکن چونکہ ہر طرف سے نور کا وجود اس کا احاطہ کئے ہوتا ہے لہذا اس کی بھی ایک موجودیت ہے اور وہ بھی آثار رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ کی تصریح شاید تاکید کے لئے ہے کہ موجودات کے سائے تک بارگاہ خداوندی میں سر خمیدہ ہیں۔

۴۔ ”اصل“ اور ”غدو“ کا مطلب یہ: ”اصل“ (بر وزن ”دھل“) جمع ہے اور ”اصل“ بھی اور ”اصل“ جمع ہے کہ جو ”اصل“ کے مادہ سے لی گئی ہے اور یہ دن کے آخری حصے کو کہتے ہیں اس لئے کہ دن کا یہ حصہ رات کی اصل اور بنیاد شمار ہوتا ہے۔

نیز ”غدو“ جمع ہے ”غدا“ کی کہ جو دن کے پہلے حصے کے معنی میں ہے (اور بعض اوقات یہ مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اگرچہ حکم خدا کے سامنے عالم ہستی کی موجودات کا سجدہ اور خضوع صبح اور عصر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت ہے پھر بھی ان دو مواقع کا ذکر یاتو اس امر کے دوام کے لئے کنایہ ہے مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح و شام تحصیل علم میں مشغول ہے یعنی ہمیشہ تحصیل علم میں محو ہے اور یا اس بناء پر ہے کہ گزشتہ جملے میں موجودات کے سایوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور سائے دن کے آغاز اور اختتام پر دیگر اوقات کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔

سورہ رعد / 16

۱۶۔ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلْ اللَّهُ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلْ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

ترجمہ

کہو آسمان اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہہ دو: تم نے اپنے لئے اس کے علاوہ اولیاء (اور خدا) بنا لئے ہیں، کہ جو اپنے سودو زیاں کے (بھی) مالک نہیں ہیں (چہ جائیکہ تمہارے)۔ کہو: کیا بیٹا اور نابینا برابر ہیں یا ظلمتیں اور نور برا بر ہیں؟ کیا انہوں نے انہیں خدا کا اس لئے شریک قرار دیا ہے کہ وہ خدا کا طرح خلقت رکھتے ہیں اور یہ خلقتیں ان کے لئے مشتبہ ہو گئی ہیں؟ کہہ دو: خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب۔

بت پرستی کیوں؟

گزشتہ آیات میں وجودِ خدا کی معرفت کے بارے میں بہت سی بحثیں تھیں۔ اس آیت میں بت پرستوں کے اشتباہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے اور اس کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور مدبر کون ہے (قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ)۔

اس کے بعد بغیر اس کے کہ پیغمبر ان کے جواب کے انتظار میں رہے حکم دیا گیا ہے کہ اس سوال کا جواب خود دو، کہو: ”اللہ“ (قُلْ اللَّهُ)۔

پھر انہیں یونہی نلامت کی گئی ہے: ان سے کہو: کیا تم نے غیر خدا کو اپنے لئے اولیاء، سہارا اور معبود قرار دے لیا ہے

حالانکہ یہ بت تو اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں ( قُلْ اللَّهُ قُلُّ أَفَاتَخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ) - در حقیقت پہلے ”خدا کی ربوبیت“ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے نیز یہ کہ وہی عالم ک امالک و مدبر ہے ہر خیر و نیکی اسی کی جانب سے ہے اور وہی ہر شر کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے یعنی جب کہ تم یہ بات قبول کرتے ہو کہ خالق اور پرور دگار وہ ہے تو اب جو مانگنا ہے اسی سے مانگو نہ کہ بتوں سے کہ جہ جو تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کرسکتے۔ پھر اس سے بھی پڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ وہ تو اپنے نفع و نقصان تک کے مالک نہیں ہیں چہ جائیکہ تمہارے۔ ان حالات میں وہ تمہاری کونسی مشکل آسان کرسکتے ہیں جس کی بناء پر تم ان کی پرستش کرتے ہو جب وہ اپنے لئے ہے بس ہیں تو تم ان سے کیا توقع رکھتے ہو۔

اس کے بعد دو واضح اور صریح مثالوں کے ذریعے ”موحد“ اور ”شُرک“ کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے : کہو: کیا نابینا اور بینا برابر ہیں (قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ) - جس طرح بینا اور نابینا برابر نہیں ہیں اسی طرح کافر اور مومن بھی برابر نہیں ہیں اور بتوں کو ”اللہ“ کا شریک قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسرا یہ کہ : کیا ظلمات اور نور برابر ہیں (أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ) - وہ ظلمت کہ جو انحراف ، گمراہی ، اشتباہ اور خوف و خطر کا مرکز ہے اسے اس نور کے برابر کیسے سمجھا جا سکتا ہے جو رہنما اور حیات بخش ہے۔ کس طرح سے بتوں کو کہ جو محض ظلمات ہیں خدا کے ساتھ شریک کیا جا سکتا ہے کہ جو عالم ہستی کا نور مطلق ہے۔ ایمان اور توحید کہ جو روح نور ہے اسے شرک و بت پرستی سے کیانسبت کہ جو ظلمت کہ روح رواں ہے۔

اس کے بعد ایک طریقے سے مشرکین کے عقیدے کا بطلان ثابت کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : وہ کہ جنہوں نے خدا کے لئے شریک قرار دئے ہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے بھی خدا کی طرح خلق کیا ہے اور یہ خلق کیا ہے اور یہ خلقت اس کے لئے مشتبہ ہو گئی اور انہیں یہ گمان ہو گیا ہے کہ بت بھی خدا کی طرح عبادت کے مستحق ہیں کیونکہ ان کی نظر میں بت بھی وہی کام کرتے ہیں کہ جو خدا کرتا ہے (أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَفُوا وَخَلَفَهُ فَتَسَابَهُ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ) - حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بت پرست بھی بتوں کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھتے۔ وہ بھی خدا کو تمام چیزوں کا خالق سمجھتے ہیں اور عالم خلقت کو فقط اس سے مربوط شمار کرتے ہیں۔ اسی لئے فوراً فرمایا گیا ہے : کہہ دو خدا ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہے یکتا و کامیاب (قُلْ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ) -

چند اہم نکات

۱۔ خالقیت و ربوبیت معبودیت سے مربوط ہے :

زیر نظر آیت سے پہلے تو یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ جو خالق ہے وہ رب اور مدبر ہے بھی ہے کیونکہ خلقت ایک دائمی اور مسلسل امر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ خدا وند عالم موجودات کو پیدا کر کے ایک طرف بیٹھ جائے بلکہ فیض ہستی خدا کی طرف سے دائمی طور پر ہوتا ہے اور ہر موجود اس کی پاک ذات سے ہستی اور وجود حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس بناء پر آفرینش کا ہر وگرام اور عالم ہستی خدا کی تدبیر ابتدائے خلقت کی طرح خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سود زیاں اور نفع و نقصان کامالک وہی ہے اور اس کے علاوہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی کی طرف سے ہے۔ اس کے باوجود کیا خدا کے علاوہ کوئی عبودیت کا اہل ہے۔

۲۔ خود ہی سوال اور خود ہی جواب :

محل بحث آیت سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو کیونکر حکم دیتا ہے کہ مشرکین سے سوال کریں کہ آسمان و زمین کا پرور دگار اور مالک کون ہے اور اس کے بعد بغیر جواب کا انتظار کئے اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس سوال کا جواب دیں اور اس کے بعد بلا فاصلہ ان مشرکین کو سرزنش کی گئی ہے کہ وہ بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں۔

یہ سوال و جواب کا کیسا طریقہ ہے؟ ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ایک سوال کا جواب اس در واضح ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ مدمقابل کے جواب کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ ہم کسی سے سوال کرتے ہیں کہ اس وقت رات یا دن اور پھر بلا فاصلہ ہم خود جواب دیتے ہیں کہ یقیناً رات ہے۔ یہ دراصل اس امر کے لئے ایک لطیف کنایہ ہے کہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ جواب کے انتظار

کرنے کی محتاج نہیں ہے -  
 علاوہ ازیں مشرکین خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے اور وہ ہر گز یہ بات نہیں کہتے تھے کہ بت پرست زمین و آسمان کے خالق ہیں بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ شفیع ہیں اور انسان کو نفع و نقصان پہنچانے پر قادر ہیں اور اسی بناء پر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی عبادت کرنا چاہیے۔ لیکن چونکہ ”خالقیت“ اور ”ربوبیت“ (عالم ہستی کی تدبیر اور اس کے نظام کو چلانا) ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے لہذا مشرکین پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے اور انہیں کہا جا سکتا ہے کہ تم خالقیت کو خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہو تو ربوبیت کو بھی اس کے ساتھ مخصوص سمجھو اور اس کے ساتھ عبادت بھی اسی سے مخصوص ہو گئی ہے۔

۳۔ چشم بینا اور روشنی لازم و ملزوم ہیں :

آیت میں ”نابینا و بینا“ اور ”ظلمات و نور“ دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک حقیقت عینی کے مشاہدہ کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ چشم بینا کی بھی اور نور کی شعاعوں کی بھی۔ ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو مشاہدہ ممکن نہیں۔ لہذا سوچنا چاہیے کہ ان لوگوں کی کیا حالت ہو گی کہ جو ان دونوں سے محروم ہوں، بینائی سے بھی اور نور سے بھی۔ اس کا حقیقی مقصد مشرکین ہیں کہ جن کی چشم بصیرت بھی اندھی ہے اور جن کی زندگی کو بھی کفر و بت پرستی کی تاریکی نے گھیر لیا رکھا ہے اسی لئے وہ تاریک گھاٹیوں اور گڑھوں میں سرگرداں ہیں۔ جب ان کے ہر عکس مومنین نگاہ بینا رکھتے ہیں۔ ان کا پر و گرام واضح ہے اور انہوں نے نور وحی اور تعلیمات انبیاء کی مدد سے اپنی زندگی صحیح راستے پر دال لیا ہے۔

۴۔ کیا خدا کی خالقیت جبر و اکراہ کی دلیل ہے؟ زیر نظر جبر کی بعض طرفداروں نے محل بحث آیت کے جملے ”اللہ خالق کل شیء“ سے اپنا مقصد ثابت کرنے کے لئے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کاموں کا خالق بھی خدا ہے یعنی ہمارا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے۔

اس بات کو دو طریقوں سے جواب دیا جا سکتا ہے :

پہلا یہ کہ اس آیت کے دوسرے جملے اس بات کی پورے طور پر نفی کرتے ہیں کیونکہ ان میں بت پرستوں کی بڑی ملامت کی گئی ہے اگر واقعاً ہم اپنے اعمال میں کوئی اختیار نہیں رکھتے تو پرتنبیہ اور سرزنش کس بناء پر؟ اگر خدا چاہتا کہ ہم بت پرست رہیں تو پھر وہ کیوں سرزنش کرتا ہے اور رکیوں ہدایت کے لئے اور راہ بدلنے کے لئے استدلال کرتا ہے۔ یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ لوگ اپنی راہ انتخاب کرنے میں آزاد اور مختار ہیں۔

دوسرا یہ کہ ہر چیز میں خالقیت بالذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن پھر بھی یہ چیز اپنے افعال میں ہمارے مختار ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہماری طاقت اور ہماری عقل بلکہ ہمارے ارادے کی آزادی سب کے سب اسی کی جانب سے ہیں۔ اس بناء پر ایک لحاظ سے وہ بھی خالق ہے (تمام چیزوں کا خالق حتیٰ کہ ہمارے افعال و اعمال کا خالق) اور ہم بھی فاعل مختار ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے طول میں ہیں کہ کہ عرض میں۔ وہ فعل کے تمام وسائل اور ذرائع پیدا کرنے والا ہے اور ہم خیر و شر کے راستے پر ان وسائل سے استفادہ کرنے والے ہیں۔

یہ بالکل اس طرح ہے جس طرح سے کوئی شخص بجلی گھر یا پانی پلانی کا مرکز تیار کر کے ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے۔ مسلم ہے کہ ہم اس بجلی سے کسی قریب المرگ بیمار کے لئے آپریشن تھیٹر کو روشن کریں یا ایک برائی کے مرکز کو۔ اسی طرح پانی سے کسی تشنہ لب کو سیراب کریں اور پھولوں کے پودوں کی آبیاری کریں یا کسی بے گناہ کے گھر کی بنیادوں میں پانی ڈال کر اسے تباہ کر دیں۔

۱۷۔ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَهُ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّبِيلُ زَبَدًا رَابِيًا وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حُلِيَةٍ أَوْ مَنَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ.

ترجمہ

۱۷۔ خدا نے آسمان سے پانی بھیجا اور ہر درہ اور دریا سے ان کی مقدار کے مطابق سیلاب امند پڑا پھر پانی کے ریلوں پر جھگ پیدا ہو گئی اور جن (بھٹیوں) میں زیرات یا اسباب زندگی تیار کرنے کے لئے آگ روشن کرتے ہیں ان سے بھی جھاگ نکلنے لگی۔ اس طرح خدا حق اور باطل کے لئے مثال بیان کرتا ہے۔ لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ رساں چیز (پانی یا خالص دھات) زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ خدا اسی سے مثال بیان کرتا ہے۔

حق و باطل کی منظر کشی

قرآن کے جو تعلیم و تربیت کی کتاب ہے اس کی روش ہے کہ وہ مسائل عینی کی بنیاد پر گفتگو کرتا ہے لہذا اس میں پیچیدہ مسائل کو ذہن نشین کروانے کے لئے لوگوں کی روز مرہ زندگی سے عمدہ، خوبصورت اور حسی مثالیں پیش کی گئی ہیں زیر نظر آیت میں بھی توحید و شرک، ایمان و کفر اور حق و باطل کے بارے میں گزشتہ آیات میں ذکر کئے گئے حقائق کو مجسم کرنے کے لئے ایک بہت ہی رسا اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے (أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً)۔ زندگی کی بخش اور حیات آفرین پانی نشوونما اور حرکت کا سرچشمہ پانی۔

اس وقت یہ پانی زمین کے دروں، گڑھوں، دریاؤں اور نہروں میں ان کی وسعت کے مطابق سما جاتا ہے (فَسَالَتْ أَوْدِيَهُ بِقَدَرِهَا)۔

چھوٹی چھوٹی ندیاں ایک دوسرے گلے ملتی ہیں۔ تو دریا وجود میں آتے ہیں دریا باہم مل مل جائیں تو دامن کہساز سے سیلاب عظیم امند پڑتا ہے پانی کندھوں اور سروں سے بلند ہو جاتا ہے اور رجو کچھ اس کی راہ میں آتا ہے اسے بہا لے جاتا ہے۔ ایسے میں پانی کی موجیں اور لہریں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: سیلاب کے اوپر جھاگ اٹھتی ہے ((فَاحْتَمَلَ السَّبِيلُ زَبَدًا رَابِيًا))۔

”رابی“ کا مادہ ”ربو“ (بر وزن ”غلو“) ہے۔ یہ بلندی و برتری کے معنی میں ہے۔ ”ربا“ کہ جو سود یا اضافی رقم یا اضافی جنس کے معنی میں ہے وہ بھی اسی مادہ سے اسی معنی میں ہے چونکہ یہ اضافے اور زیادتی کا معنی دیتا ہے۔ جھاگ صرف بارش برسنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ جو دھاتیں آگ کے ذریعے پگھلتی ہیں تاکہ ان سے زیورات یا دیگر اسباب زندگی تیار کئے جائیں ان سے بھی پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ نکلتی ہے (وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حُلِيَةٍ أَوْ مَنَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ)۔ ۱۔

یہ تعبیر ان کٹھالیوں کی طرف اشارہ ہے جن میں دھاتیں پگھلانے کے لئے ان کے نیچے بھی آگ ہوتی ہے اور اوپر بھی۔ اس طرح سے نیچے آگ ہوتی ہے پھر اس کے اوپر ایسے پتھر کہ جن میں سامواد ہوتا ہے ڈالے جاتے ہیں اور پھر اس کے اوپر بھی آگ ڈالتے ہیں۔ یہ بہترین قسم کی کٹھالی ہے کہ جن میں آگ نے پگھلنے کے قابل مواد کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہوتا ہے۔

یہ ایک ایسی وسیع مثال بیان کی گئی ہے جو صرف پانی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دھاتوں کے بارے میں بھی ہے چاہے وہ دھاتیں زیورات بنانے کے لئے استعمال ہوتی ہوں یا دیگر اسباب حیات تیار کرنے کے کام میں آتی ہوں۔ اس کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس طرح خدا حق اور باطل کے لئے مثال بیان کرتا ہے (كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ)۔ پھر اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے اور وہ پانی کہ جو لوگوں کے لئے مفید اور سود مند ہوتا ہوتا ہے زمین میں باقی رہ جاتا ہے (فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ)۔

فضول شوریلی اور اندر سے خالی جھاگ کہ جو ہمیشہ اوپر ہوتی ہے لیکن کوئی فائدہ بخش نہیں ہوتی اسے ایک طرف پھینک دینا چاہیے لیکن خاموش، بے صدا، متواضع، مفید اور سود مند پانی باقی رہ جاتا ہے اور اگر زمین کے اوپر نہ ہو تو زمین کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور زیادہ وقت نہیں گذرتا کہ رواں چشموں اور کنوؤں کی صورت میں زمین سے نکل آتا ہے اور تشنہ کاموں کو سیراب کرتا ہے۔ درختوں کو بار آور، گلو کو شگفتہ اور پھلوں کو تیار کرتا ہے اور ہر چیز کو سرسوامان حیات عطا کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے طور پر اور اس آیت میں زیادہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اس طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے (كَذَلِكَ يُضَرِّبُ اللَّهُ الْأُمَثَالَ)۔

چند اہم نکات

اس معنی خیز مثال میں نہایت موزوں الفاظ اور جملے استعمال ہوئے ہیں۔ حق و باطل کی منظر کشی نہایت عمدہ گی سے کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے حقائق پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ حق و باطل کی شناخت کے لئے علامتیں :

حق و باطل کی پہچان کہ جو در حقیقت واقعیت اور حقیقت کو خالی اور جعلی باتوں سے الگ کرنے کا نام ہے بعض اوقات انسان کے لئے اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ کسی حتمی اور یقینی علامت کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور علامتوں کے ذریعے حقائق کو اویام سے اور حق کو باطل سے جدا کر کے پہچاننا پڑتا ہے۔ قرآن نے مذکورہ مثال میں ان علامتوں کو اس طرح سے بیان کیا ہے :

الف : حق ہمیشہ مفید اور سود مند ہوتا ہے اب شیریں کی طرح کہ جو باعث حیات ہے لیکن باطل بے فائدہ اور فضول ہوتا ہے پانی کے اوپر والی جھاگ کسی کو سیراب کرتی ہے نہ درخت آگاتی ہے۔ کٹھالی میں پگھلنے والی دھاتوں سے نکلنے والی جھاگ بھی نہ زیور بنانے کے کام آتی ہے نہ زندگی کا کوئی اور ساز و سامان۔ اگر اس جھاگ کا کوئی مصرف ہے تو پست اور بے وقعت جو کسی حساب و شمار میں نہیں آتا۔ جیسے خمس و خاشاک کو جلانے کے کام لایا جائے۔

ب: باطل ہمیشہ مستکبر ، بالا نشین اور قال و قیل اور شور و غوغا سے پر لیکن اند سے خالی اور کھوکھلا ہوتا ہے لیکن حق متواضع ، کم صدا، باعمل ، با مقصد اور وزنی ہوتا ہے۔ 2-

2- حضرت علی علیہ السلام اپنے متعلق اور اپنے دشمنوں ، جیسے اصحابِ جمل تھے ، کے بارے میں فرماتے ہیں وقد ارعدوا و برقوا و مع هذين الامرين الفشل ولسنا نر عد حتى نوقع ولانسيل حتى نمطر

وہ رعد برق کی سی گرج دکھاتے ہیں لیکن انجام کا رسکتی اور ناتوانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس ہم جب تک کوئی اکام انجام نہ دے لیں گرج چمک نہیں دکھائے۔ ہم نہ برسیں تو سیلابِ خروشاں نہیں اٹھاتے (ہمارا پر گرام عمل ہے نہ کہ باتیں کرنا)۔ نہج البلاغہ - خطبہ 9۔

ج: حق ہمیشہ اپنے اوپر تکیہ کرتا ہے لیکن باطل حق کی آبرو کا سہارا لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو حق کے لباس میں پیش کرے اور اس کے مقام سے استفادہ کرے۔ جیسے کہا جاتا ہے :

”پر دروغی از راست فروغ می گیرد“

یعنی پر دروغ اور جھوٹ سچ سے فروغ حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اگر سچ بات دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی شخص کبھی جھوٹ کا اعتبار نہیں کرتا اور اگر خالص جنس دنیا میں نہ ہوتی تو کوئی ملاوٹی اور جعلی چیز سے فریب نہ کھاتا۔ اس بناء پر باطل کا کم عمر فروغ اور وقتی آبرو بھی حق کی وجہ سے بے لیکن حق ہر جگہ اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی آبرو کا سہارا لیتا ہے۔

اسی امر کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :

لو ان الباطل خالص من مزاج الحق لم يخف على المرتادين ولو ان الحق خالص من لبس الباطل انقطعت عنه السن المعاندين  
اگر باطل حق سے مل نہ جائے تو حق متلاشیوں کے لئے مخفی نہ رہے اور اگر حق باطل سے جدا ہو جائے تو بد لوگوں کی زبان اس سے منقطع ہو جائے گی۔ 3

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں در حقیقت تین تشبیہیں ہیں۔

۱۔ آسمان وحی سے آیاتِ قرآن کا نزول جسے بارش کے حیات بخش قطرات کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ انسانوں کے دلوں کو ایسی زمینوں ، دروں اور گہرائیوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی وسعت اور ظرف کے لحاظ سے استفادہ کرتے ہیں۔

۳۔ ”شیطانوں و سوسوں“ کو پانی پر پیدا ہونے والی ایسی گندی جھاگ سے تشبیہ دی گئی ہے جو پانی سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ پانی کے گرنے کی جگہ کی گندگی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی بناء پر نفس اور شیطان کے وسوسے مومنین کے دلوں سے بر طرف ہو جاتے ہیں اور وحی کا آپ شیریں باقی رہ جاتا ہے جو انسانوں کی ہدایت اور حیات کا موجب ہے۔

۳۔ فائدہ ہمیشہ اہلیت کے اعتبار سے ہوتا ہے :

اس آیت سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدائی فیض کے مبداء میں کسی قسم کا کوئی بخل، محدودیت اور ممنوعیت نہیں ہے۔ جیسا کہ آسمانی بادل ہر جگہ بغیر کسی قید کے برستے ہیں اور زمین کے مختلف حصے اور درے اپنے وجود کی وسعت کے اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو زمین چھوٹی ہے اس کا حصہ کم ہے اور جو بڑی ہے اس کا حصہ زیادہ ہے۔ انسانوں کے دل اور روحوں بھی خدائی فیض سے اسی اعتبار سے مستفید ہوتی ہیں۔

۴۔ باطل سرگرداں ہے :

جس وقت سیلِ آب کسی صاف صحرا میں پہنچا ہے اور پانی کا جوش و خروش مدہم پر جاتا ہے تو جو چیزیں پانی سے مخلوط ہوئی ہوتی ہیں آہستہ آہستہ تپنشین ہو جاتی ہیں اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے۔ صاف و شیریں پانی نمایاں ہو جاتا ہے۔ باطل بھی اسی طرح پریشاں حال ہے وہ مفاد اٹھانے کے چکر میں ہے لیکن جس وقت سکون آتا ہے اور ہر شخص اپنے مقام پر بیٹھ جاتا ہے حقیقی معیار اور ضابطے معاشرے میں ظاہر ہوتے ہیں تو پھر باطل کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور وہ جلدی ہی رفو چکر ہو جاتا ہے۔

۵۔ باطل صرف ایک لبادہ میں نہیں ہوتا:

باطل کی خصوصیت میں سے ہے کہ لمحہ بہ لمحہ شکلیں اور لباس بدلتا رہتا ہے۔ تاکہ اگر اسے ایک بہروپ میں پہچان لیا جائے تو وہ دوسرے میں اپنے تئیں چھپا لے۔

مندرجہ بالا آیت میں بھی اس معالے کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جھاگ نہ صرف پانی پر ظاہر ہوتی ہے بلکہ ہر بھٹی، ہر کٹھالی اور سانچے میں سے کہ جس میں دھاتوں کو پگلا یا جاتا ہے نئی جھاگ نئی شکل میں اور نئے لباس میں آشکار ہو تی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حق و باطل ہر جگہ موجود ہوتا ہے جیسا کہ ہر بہنے والی چیز میں جھاگ نئی اپنی خاص شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم شکلیں بدلنے سے دھوکا نہ کھائیں اور ہر جگہ باطل کو اس کی مخصوص صفات سے پہچان لیں کیونکہ اس کی صفات ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان صفات کے حوالے سے باطل کو پہچان کر اسے حق سے الگ کر دینا چاہیے۔

۶۔ ہر موجود کی بقا اس کے فائدے سے وابستہ ہے :

اس سلسلے میں زیر بحث آیت میں ہے کہ جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے باقی رہ جاتی ہے (واماما یفنع الناس فیمکت فی الارض)۔

یعنی پانی کہ جو صرف باعث حیات ہے باقی رہ جاتا ہے اور جھاگ ختم ہو جاتی ہے بلکہ دھات بھی چاہے وہ زیور کے لئے ہو چاہے اسباب زندگی تیار کرنے کے لئے اس میں سے بھی خالص دھات جو مفید، سود مند یا صاف و شفاف اور خوبصورت و زیبا ہوتی ہے باقی رہ جاتی ہے اور جھاگ کو دور پھینک دیتی ہے۔ اسی طرح سے انسان، گروہ، مکاتب فکر اور پروگرام جس قدر سود مند ہیں اس قدر بقا و حیات کا حق رکھتے ہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی انسان یا باطل مکتب و مذہب ایک مدت تک باقی رہ جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی حق کی وہ مقدار ہے جو اس میں ملا ہوا ہے اور وہ اتنی مقدار کے لئے حق حیات پیدا کر چکا ہے۔

۷۔ حق باطل کو کس طرح باہر نکال پھینکتا ہے :

لفظ ”جفاء“ جو گر جانے اور باہر کی طرف جا پڑنے کے معنی میں ہے اپنے اندر ایک لطیف نکتہ لئے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ باطل اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور ہمہ وقت معاشرے سے باہر جا کر نا چاہتا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب حق جوش میں آتا ہے اور جس وقت حق میں حرکت اور جوش و خروش پیدا ہوتا ہے تو باطل کسی برتن کی جھاگ کی طرح اچھل کر باہر جا پڑتا ہے اور یہ بات خود اس امر کی دلیل ہے کہ حق کو ہمیشہ جوش اور رجنیش و خروش میں رہنا چاہیے تاکہ باطل کو اپنے سے دو رکھے۔

۸۔ باطل اپنی بقا میں حق کا مقروض ہے :

جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر پانی نہ ہوتو جھاگ کبھی بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اسی طرح اگر حق نہ ہو تو باطل کے لئے فروغ و ظہور ممکن نہیں۔ اگر صالح اور اچھے لوگ نہ ہوتے تو کوئی شخص خائن اور دھوکا باز افراد سے متاثر نہ ہوتا اور ان کے فریب میں نہ آتا لہذا باطل کا یہ جھوٹا جولان اور فروغ بھی فروغ حق

سے بہرہ وری ہے :  
کان دروغ از راست می گیرد فروغ جھوت سچ سے فروغ پاتا ہے ۔

۹۔ حق اور باطل میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے :  
قرآن نے یہاں حق و باطل کو مجسم کرنے کے لئے ایک ایسی مثال دی ہے جو کسی مکان و زمان سے مخصوص نہیں ہے ۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو دنیا کے مختلف علاقوں میں انسانوں کے سامنے آتا رہتا ہے ۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ حق و باطل کے مابین جنگ کوئی وقتی اور مقامی جنگ نہیں ہے ۔ صاف اور آلودہ پانی کی یہ ندیاں مخلوق پر صور پھونکے جانے تک اسی طرح جاری رہیں گی مگر یہ کہ ایک انیڈیل معاشرے وجود میں آجائے ( مثلاً حضرت مہدی علیہ السلام کے دور قیام کا معاشرہ ) ۔ کو اس مبارزہ کے اختتام کا اعلان ہو گا ۔ حق کا لشکر کامیاب ہو جائے گا ۔ باطل کی بساط الت جائے گی ۔ بشریت اپنی تاریخ کے نئے مرحلے میں داخل ہو گی اور جب تک یہ تاریخی مرحلہ نہ آجائے ہر جگہ حق و باطل کے تصادم کی انتظار میں رہنا چاہیے اور باطل کے مقابلے کے لئے ضروری اہتمام کرنا چاہیے ۔

۱۰۔ زندگی جہاد و جستجو کے سائے میں :  
زیر بحث آیت میں دی گئی خوبصورت مثال زندگی کی اس بنیادی حقیقت کو بھی واضح کرتی ہے کہ زندگی بغیر جہاد کے بقا و سر بلندی بغیر سعی و کوشش کے ممکن نہیں ہے ۔ ارشاد فرمایا ہے کہ لوگ وسائل زندگی یا زیور کی تیاری کے لئے جو کچھ بھٹیوں اور کٹھالیوں میں ڈالتے ہیں اس میں سے ہمیشہ غیر ضروری مواد نکلتا ہے اور جھاگ پیدا ہوتی ہے اور یہ دو قسم کے وسائل یعنی ضروری اور رفائی وسائل (ابتغاء حلیة او متاع) حاصل کرنے کے لئے اصلی مواد کو جو عالم طبیعت میں اصلی شکل میں نہیں مل سکتا اور ہمیشہ دوسری چیزوں میں ملا ہوتا ہے اسے الگ کی کٹھالی میں ڈالنا پڑتا ہے اور اسے پاک صاف کرنا پڑتا ہے تاکہ خالص دھات میسر آسکے اور یہ کام سعی و جستجو کے بغیر ممکن نہیں ۔ اصولی طور پر دنیاوی زندگی کا مزاج یہ ہے کہ گلوں کے ساتھ خرم نوش کے ساتھ نیش ، اور کامیابیوں کے ساتھ مشکلات ہوتی ہیں ۔ قدیم زمانے کی کہاوت ہے کہ :

خزانے ویرانوں میں ہوتے ہیں اور ہر خزانے کے اوپر ایک اڑدھا سویا ہوا ہے ۔  
کیا یہ ویرانے اور اڑدھا سوائے مشکلات کے کسی اور چیز کا نام ہے کہ جو کامیابی کے راستے میں موجود ہیں ۔  
ایرانی داستانوں میں بھی رستم کی داستان میں ہے کہ وہ کامیابی تک پہنچنے کے لئے مجبور تھا کہ سات خوان سے گزرے کہ جن میں سے ہر ایک انبوہ مشکلات کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر مثبت کام کے راستے میں درپیش ہوتی ہیں ۔  
بہر حال قرآن نے یہ حقیقت با ربا بیان فرمائی ہے کہ انسان کوئی کامیابی مشکلات اور تکالیف اٹھانے بغیر حاصل نہیں کر سکتا ۔ اس کے لئے قرآن میں مختلف عبارتیں ہیں ۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۴ میں ہے :  
”ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و لما یأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستہم البأساء و الضراء و زلزلوا حتی یقول الرسول و الذین آمنوا معہ متی نصر اللہ قریب“

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تمام آسانی سے جنت میں جا پہنچو گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں آئیں گے جو گزشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے ، وہی لوگ کہ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہل ایمان کہنے لگے کہ خدا کی مدد کہا نہیں تو ان بہت ہی سخت اور دردناک لمحات میں خدائی نصرت ان کے پاس پہنچی اور ان سے کہا گیا کہ خدا ہی مدد قریب ہے ۔

۱۔ اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے  
اس معنی خیز زیور اور متاع حاصل کرنے کے لئے آگ روشن کرتے ہیں اس سے پانی کی جھاگ کی طرح جھاگ حاصل ہوتی ہے ۔  
۲۔ ”زید“ کیا ہے ؟ ”زید“ پانی کے اوپر والی یا ہر قسم کی جھاگ کو کہتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آب شیریں پر بہت کم جھاگ آتی ہے کیونکہ پانی کے خارجی اجسال سے آلودہ ہونے کی وجہ سے جھاگ پیدا ہوتی ہے ۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر حق اپنی اصل صفائی اور پاکیزگی پر رہے تو اس کے اطراف میں باطل کی جھاگ کبھی پیدا نہ ہوگی لیکن جب حق آلودہ گندے ماحول میں ہو اور حقیقت خرافات میں کھو جائے ، درستی نا درستی سے مل جائے اور پاکیزگی ناپاکی سے خلط ملط ہو جائے تو باطل کی جھاگ اس کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے ۔  
3۔ نہج البلاغہ ، خطبہ ۵۰۔

مباحث کی توضیح و تفسیر میں مثال کی تاثیر ناقابل انکار ہے۔ اسی بناء پر کسی بھی علم میں حقائق کے اثبات اور توضیح کے لئے انہیں ذہن کے قریب لانے کے لئے ہم مثال پیش کرنے سے بے نیاز نہیں ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہر محل مثال کو جو مقصود سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور اس پر منطبق ہو مطلب کو آسمان سے زمین پر لے آتی ہے اور اسے سب کے لئے قابل فہم بنا دیتی ہے۔ بہر حال کہا جا سکتا ہے کہ مختلف علمی، تربیتی، اجتماعی اور اخلاقی مباحث میں مثال مندرجہ ذیل موثر اثرات رکھتی ہے۔

۱۔ مثال مسائل کو حسّی بنا دیتی ہے: انسان چونکہ زیادہ تر محسوسات سے مانوس ہے اور پیچیدہ عقلی حقائق نسبتاً افکار کی دسترس سے دور ہوتے ہیں لہذا حسّی مثالیں ان دور دراز فاصلوں کو سمیٹ دیتی ہیں اور انہیں محسوسات کے آستانے پر لاکھڑا کرتی ہیں اور ان کے ادراک کو دل چسپ، شیریں اور اطمینان بخش بنا دیتی ہیں۔

۲۔ مثال راستے کو مختصر کر دیتی ہے: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک گہرا، منطقی اور عقلی مسئلہ ثابت کرنے کے لئے انسان کو مختلف استدلالوں کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر پھر بھی اس کے گرد ابہام موجود رہتا ہے لیکن ایک واضح اور مقصد سے ہم آہنگ مثال راستہ اس قدر مختصر کر دیتی ہے کہ استدلال کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور متعدد استدلالوں کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

۳۔ مثال مسائل کو سب کے لئے یکساں بنا دیتی ہے: بہت سے علمی مسائل کہ جو اپنی اصل صورت میں صرف خواص کے لئے قابل فہم ہیں اور عامۃ الناس اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے لیکن جب ساتھ مثال موجود ہو اور اس کے ذریعے وہ قابل فہم ہوجائیں تو ان سے سب لوگ مستفید ہو نگے چاہے وہ علم و دانش کی عمومیت دینے کے اعتبار سے ناقابل انکار کار آمد چیزیں ہیں۔

۴۔ مثال مسائل کو زیادہ قابل اطمینان بنا دیتی ہے: کلیات عقلی جس قدر بھی مستدل اور منطقی ہوں جب تک ذہن تک رہتے ہیں ان کے بارے میں کافی اطمینان پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انسان ہمیشہ اطمینان کو عینیت اور ظاہری وجود میں ڈھونڈتا ہے اور رمثال ذہنی مسائل کو عینیت بخشتی ہے اور انہیں عالم خارج میں واضح کر دیتی ہے۔ اسی لئے باور کرنے، قبول کرنے اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے مثال بہت موثر ہوتی ہے۔

۵۔ مثال ہٹ دھرموں کو خاموش کر دیتی ہے: اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسائل کلیات مستدل اور منطقی صورت میں پیش کیے جائیں تو ایک ہٹ دھرم شخص ان پر خاموش نہیں ہوتا اور اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے لیکن جب مسئلہ مثال کے قالب میں ڈھالا جائے تو اس کے لئے راستہ بند ہو جاتا ہے اور اس میں بہانہ جوئی کی مجال نہیں رہتی۔ نامناسب نہیں ہوگا اگر ہم اس موضوع کے لئے چند مثالیں پیش کریں تاکہ واضح ہو جائے کہ مثال میں کس قدر اثر ہے۔ جو لوگ یہ اعتراض کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ صرف ماں سے کس طرح پیدا ہو گئے اور کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص بغیر باپ کے پیدا ہو جائے، قرآن ان کے جواب میں فرماتا ہے:

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب

عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا۔ (آل عمران ۵۹)

صحیح طرح سے غور کریں کہ ہم جس قدر بھی ہٹ دھرم لوگوں کے سامنے کہیں کہ یہ کام خدا کی لامتناہی قدرت کے سامنے نہایت معمولی ہے پھر بھی ممکن ہے وہ بہانے ڈھونڈیں لیکن جب ان سے یہ کہیں کہ کیا تم یہ مانتے ہو کہ حضرت آدم کو جو پہلے انسان تھے مٹی سے پیدا ہوئے تھے تو جو خدا ایسی قدرت رکھتا ہے وہ کسی بشر کو بغیر باپ کے پیدا کیوں نہیں کر سکتا۔

جن منافقوں نے اپنے نفاق کے زیر سایہ چند دن ظاہر آسکون و آرام سے بسر کیے ہیں قرآن مجید ان کے بارے میں ایک خوبصورت مثال پیش کرتا ہے۔ قرآن انہیں ایسے مسافر سے تشبیہ دیتا ہے جو تاریک بیابان سے گزر رہا ہے۔ رات اندھیری ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ مسافر آندھی، طوفان اور ربارش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح سے سرگردان ہے کہ اسے کسی طرف کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں جب آسمانی بجلی چمکتی ہے تو بیابان کی فضا چند لمحوں کے لئے روشن ہو جاتی ہے اور وہ ارادہ کرتا ہے کہ کسی طرف جائے تاکہ اسے راستہ مل جائے لیکن جلدی ہی وہ بجلی خاموش ہو تی ہے اور وہ اسی طرح بیابان میں سرگرداں رہ جاتا ہے۔ (بقرہ۔ ۲۰)

کیا سرگرداں منافق کی حالت کی تصویر کشی کے لئے کہ جو اپنی روح نفاق اور رمنافقانہ عمل سے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنا چاہتا ہو اس سے زیادہ جاذب نظر مثال ہو سکتی ہے؟ یا یہ کہ جب ہم کچھ لوگوں سے کہتے ہیں کہ راہ خدا میں

خرچ کرو تو خدا تمہیں کئی گنا زیادہ اجر دے گا تو ہو سکتا ہے کہ عام لوگ اس بات کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن جب یہ کہا جائے کہ راہ خد امین خرچ کرنا اس بیچ کی مانند ہے جسے زمین میں ڈالا جائے کہ جس سے سات خوشے اگتے ہیں اور ہر خوشے میں ہو سکتا ہے ایک سو دانے ہوں تو پھر یہ مسئلہ پوری طرح سے قابل فہم ہو جا تا ہے جیسا کہ ارشاد الہی ہے

مِثْلَ الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمِثْلِ حَبَّةِ آنِثْتِ سَبْعِ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ (بقرہ ۲۶۱)

عام طور پر ہم کہتے ہیں کہ ریا کاری والے اعمال فضول اور ربیکار ہیں اور انسان کو ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہو سکتا ہے یہ بات کچھ لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہو کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک فائدہ مند عمل مثلاً ایک ہسپتال یا ایک مدرسہ اگر چہ دکھاوے اور ریاکاری کے ارادہ سے ہو بار گاہ قدرت میں ہے وقعت ہو لیکن قرآن ایک مثال کے ذریعے اس بات کو پوری طرح قابل فہم اور دلچسپ بنا دیتا ہے -

ارشاد ہوتا ہے :

فَمِثْلَهُ كَمِثْلِ صَفْوَانَ عَلَيْهِ تَرَابٌ فَاصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَ صَلْدًا

ایسے اشخاص کا عمل پتھر کے ایک ٹکڑے کی مانند ہے کہ جس پر کچھ مٹی ڈال دی گئی ہو اور اس پر کچھ بیج چھڑک دیا جائے - تو جس وقت بارش برستی ہے تو بجائے کہ یہ بیج بار آور ہو بارش اسے پتھر پر پڑی ہوئی سطحی مٹی کے ساتھ دھو ڈالتی ہے اور اسے ایک طرف پھینک دیتی ہے - (بقرہ ۲۶۴)

ریا کاری اور بے بنیاد اعمال کی بھی یہی حالت ہے -

ہم دور نہ نکل جائیں اسی زیر بحث مثال میں کہ جو حق و باطل کے مابین مقابلے کے بارے میں اس میں معاملے کی کیسی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور اسے دقیق طور پر مجسم کیا گیا ہے - تمہید ، نتائج اور حق و باطل کی مخصوص صفات اور آثار میں سے ہر ایک کو اس مثال میں اس طرح سے منعکس کیا گیا ہے کہ مسئلہ سب لوگوں کے لئے قابل فہم اور راطمینان بخش ہو گیا ہے - اس کے پیش کئے گئے حقائق ہٹ دھرم افراد کو خاموش کر دینے والے ہیں نیز تمام چیزوں سے قطع نظر یہ مثال طولانی مباحث کی زحمت سے بچا دیتی ہے -

ایک روایت میں ہے کہ مادہ پرست امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا : قرآن میں ہے کہ جس وقت دوزخیوں کے جسم کا چمڑا آگ کی شدت سے جل جائے گا تو ہم اسے دوسرا چمڑا پہنادیں گے تاکہ وہ عذاب کا ذائقہ اچھی طرح سے چکھیں - اس دوسرے چمڑے کا کیا گناہ ہے کہ اسے سزا اور عذاب دیا جائے - اس کے جواب میں امام نے فرمایا:

وہ چمڑا بعینہ پہلا وا چمڑا بھی ہے اور اس کا غیر بھی ہے -

سوال کرنے والے اس جواب سے مطمئن نہ ہو اور اس جواب سے کچھ نہ سمجھ سکا لیکن امام نے ایک ناطق مثال کے ذریعے معاملہ اس طرح سے واضح کر دیا کہ گفتگو کی گنجائش باقی نہ رہی - آپ نے فرمایا:

دیکھو! تم ایک پرانی اور خراب اینٹ کو زیزہ ریزہ کر دیتے ہو پھر اسی خاک کو بھگو کر سانچے میں ڈالتے ہو اور اس سے ایک نئی اینٹ بناتے ہو - یہ وہی پہلے والی اینٹ ہے اور ایک لحاظ سے اس کی غیر بھی ہے - ۱

یہاں ایک نکتہ کا ذکر بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ مثال اپنے ان تمام مفید اور موثر اثرات کے باوجود اپنا بنیادی تقاضا بھی پورا کر سکتی ہے جب وہ اس مطلب سے ہم آہنگ ہو جس کے لئے اسے پیش کیا جا رہا ہے ورنہ مثال خود گمراہ ہو گی یعنی جیسے ایک صحیح اور ہم آہنگ مثال مفید اور موثر ہے اسی طرح ایک انحرافی اور غلط مثال گمراہی اور تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہے -

اسی بناء پر منافقین اور بداندیش افراد ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرنے اور سادہ لوح افراد کو غافل کرنے کے لئے غلط مثالوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے جھوٹ کے لئے مثال سے مدد لیتے ہیں لہذا ضروری ہے کہ ہم انحرافی اور غلط مثالوں سے فائدہ اٹھانے والے ایسے افراد پر پوری توجہ سے نظر رکھیں -

سورہ رعد / 18

۱۸- لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ الْحُسْنَى وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ أُولَئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ.

ترجمہ

۱۸۔ ان لوگوں کے لئے کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کیا ہے نیک (انجام، جزا اور) نتیجہ ہے اور وہ کہ جنہوں نے اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا (وہ عذاب الہی کی وحشت میں اس طرح غرق ہو گئے کہ) اگر وہ سب کچھ جو زمین پر ہے اور اس کی مثل ان کی ملکیت ہو اور وہ یہ سب کچھ عذاب سے نجات کے لئے دے دیں (لیکن وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا) ان کے لئے ہر احساس اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کس قدر ہر اٹھکا نا ہے۔

.....

۱۔ اس حدیث کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۳۰۸ (ار دو ترجمہ) میں ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں یہ حدیث مجالس شیخ اور احتجاج طبرسی کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے۔

جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا

گشتہ آیت میں حق و باطل کا چہرہ نمایاں کرنے کے لئے ایک رسا اور فصیح و بلیغ مثال پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد اب اس مقام پر ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا اور اس کے گر ویدہو گئے نیز ان افراد کا انجام بیان کیا گیا ہے جنہوں نے حق سے ر وگردانی کرتے ہوئے باطل کی طرف رخ کیا۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان لوگوں کے لئے، جنہوں نے اپنے پروردگار کی دعوت کو قبول کر لیا ہے نیک جزا، سود مند نتیجہ اور عاقبتِ محمود ہے (لَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ الْخَيْرُ)۔

”حسنی“ (نیکی) کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں ہر خیر و سعادت شامل ہے۔ نیک خصائل اور اخلاقی فضائل سے لے کر پاک و پاکیزہ اجتماعی زندگی، دشمن کا پر کامیابی اور بہشتِ جاوداں تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور وہ یہ جنہوں نے پروردگار کی یہ دعوت قبول نہیں کی ان کا انجام اس قدر برا اور رقت بار ہے کہ اگر تمام روئے زمین اور حتیٰ کہ اس کی مثل بھی ان کی ملکیت میں ہو اور وہ یہ سب کچھ اسے برے انجام سے نجات کے لئے دینے پر آمادہ ہوں تو بھی ”ان سے یہ سب کچھ قبول نہیں کیا جائے گا (وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَنُوا بِهِ)۔

ان کے لئے عذاب اور سزا کے عظیم ہونے کی تصویر کشی کے لئے اس سے بڑھ کر رسا اور عمدہ تعبیر نہیں ہوسکتی کہ ایک انسان تمام روئے زمین بلکہ اس کے دوگنا کمال ہو اور وہ سب کچھ اپنے آپ کو بچانے کے لئے دے دے مگر وہ اس کے لئے فائدہ مند نہ ہو۔

یہ جملہ درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ ایک انسان کی آخری آرزو کہ جس سے ہر تر تصور نہیں ہوسکتا یہ ہے کہ وہ تمام روئے زمین کا مالک ہو لیکن ستمگروں اور دعوتِ حق کے مخالفوں کو دئے جانے والے عذاب کی شدت اس حد تک ہے کہ وہ اس بات پر تیار ہوں کہ یہ آخری دنیاوی ہدف بلکہ اس سے بھی برتر و بالاتر کو فدیہ کے طور پر دے کر آزادبوجائیں اور بالفرض اگر ان سے یہ قبول کر بھی لیا جاتا تو یہ صرف عذاب سے نجات ہوتی۔ لیکن دعوتِ حق کو قبول کرنے والوں کے لئے جو انتہائی عظیم اجر ہیں ان کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ”مثله معہ“ صرف اسی معنی میں نہیں کہ پورے کرۂ زمین کی مانند ان کے پاس مزید ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس سے بڑھ کر جنتی زیادہ دولت و سلطنت کے مالک ہو جائیں اور وہ اپنی نجات کے لئے سب کچھ دینے پر تیار ہوں گے۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ انسان چونکہ ہر چیز اپنے لئے چاہتا ہے اور رجب وہ خود عذاب میں غرق ہو تو پھر تمام دنیا کی مالکیت کا اسے کیا فائدہ۔

اس بدبختی (ساری دنیا دے کر بھی نجات حاصل نہ ہونا) کے بعد ایک اور ربد بختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کا حساب کتاب سخت اور برا ہو گا (أُولَئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ)۔

”سوء الحساب“ سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف نظریات ہیں۔ بعض کا نظر یہ ہے اس سے مراد ایسا حساب ہے جو بہت دقیق اور باریک بین ہو اور جس میں کوئی درگزر نہ ہو کیونکہ ”سوء الحساب“ ظلم و ستم کے معنی میں خدا نے عادل کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ امام نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

فلاں شخص کو تجھ سے کیوں شکایت ہے۔

اسے یہ شکایت ہے کہ میں نے اپنا حق اس سے آخر تک لیا ہے۔

جب امام نے یہ بات سنی تو غضب ناک ہو کر بیٹھ گئے، پھر فرمایا :  
 کانک اذا استقضیت حَقَّکَ لَمْ تَسْبِیْ اَرَايْتَ مَا حَکَى اللهُ عَزَّوَجَلَّ: وِیَخَا فُونَ السُّوءِ الْحَسَابِ، تَرَاهُمْ یَخَافُونَ اللهُ اَنْ یَجُورَ عَلَیْهِمْ لَوْ  
 اللهُ مَا خَافُوا اِلَّا الْاِسْتِقْصَاءَ فَسَمَاءُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ سُوءِ الْحَسَابِ فَمَنْ اِسْتَقْصَى فَقَدْ اَسَاءَ۔  
 گویا تیرا گمان ہے کہ اگر تو آخری مرحلہ تک اپنا حق لے لے تو تو نے کوئی بر انہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے۔ کیا تو نے خدا کا  
 یہ ارشاد نہیں دیکھا کہ جس میں اس نے فرمایا ہے :  
 وِیَخَافُ فُونَ السُّوءِ الْحَسَابِ

( او ربد کار برے حساب سے ڈرتے ہیں )۔  
 کیا تیرا خیال ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان پر ظلم کرے گا؟ بخدا ایسا نہیں وہ تو اس سے ڈرتے ہیں کہ خدا ان کا  
 حساب دقیق طور پر لے اور آخری مرحلے تک پہنچائے۔ خدا نے اس کا نام ”سوء الحساب“ رکھا ہے لہذا جس شخص نے  
 حساب کرنے میں سخت گیری کی اس نے برا حساب کیا ہے۔ ۱۔  
 بعض دوسرے مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ”سوء الحساب“ سے مراد یہ ہے کہ ان کا محاسبہ سر زنش کے ساتھ ہو گا۔  
 اس سے ایک تو اصل حساب کی وحشت ہو گی اور اس کے علاوہ بھی وہ سر زنش کی تکلیف سے گزریں گے۔  
 بعض دیگر مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ”سوء الحساب“ سے مراد ”سوء الجزاء“ (برا بدلہ) ہے یعنی ان کے لئے بری  
 سزا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب پاک ہے یا فلاں شخص کا حساب تاریک ہے یعنی ان  
 کے حساب کا نتیجہ اچھا یا برا ہے یا یہ کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص کا حساب اس کے ہاتھ میں دے دو یعنی اس کے کام کے  
 مطابق اسے سزا یا بدلہ دو۔

یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں اور ہوسکتا ہے کہ یہ سب کی سب آیت کی مراد ہوں یعنی ایسے سخت حساب  
 سے گزرنا ہو گا اور محاسبہ کے ساتھ ساتھ انہیں سر زنش بھی ہو گی اور حساب کے بعد انہیں بے کم وکاست سزا بھی دی  
 جائے گی۔

آیت کے آخر میں ان کے لئے تیسرے عذاب یا سزا کے آخری نتیجے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے : ان کا  
 ٹھکانا جہنم ہے اور یہ کیسا بر اٹھکانا ہے (وَمَا أُوَاهُمْ جَهَنَّمَ وِبَسَّ الْمِهَادِ)۔  
 ”مہاد“ اصل میں ”مہد“ کے مادہ سے تیار اور مہیا کرنے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ بستر کے معنی میں بھی آیا ہے کہ  
 جس سے انسان آرام اور استراحت کے موقع پر استفادہ کرتا ہے کیونکہ وہ اسے استراحت کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔  
 یہ لفظ اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے سر کش افراد بجائے بسترِ استراحت پر آرام کرنے کے آگ کے جلا دینے والے شعلوں  
 پر رہیں گے۔

۱۔ تفسیر بر بان جلد ۲ ص ۲۸۸ (یہ حدیث اگر چہ اس سورہ کی آیہ ۲۱ کی تفسیر کے متن میں آئی ہے لیکن واضح ہے کہ یہ لفظ ”  
 سوء الحساب“ کا عمومی مفہوم بیان کر رہی ہے)۔

ایک نکتہ

آیات الہی سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ گروہ ہے خدا  
 کی بارگاہ میں جن کا حساب اور سہولت آسانی سے ہو گا اور اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کسی قسم کی سخت گیری نہیں  
 کرے گا۔ ارشاد الہی ہے :

اما من اوتی کتابہ بيمينہ فسوف يحاسب حساباً يسيراً

اس دن جسے نامہ اعمال دابنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ (انشقاق۔ ۷-۸)

اس کے بر عکس کچھ ایسے لوگ ہیں جن سے ”شدت“ کے ساتھ حساب لیا جائے گا۔ ان سے ذرہ ذرہ اور مثقال بھر کا  
 حساب نہایت باریک بینی سے لیا جائے گا۔ جیسا کہ بعض شہر جن کے لوگ سر کش اور گنہگار تھے، ان کے بارے میں  
 فرمایا گیا ہے :

فحاسبنا حساباً شديداً و عذابناها عذاباً نكراً

پس ہم نے ان کا بڑی سختی سے حساب لیا اور انہیں برے عذاب کی سزا دی۔

اسی طرح زیر بحث آیت میں ہے جس میں ”سوء الحساب“ کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔

یہ اس بناء پر کہ کچھ لوگ دنیاوی زندگی میں دوسروں سے حساب لینے میں بہت زیادہ سختی کرتے ہیں یعنی بال کی کھال

اتارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنے حق کا آخری پیسہ تک وصول کر لیں اور رجب دوسرے سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے تو آخری حد امکان تک اسے سزا دیتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی بیوی، اولاد، بھائیوں اور دوستوں تک سے ذرہ بھر در گزر نہیں کرتے اور چونکہ دوسرے جہان کی زندگی اس جہان کا رد عمل ہے لہذا خدا بھی ان کے حساب کتاب میں ایسی سخت گیری کرے گا تاکہ انہوں نے جو کام بھی کیا ہے اس کے جواب دہ ہوں اور ان کے بارے میں کچھ بھی درگزر اور چشم پوشی نہیں کی جائے گی۔ اس کے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو آسان گیر ہیں بہت زیادہ درگزر کرنے والے ہیں اور نہایت شفیق و مہربان ہیں۔ خصوصاً دوستوں اور جان پہچان والے افراد یا جن پر ان کا کوئی حق ہے یا جو افراد ضعیف اور کمزور ہیں ان کے لئے ایسے مہربان اور بزرگوار ہیں کہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے بہت سے مواقع پر اپنے آپ کو غافل ظاہر کریں اور بعض کی غلطیوں اور گناہوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں البتہ یہاں گناہوں سے مراد ایسے گناہ ہیں جو شخصی اور انفرادی پہلو رکھتے ہیں۔

خدا ایسے افراد کے لئے آسانی فراہم کرتا ہے۔ انہیں اپنی عفو بے پایاں اور رحمت وسیع سے نوازتا ہے اور انہیں آسانی سے حساب کی منزل سے گزار دیتا ہے۔

یہ بات تمام انسانوں کے لئے، خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو کسی امر کے سربراہ یا نگران ہوتے ہیں اور لوگوں سے ان کا رابطہ اور تعلق ہوتا ہے ان کے لئے ایک عظیم درس ہے۔

#### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ رعد / 19 تا 24

۱۹. أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ إِنَّمَا يَنْتَكِرُ الْوَلُؤَ الْأَلْبَابِ.
۲۰. الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْقُضُونَ الْمِيثَاقَ.
۲۱. وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ.
۲۲. وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرُؤُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ.
۲۳. جَنَّاتٌ عَدْنٌ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ.
۲۴. سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ.

ترجمہ

- ۱۹۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے، اس شخص کی طرح ہے جو نابینا ہے بس سمجھدار لوگ ہیں نصیحت حاصل کرتے ہیں۔
- ۲۰۔ وہی کہ جو عہد الہی کو وفا کرتے ہیں اور پیمان شکنی نہیں کرتے۔
- ۲۱۔ وہی کہ جو وہ پیوند برقرار رکھتے ہیں کہ جن کے بارے میں خدا نے حکم دیا ہے اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور (روز قیامت کے) حساب کی برائی سے ڈرتے ہیں۔
- ۲۲۔ اور وہ کہ جو اپنے پروردگار کی (پاک) ذات کے لئے صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انہیں جو روزی دی ہے اس میں سے پنہاں اور آشکارا خرچ کرتے ہیں اور حسنات کے ذریعے سیئات کو ختم کرتے ہیں۔ ان کے لئے آخرت میں اچھا گھر ہے۔
- ۲۳۔ وہ جنت کے سدا بہار باغوں میں داخل ہوں گے اسی طرح ان کے آباء، ازواج اور اولاد میں سے صالح افراد بھی (داخل بہشت ہوں گے) اور ہر دروازے سے ان کے لئے فرشتے داخل ہوں گے۔

۲۴۔ ( اور ان سے کہیں گے ) سلام ہو تم پر ، صبر و استقامت کی بناء پر ۔ تمہیں یہ آخری گھر کیسا اچھا نصیب ہوا ہے ۔

اہل شعور کا طرز عمل جنت کے آٹھ دروازے  
زیر نظر آیات میں حق کے طرفداروں کے اصلاحی طرز عمل کے جزئیات کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ یہ آیات گزشتہ  
آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں ۔  
زیر نظر پہلی آیت میں استفہام انکاری کی صورت میں فرمایا گیا ہے : کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ تیرے پر وردگار کی  
طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے حق ہے ، اس شخص جیسا ہے جو نابینا ہے (أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّ أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ  
الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى) ۔

یہ کیسی عمدہ تعبیر ہے ۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص جانتا ہے کہ یہ قرآن پر حق ہے کیا وہ اس کی مانند ہے کہ جو نہیں  
جانتا بلکہ فرمایا گیا جو جانتا ہے وہ اندھے کی طرح ہے ؟ یہ تعبیر ایک اس امر کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ اس  
حقیقت کو نہ جاننا کسی بھی طرح ممکن نہیں سوائے اس کے کہ انسان کے دل کی آنکھ بالکل بے کار ہو چکی ہو ورنہ کیسے  
ممکن ہے کہ چشم بینا رکھنے والا رخ آفتاب نہ دیکھ سکے اور اس قرآن کی عظمت بالکل نور آفتاب کی مانند ہے ۔  
اسی لئے آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے : صرف وہی لوگ نصیحت پاتے ہیں جو اولو الالباب ہیں اور صاحبان فکر و  
نظر ہیں ( إِنَّمَا يَنْتَظِرُ أَوْلَا الْأَلْبَابِ) ۔

”اللباب“ جمع ہے ”لب“ کی جو ہر چیز کے ”مغز“ کے معنی میں ہے ۔ اسی بناء پر ”اولو الالباب“ کا متضاد ہے مغز ،  
کھوکھلے اور وہ افراد ہیں جن کے اندر کچھ نہ ہو۔

بعض عظیم مفسرین کے بقول یہ آیت لوگوں کو حصول علم اور جہالت کا زیادہ سے زیادہ مقابلہ کرنے کی تاکید کرتی ہے  
کیونکہ اس میں ہے علم اور دانش سے محروم افراد کو نابینا قرار دیا گیا ہے ۔

اس کے بعد ”اولو الالباب“ کی تفسیر کے طور پر صاحبان حق کے طرز عمل کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں سب سے  
پہلے ایفائے عہد کرتے ہیں اور پیمان شکنی نہیں کرتے ( الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنْفُضُونَ الْمِيثَاقَ) ۔

اس میں شخص نہیں کہ ”عہد اللہ“ ( عہد الہی ) کا ایک وسیع مفہوم ہے ۔ اس میں فطری عہد و پیمانہ کہ جو خدا نے  
تضاجانے فطرت کے مطابق انسان سے لئے ہیں وہ بھی شامل ہیں ۔ مثلاً توحید اور حق عدالت سے انسان کی فطری محبت  
کا عہد ۔ اسی طرح عقلی عہد پیمان یعنی وہ عہد کہ جو غور و فکر سوچ بچار اور قوتِ عقل کے نتیجے میں ناگزیر ہو  
جاتے ہیں جیسے عالم ہستی اور مبداء و معاد کے حقائق کا ادراک انہیں غور و فکر کے نتیجے میں کر لیتا ہے ۔  
اسی طرح اس میں شرعی پیمان شامل ہیں یعنی وہ پیمان جو پیغمبر نے مومنین سے لیا ہے کہ وہ احکام خدا وندی کی  
اطاعت کرینگے اور اس کی نا فرمانی اور گناہ ترک کر دینگے ۔

یونہی وہ پیمان کہ جو انسان دوسرے انسانوں سے باندھتا ہے عہد الہی کے مفہوم میں شامل ہیں کیونکہ خدا ہی کا حکم ہے  
کہ یہ پیمان بھی پورے کئے جائیں بلکہ ایسے پیمان تشریحی بھی ہیں اور عقلی بھی ۔

اہل شعور کے لائحہ عمل کا دوسرا حصہ رشتہ ناتوں کی حفاظت اور پاسداری ہے ، جیسا کہ فرمایا گیا ہے : یہ وہی لوگ  
ہیں جو ان رشتوں اور رابطوں کو قائم رکھتے ہیں جن کی حفاظت کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے (وَالَّذِينَ يَصِلُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ  
أَنْ يُوصَلَ) ۔

اس سلسلے میں اس سے زیادہ وسیع تعبیر نہیں مل سکتی کیونکہ انسان کا تعلق خدا سے بھی ہے ، انبیاء سے بھی ہے ،  
اور رہبروں سے بھی ہے ۔ انسان کا رابطہ باقی تمام انسانوں کے ساتھ بھی ہے چاہے وہ دوست ہوں ، ہمسائے ہیں ، رشتہ  
دار ہوں ، دینی بھائی ہوں یا ہم نوع ہوں ۔

اس کا تعلق خود اپنے ساتھ ہے ۔ مندرجہ بالا حکم میں تمام رشتہ ناتوں کو محترم شمار کیا گیا ہے ۔ سب کا حق ادا کرنا  
چاہئیے اور ایسا کام انجام نہیں دینا چاہئیے جس سے ان میں سے کسی ایک سے تعلق منقطع ہونے تک جا پہنچے ۔  
درحقیقت انسان ایک ایسا موجود نہیں جو دوسرے سے کٹ کر او ر جدا ہو کر رہ سکے بلکہ اس کا وجود سر تا پا رشتے  
ناتوں ، تعلق اور رابطوں سے تشکیل پاتا ہے ۔

ایک طرف سے اس کا تعلق پیدا کرنے والے کی بارگاہ سے ایسا ہے کہ اگر یہ اسے منقطع کر لے تو نابود ہو جائے ۔ جیسے  
ایک بلب کا رابطہ اگر بجلی پیدا کرنے والے مبداء سے کٹ جائے ۔ لہذا جیسے تکوینی لحاظ سے انسان اس عظیم مبداء سے  
تعلق رکھتا ہے چاہئیے کہ تشریحی اعتبار سے بھی اس کے ساتھ اطاعت کا رشتہ برقرار رکھے۔

دوسری طرف اس کا رشتہ پیغمبر اور امام سے رہبر ، راہنما اور پیشوا کے حوالے سے ہے اور ارگ یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو  
انسان بے راہ رو اور سرگرداں ہو جائے گا۔ تیسری طرف انسان کا ایک رشتہ پورے انسانی معاشرے سے بھی ہے

خصوصاً ان افراد سے جو اس پر زیادہ حق رکھتے ہیں جیسے ماں ، باپ ، رشتہ دار ، دوست اور مربی۔ چوتھی طرف اپنی ذات سے بھی اس کا ایک تعلق ہے اس لحاظ سے وہ اپنے مصالح کی حفاظت اور اپنی ترقی اور کمال تک پہنچنے کا ذمہ دار ہے ۔

در حقیقت ان تمام رشتوں اور رابطوں کو برقرار رکھنا ”یصلون ما امر الله به ان یوصل“ کا مصداق ہے اور ان میں سے کسی کو منقطع کرنا، ما امر الله به ان یوصل“ کو منقطع کرنا ہے کیونکہ خدا نے ان تمام کے ”وصل“ کا حکم دیا ہے ۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے کہ اس سے ان احادیث کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جو آیت کی تفسیر میں کبھی خاندان اور رشتہ داروں سے تعلق کو قائم رکھنے کا کہتی ہیں ، کبھی امام اور پیشوائے دین سے مر بوط رہنے کا کہتی ہیں ، کبھی آل محمد سے رابطے کا حکم دیتی ہیں اور کبھی تمام اہل ایمان سے تعلق کو کہتی ہیں ۔ مثلاً ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ سے ” الذین یصلون ما امر الله به ان یوصل“ کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو۔

فقال قرابتک

فرمایا : تیرے اپنے قریبی مراد ہیں ۔ ( نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۹۴ ) ۔

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام ہی سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

نزلت فی رحم آل محمد و قد یکون فی قرابتک

یہ جملہ آل محمد کے رشتے کے بارے میں ہے نیز تیرے اپنے قریبوں کے بارے میں بھی ہے ۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ امام نے فرمایا:

فلاتکونن ممن یقول للشیء انه فی شیء واحد

تو ایسا شخص نہ ہو جا کہ جو آیت کے معنی کو ایک ہی مصداق میں منحصر کر دے ۔ ( نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۹۴ ) ۔

نیز ایک تیسری حدیث بھی اسی عظیم راہنما سے مروی ہے جس میں آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا :

هو صلہ الامام فی کل سنة بما قل او کثر ثم قال وما ارید بذلک الا تزکیتکم

اس سے مراد مسلمانوں کے امام اور پیشوا سے ہر سال مالی امداد کے ذریعے رشتہ برقرار رکھنا ہے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ ۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

اس کام سے میری مراد صرف یہ ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ کروں ۔ (نور الثقلین جلد ۲ ص ۴۹۵) ۔

حامیان حق کا تیسرا اور چوتھا طرز عمل یہ ہے کہ ”وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور قیامت کی عدالت کے حساب

کی برائی سے خوف کھاتے ہیں (وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ) ۔

اس سلسلے میں کہ ”خشیت“ اور ”خوف“ میں کیا فرق ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں ، بعض نے کہا ہے

کہ ”خشیت“ وہ خوف ہے جو دوسرے کے احترام اور علم و یقین کی بنیاد پر ہو ۔ لہذا قرآن میں یہ حالت علماء سے

مخصوص شمار کی گئی ہے ۔ ارشاد الہی ہے :

انما یخشی الله من عباده العلمائ

بندگان خدا سے صرف علماء اس سے خشیت رکھتے ہیں ۔ (فاطر - ۲۸) ۔

لیکن قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے ان بہت سے مواقع کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ

لفظ بالکل ”خوف“ کے مترادف کے طور پر آیا ہے اور اس کا ہم معنی ہے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا پروردگار سے ڈرنا اس کے حساب و کتاب اور عذاب و سزا سے ڈرنے

کے علاوہ کوئی اور خوف ہے ، اور اگر ایسا ہے تو پھر ”یخشون ربہم“ اور ”یخافون سوء الحساب“ کے درمیان کیا فرق

ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا سے ڈرنا ہمیشہ اور لازماً اس کے عذاب اور حساب کتاب سے ڈرنے کے معنی میں نہیں ہے

بلکہ یہ خوف اس کے مقام کی عظمت کا احساس ہے اور بندگی کی ذمہ داری کے سنگین ہونے کے خیال سے (یہاں تک کہ

سزا اور عذاب کی طرف توجہ کے بغیر بھی یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے) اہل ایمان کے دلوں میں یہ احساس خود بخود ایک

خوف اور وحشت کی حالت پیدا کر دیتا ہے ۔ وہ خوف جو ایمان کی پیداوار ہے ، عظمت الہی سے آگہی کا نتیجہ ہے اور اس

کی بارگاہ میں احساس مسئولیت کی بدولت ہے (سورہ فاطر کی آیہ ۲۸ ممکن ہے اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا) ۔

ایک اور سوال یہاں ”سوء الحساب“ کے حوالے سے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا قیامت میں واقعاً محاسبہ اعمال کے

موقع پر بعض افراد کو ”بد حسابی“ کا سامنا کرنا پڑے گا ۔

گزشتہ چند آیات کے ذیل میں ہم اس سوال کا جواب ذکر کر چکے ہیں۔ وہاں بھی بالکل یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہاں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کسی در گزر کے بغیر تمام جزئیات کا باریک بینی سے حساب لیا جاتا ہے۔ اصطلاحاً جسے بال کی کھال اتارنا کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جاذب نظر حدیث بھی وارد ہوئی ہے جو وہاں بیان کی جا چکی ہے۔

نیز جیسا کہ ہم نے وہاں کہا ہے کہ یہ احتمال بھی ہے کہ ”سوء الحساب“ سے مراد ایسا محاسبہ ہ و کہ جس میں سر زنش بھی شامل ہو۔ بعض نے ”سوء الحساب“ کی تفسیر ”سوء الجزاء“ یعنی بری سزا کے طور پر کی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں کا حساب چکا دو یعنی اسے سزا دو۔

ہم نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ”سوء الحساب“ کا ایک جامع مفہوم ہے اور اس میں یہ تمام معانی شامل ہیں۔ ان کا پانچواں طرز عمل تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت ہے، وہ مشکلات کہ جو اطاعت، ترک گناہ دشمن کے خلاف جہاد اور ظلم و سرکشی کے مقابلے کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ ۱

وہ صبر و استقامت بھی پروردگار کی رضا اور خوشنودی کی خاطر ہو۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں (وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ)۔

ہم بار بار صبر کے معنی کہ جو استقامت کے وسیع مفہوم کا حامل ہے، کے بارے میں وضاحت کر چکے ہیں۔ رہا ”وجہ ربہم“ تو اس کے دو میں سے ایک معنی ہیں۔

پہلا یہ کہ ”وجہ“ ایسا موقع پر ”عظمت“ کے معنی میں ہے جیسے کسی اہم نظرے اور رائے کے بارے میں کہا جاتا ہے:

هَذَا وَجْه الرَّأْيِ

یعنی یہ اہم رائے ہے۔

اور یہ شاید اس بناء پر ہے کہ اصل میں ”وجہ“ کا معنی ہے ”چہرہ“ اور انسان کا چہرہ ظاہری بدن کا اہم ترین حصہ ہے کیونکہ بینائی، شنوائی اور گویا نی جیسے اہم اعجاز اس میں موجود ہیں۔

دوسرا یہ کہ ”وجہ رب“ یہاں ”پروردگار کی رضا“ کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ لوگ حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے تمام مشکلات کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں۔ اس معنی میں ”وجہ“ استعمال اس بناء پر ہے کہ جب انسان کسی کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے چہرے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے (اس بناء پر ”وجہ“ یہاں کنایتاً آیا ہے)۔

بہر صورت یہ جملہ اس مر کے لئے واضح دلیل ہے کہ صبر و شکیبائی بلکہ کلیۃً ہر عمل خیر اسی صورت میں قدر و قیمت رکھتا ہے جب ”ابتغاء وجہ اللہ“ اور خدا کے لئے ہو اور اگر اس کے کوئی اور اسباب ہوں مثلاً ریا کاری اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنا کہ وہ سمجھیں کہ یہ بڑا صابر اور نیکو کار شخص ہے یا حتیٰ اپنے غرور کے پیش نظر کوئی کام انجام دے تو پھر اس کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں ہے۔

بعض مفسرین کے بقول کبھی انسان ناگوار حوادث پر صبر کرتا ہے تاکہ لوگ کہیں کہ یہ کس قدر صابر اور صاحب استقامت ہے، کبھی اس خوف سے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ کیسا کم ظرف آدمی ہے، کبھی اس لئے کہ دشمن اسے طعنہ نہ دیں، کبھی اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ بے تابی اور داد فریاد یہاں فضول ہے کبھی اس لئے کہ لوگوں کے سامنے اپنی مظلومیت پیش کرے تاکہ لوگ اس کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں ان امور میں سے کوئی بھی نفس انسانی کے کمال کی دلیل نہیں ہے۔ لیکن جس وق حکم خدا کی اطاعت کی بناء پر اور اس لئے کہ زندگی میں رونما ہونے والے ہر حادثے کی کوئی وجہ، حکمت اور مصلحت ہوتی ہے کوئی شخص صبر و استقامت سے کام لیتا ہے اور اس طرح وہ اس حادثے کی عظمت کو ختم کر دیتا ہے، کفر ان میں زبان نہیں کھولتا اور ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو جزع و فزع کی دلیل بنے تو یہی وہ صبر ہے کہ جس کی طرف آیت بالامین اشارہ کیا گیا ہے اور یہی صبر ”ابتغاء وجہ اللہ“ شمار ہوتا ہے۔

ان کا چھٹا طرز عمل یہ ہے کہ ”وہ نماز قائم کرتے ہیں“ (وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ)۔

نماز قائم کرنا اگر چہ عہد الہی کے وفا کرنے کے مصادیق میں سے ہے بلکہ خدائی رشتوں کی حفاظت کا ایک زندہ مصداق ہے اور ایک لحاظ سے صبر و استقامت کے مصادیق میں سے ہے لیکن ان کلی مفہیم کے بعض مصادیق بہت اہم ہیں جو انسانی سرنوشہ میں بہت زیادہ موثر ہیں لہذا ان کی خصوصی طور پر نشاندہی کی گئی ہے۔

اس سے بڑھ کر اہم کیا بات ہوگی کہ انسان ہر صبح شام خدا سے اپنے رابطے اور تعلق کی تجدید کرے، اس کے ساتھ راز و نیاز کے لئے کھڑا ہو، اس کی عظمت اور اپنی ذمہ داریوں کو یاد رکھے اور اس عمل کے ذریعے اپنے قلب و روح سے

گناہ کا غبار اور زنگ دھو ڈالے اور پانے قطرہ وجود کے ہستی حق کے بیکراں سمندر سے ملحق ہونے کا شرف حاصل کرے، جی ہاں! نماز میں یہ تمام اثرات و برکات موجود ہیں۔

اس کے بعد حق جو افراد کا ساتواں طرز عمل اسی طرح سے بیان کیا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ ہمارے عطا کردہ رزق سے پنہان و آشکار خرچ کرتے ہیں (وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً)۔

انفاق اور رزق کا مسئلہ صرف اسی آیت میں نماز کے بعد بیان نہیں ہوا بلکہ بہت سی آیات قرآن میں زکوٰۃ کو نماز کے پہلو میں رکھا گیا ہے کیونکہ ان میں سے ایک چیز انسان کے رشتے کو ”خدا“ سے مستحکم کرتی ہے اور دوسری ”مخلوق“ سے تعلق کو۔

یہاں اگر ہم ”ممارزقناہم“ کی طرف توجہ دیں تو وہ ہر قسم کی عنایت و بخشش کے بارے میں چاہے مال ہو یا علم، طاقت و حیثیت ہو یا اجتماعی اثر و رسوخ ایسا ہونا ضروری بھی ہے کیونکہ انفاق اور خرچ کرنے کا ایک پہلو نہیں ہو چاہئے، بلکہ یہ خرچ تمام پہلوؤں سے اور تمام نعمات سے ہونا چاہئے۔

”سرا و علانۃ“ (پنہان اور آشکار) یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے مصارف میں اس حقیقت کی طرف بھی نظر رکھتے ہیں کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر انفاق مخفی طور پر ہوتو وہ زیادہ موثر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر دوسرے کی حیثیت کا تقاضا ہو کہ اسے مخفی رکھا جائے یا انفاق کرنے والا ریا اور دکھاوے سے بچنا چاہتا ہو اور کبھی انفاق آشکار طور پر کیا جائے تو اس کا اثر زیادہ وسیع ہوتا ہے مثلاً ایسے مواقع پر جبکہ ایسا کرنا دوسروں کی تشویق کا باعث بنے اور انہیں اس عمل کی اقتدا کی ترغیب دے اور انفاق کرنے کا ایک عمل ایسے سینکڑوں اور ہزاروں کاموں کا سبب بنے۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مثبت عمل کی انجام دہی کے لئے قرآن کس قدر باریک بینی سے کام لیتا ہے وہ صرف اصل کام کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ تاکید کرتا ہے کہ اصل عمل بھی خیر ہو اور اس کے انجام پانے کی کیفیت بھی اچھی ہو (ایسے مواقع پر جہاں ایک کام کی انجام دہی مختلف کیفیات سے ممکن ہو)۔

آخر میں اس کا آٹھواں اور آخری طرز عمل بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ ”حسنات“ (نیکیوں) کے ذریعے اپنی ”سینات“ (برائیوں) کو ختم کر دیتے ہیں (وَيَذُرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ)۔

اس معنی میں کہ وہ ایک گناہ اور لغزش کے ارتکاب پر صرف پشیمان ہونے اور ندامت و استغفار پر قناعت نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر تلافی کے لئے قدم اٹھاتے ہیں اور جس قدر ان کا گناہ اور لغزش زیادہ ہو اسی قدر حسنات اور نیکیاں بھی زیادہ انجام دیتے ہیں تاکہ اپنے اور معاشرے کے وجود سے گناہ کی آلودگی کو حسنات کو پانی سے دھو ڈالیں۔

”یرؤن“ ”درء“ (بروزن ”زرع“) کے مادہ سے دفع کرنے کے معنی میں ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ برائی کی تلافی برائی کے ذریعے نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی شخص کی طرف سے انہیں برائی پہنچے تو اس کے حق میں نیکی انجام دے کر اسے شرمندہ ہونے اور تجدید نظر پر آمادہ کریں جیسا کہ سورہ فصلت کی آیت ۳۵ میں ہے:

ادفع بالتي هي احسن فاذا الذي بينك وبينه عداوة كانه ولي حميم

بدی کو اس طریقہ سے اپنے سے دور کر جو زیادہ اچھا ہے کیونکہ اس موقع پر وہ شخص جس کے اور تیرے درمیان عداوت ہے اپنا چہرہ یوں بدل لیتا ہے گویا وہ تیرا مخلص اور پکا دوست ہے۔

بہر حال اس میں کوئی ممانع نہیں کہ زیر بحث آیت دونوں مفاہیم لئے ہوئے ہو۔ احادیث اسلامی میں بھی کچھ احادیث دونوں تفاسیر بیان کرتی ہیں۔

ایک حدیث پیغمبر اکرم سے منقول ہے، آپ معاذ بن جبل سے فرماتے ہیں:

فاذا عملت سيئة فاعمل بجنبها حسنة تمحها۔

جب کوئی برا کام کر بیٹھو تو اس کے ساتھ ہی کوئی نیک کام انجام دو جو اسے محو کر دے۔

مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عائب اخاك بالاحسان اليه وارادو شره بالانعام عليه۔

اپنے بھائی کو کوئی غلط کام انجام دینے پر نیکی کے ذریعے سرزنش کرو اور اس کے شر کو انعام اور احسان کے ذریعے اس کی طرف پلٹا دو۔

البتہ ان طرف توجہ رہے کہ یہ ایک اخلاقی حکم ہے جو بعض مواضع سے مخصوص ہے کہ جہاں اس قسم کی طرز عمل موثر ہوتا ہے ورنہ حد جار ی کرنا اور بدکاروں کو سزا دینا اسلام کے قوانین میں سے ہیں اور ان تمام افراد کے لئے یکساں طور پر ہے کہ جو اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

مختلف طرز عمل کے بعد ”اولو الباب“ صاحبان فکر و نظر، طرفداران حق اور ایسے طریقوں پر عمل کرنے والوں کے انجام کا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: دوسرا گھر جو نیک اور اچھی عاقبت کا حامل ہے، ان کے لئے (أُولَئِكَ لَهُمْ عَقَبَى الدَّارِ) ۳۔

بعد والی آیت میں اس نیک انجام اور عاقبت خیر کی توضیح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کا انجام کا جنت کے دائمی باغات ہیں کہ جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے اور ان کے صالح اور نیک آباؤ و اجداد، ازواج اور اولاد بھی (جَنَّاتٌ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ)۔

اور جو چیز ان عظیم اور بے پایاں نعمتوں کی تکمیل کرتی ہے یہ ہے کہ ”ہر دروازے سے ان کے لئے فرشتے داخل“ (وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ)۔

اور انہیں کہیں گے ”تم پر سلام ہو تمہارے صبر و استقامت کی بناء پر (سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ)۔ ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اور شدائد و مصائب پر داشت کرنے میں تمہارا صبر و استقامت ہے جو اس اسلامی کا باعث ہوا ہے یہاں انتہائی امن، آرام اور چین و سکون سے رہو گے۔ یہاں نہ جنگ و جدال ہے، نہ نزاع ہے، نہ سختی، نہ مخالفت ہے اور نہ جھگڑا، ہر جگہ امن ہی امر ہے اور تمام چیزیں تمہارے سامنے تبسم کنان ہیں اور ایسا آرام و سکون جس میں اضطراب قلب کا شائبہ تک نہیں وہ یہیں پر ہے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے یہ کیسا اچھا انجام اور کیسی اچھی عاقبت ہے (فَنِعْمَ عَقَبَى الدَّارِ)۔

.....

۱. صبر صرف اطاعت، مصیبت سے بچنے اور مصیبت کے موقع پر منحصر نہیں ہے بلکہ نعمت کے موقع پر بھی صبر کرنا چاہیے یعنی وہ انسان کو مغرور اور بے لگام نہ بنادے۔
۲. نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۵۸۔
۳. ”عقبی“ عاقبت اور انجام کار کے معنی میں ہے چاہے اچھا ہو یا برائیکن قرینہ حالیہ اور مقالیہ کی طرف توجہ کی جائے تو مذکورہ آیت میں اس سے مراد عاقبت خیر ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ صرف ”صبر“ کا ذکر کیوں ہوا ہے؟ ”سلام علیکم بناصرتم“ کے جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتے اہل جنت یوں سے کہیں گے: ”تم پر تمہارے صبر و استقامت کی وجہ سے سلام ہو“ حالانکہ مندرجہ بالا آیت میں ان کے آٹھ قسم کے اچھے کاموں اور اہم طرز ہائے عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس جملے میں آٹھ امور میں سے صرف ”صبر“ کی نشاندہی ہی کی گئی ہے۔

اس امر کی وجہ حضرت علی کے ایک زندہ اور پر مغز بیان سے سمجھی جاتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ان الصبر من الایمان کالرأس من الجسد ولاخیر فی جسد لارأس معه ولافی ایمان لاصبر معه۔

صبر کی ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کی جسم سے ہے۔ بدن سے کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا اور ایمان ہی صبر کے بغیر کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ 1

درحقیقت تمام انفرادی اور اجتماعی اصلاحی پروگراموں کا سہارا صبر و شکیبائی اور استقامت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ان میں سے کچھ بھی انجام نہیں پاسکتا کیونکہ ہر مثبت کام کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں ہوتی ہیں کہ جن پر صبر و استقامت کی قوت کے بغیر کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی نہ ایفائے عہد صبر و استقامت کے بغیر ممکن ہے، نہ خدا رشتوں کی حفاظت اس کے بغیر ممکن ہو سکتی ہے، نہ اسکے بغیر خدا اور عدالت قیامت کا خوف ہوتا ہے، نہ اس کے بنا قیام نماز ممکن ہے، نہ خدائی نعمتوں میں سے اس کے بغیر کراچ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر حسنات کے ذریعے خطاؤں کی تلافی ہو سکتی ہے۔

۲۔ جنت کے دروازے: آیات قرآن سے بھی اور روایات سے بھی یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ جنت کے دروازے ہیں لیکن یہ متعدد دروازے اس بناء پر نہیں ہیں کہ جنت میں داخل ہونے والوں کی تعداد اس قدر ہے کہ اگر وہ ایک ہی دروازے سے داخل ہونا چاہیں تو زحمت ہوگی، نہ ہی اس کی وجہ یہ ہے کہ طبقات میں اختلاف ہے اور جس کی بناء پر ہر گز گروہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دروازے سے آئے، نہ ہی اس کی وجہ راستے کی نزدیکی یا دوری ہے اور نہ ہی دروازوں کی کثرت خوبصورتی زیبائی اور تنوع کا باعث ہے اصولی طور پر جنت کے دروازے دنیا کے دروازوں کی طرح نہیں ہیں کہ وباغات، محلات اور مکانات میں داخل ہونے کے لئے ہوتے ہیں بلکہ یہ دروازے اعمال و

کردار کی طرف اشارہ ہیں کہ جو جنت میں داخل ہونے کا سبب ہوں گے اسی لئے چند ایک احادیث میں ہے کہ جنت کے دروازے کے مختلف نام ہیں۔ ان میں سے ایک کانام ”باب المجاہدین“ (مجاہدین کا دروازہ) ہے اور مجاہدین اسی اسلحہ سے مسلح ہو کر اس دوازے سے جنت میں داخل ہوں گے جس کے ساتھ وہ جہاد کر تے تھے اور فرشتے انہیں ”خوش آمدید“ کہیں گے۔ 2-

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

اعلموا ان للجنة ثمانية ابواب عرض كل باب منها ميسرة اربعين سبعة

جان لو کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں کہ جن میں ہر دروازے کا عرض چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے۔ 3-

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ ایسے مواقع پر دروازے کا مفہوم ہماری روزمرہ کی گفتگو سے وسیع تر ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قرآن حکیم میں ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں: لہذا سبعة ابواب (حجر ۴۴)

اور روایات کے مطابق جنت کے اس آٹھ دروازے ہیں یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جہنم مینہنچنے کے راستوں کی نسبت

سعادت بہشت جاوداں تک پہنچنے کے راستے زیادہ ہیں اور خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے جیسا کہ

دعاء جوشن کبیر کے الفاظ ہیں: یا من سبقت رحمتہ غضبہ

اس سے بھی زیادہ جاذب نظر امر یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں بھی ”اولوالالباب“ کے طرزبائے عمل کے بارے میں آٹھ

کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک دراصل جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور سعادت جاوداں

تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

۳۔ اہل جنت سے وابستگی رکھنے والے ان سے جاملیں گے: نہ صرف مندرجہ بالا آیت بلکہ قرآن کی دوسری آیات بھی یہ بات

صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ جنت میں اہل بہشت اور ان کے ماں باپ، بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک اور صالح

ہوں گے داخل ہوں گے یہ درحقیقت ان پر خدائی نعمات کی تکمیل ہے تاکہ وہ وہاں کسی قسم کی کمی محسوس نہ کریں

یہاں تک کہ جن افراد سے ان کا لگاؤ ہے ان کی جدائی بھی نہ ہونیز چونکہ اس دار آخرت میں کہ جو نیا اور کامل گھر ہے

ہر چیز تازہ اور نئی ہوتی ہوجاتی ہے لہذا وہ لوگ بھی تازہ اور نئے چہروں کے ساتھ اور زیادہ خلوص و محبت کے ساتھ

وہاں داخل ہوں گے، ایسی مہر و محبت کو جو نعمات بہشت کی قدر و قیمت کئی گناہ کر دے گی۔

مندرجہ بالا آیت میں اگرچہ صرف ماں باپ، اولاد اور ازواج کا ذکر ہے لیکن درحقیقت وہاں تمام وابستگان اکٹھے ہوں گے

کیونکہ اولاد اور ماں باپ (یا باپ داد) کی موجودگی بہن بھائیوں کے بغیر بلکہ دیگر وابستگان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

تھوڑا سا غور و خوض کیا جائے تو یہ مطلب واضح ہوجاتا ہے کیونکہ نیک باپ جنتی ہے لہذا اس کے تمام بیٹے اس سے

آملیں گے۔ اس طرح بھائی آپس میں مل جائیں گے اور اسی طرح دیگر وابستگان اور عزیز و اقارب اکٹھے ہوجائیں گے (

کیجئے گا)۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اہل جنت اہل بہشت کے لئے ابدی اور جاودانی گھر ہے لیکن جیسا کہ ہم

نے سورہ توبہ کی آیہ ۷۲ کے ذیل میں کہا جاتا ہے، قرآن کی چند ایک آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات۔ عدن میں ایک

مخصوص مقام ہے جو جنت کے دیگر باغات سے امتیاز رکھتا ہے اور اس میں صرف تین طرح کے لوگ رہیں گے انبیاء

مر سلین صدقین (یعنی انبیاء کے خاص دوست احباب) اور شہدا۔ 7-

7۔ مزید وضاحت کے لئے جلد ۸ (ار دو ترجمہ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

۵۔ گناہ کے آثار دھلنا: اجمالی طور پر ”حسنات“ اور ”سینات“ ایک دوسرے پر متقابل اثر رکھتے ہیں اور اسمیں کوئی شک

و شبہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہم اس چیز کے نمونے اپنی روزمرہ زندگی میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان

سالہا سال زحمت اٹھاتا ہے اور بہت زیادہ محنت و مشقت کر کے سرمایہ جمع کرتا ہے لیکن ناسمجھی، ہوس و ہوس کی پیروی

یا بے پرواہی سے اسے گنوا بیٹھتا ہے یہ بالکل مادی حسنات کو گنوا بیٹھنے کے اور کچھ نہیں ہے جسے قرآن میں ”حبط“

سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس کبھی انسان بہت سی غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے اور ان کے باعث سنگین خسارے

کے بوجھ تلے دب جاتا ہے لیکن ایک عقلمندانہ عمل سے یا عاشقانہ جہاد کے ذریعے ان سب نقصانات کی تلافی کر دیتا ہے

۔ مثلاً ہمارے زمانے کے اسی اسلامی انقلاب میں ہم نے بہت سے افراد دیکھے ہیں کہ وہ سابق ظالم و جابر نظام میں بہت

سے گناہوں کے مرتکب ہوئے تھے اور اسی وجہ سے وہ جیل میں تھے لیکن جب ملک کے دشمنوں کے خلاف جہاد شروع

ہوا تو اس وقت ان کی فوجی مہارت کی بناء پر انہیں میدان جنگ میں آنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے بی بے نظیر

شجاعت و فداکاری سے پیکر دشمن پر مہلک ضربیں لگائیں۔

اس دوران ان میں سے بعض شہید ہو گئے اور بعض زندہ ہیں۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے اپنی گزشتہ غلطیوں کی

تلافی کر لی ۔

زیر بحث آیات کہ جن میں فرمایا گیا ہے :

ویدرءون بالحسنة السینة

اہل ایمان عقلاء اور ارباب فکر و نظر اپنی برائیوں کو نیکیوں کے ذریعے دور کرتے ہیں ۔

یہ اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ غیر معصوم انسان کبھی نہ کبھی غلطیوں اور لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس کے بعد وہ ان کی تلافی کی فکر میں رہے نہ صرف گناہ کے اجتماعی آثار جو اپنے اعمال خیر کے ساتھ دھو ڈالے بلکہ وہ ظلمت گناہ جو انسان کے قلب و روح پر جا پڑتی ہے اسے بھی ”حسنات“ کے ذریعے دور کرے اور اسے فطری نورانیت اور شفافیت کی طرف پلٹا لے ۔ قرآن کی زبان میں اس کام کو ”تکفیر“ ( ڈھانپنا ) اور پاک کرنا کہتے ہیں ( اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۶۶ ( اردو ترجمہ ) کی طرف رجوع کریں ) ۔ البتہ جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں ہو سکتا ہے ” ویدرءون بالحسنة“ ایک اور راہم اخلاقی فضیلت کی طرف اشارہ ہو اور وہ یہ کہ ” اولوالالباب“ دوسروں کی برائی کا برائی سے جواب نہیں دیتے اور انتقام لینے کی بجائے نیکی اور اچھائی کرتے ہیں تاکہ دوسرا خود شرمندہ ہو جائے ، پاکیزگی کی طرف پلٹ آئے اور اپنی اصلاح کر لے ۔

سورہ رعد / 25 تا 26

۲۵۔ وَالَّذِينَ يَبْغُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۔

۲۶۔ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَفَرَحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۔

ترجمہ

۲۵۔ اور وہ کہ جو عہد الہی کو مستحکم ہونے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو قطع کر دیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور روئے میں میں دفساد کرتے ہیں ان کے لئے لعنت اور آخرت کے گھر کی بدی ( اور سزا ) ہے ۔  
۲۶۔ خدا جسے چاہتا ہے ( اور اہل سمجھتا ہے ) وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے ( مستحق سمجھتا ہے ) تنگ کر دیتا ہے لیکن وہ دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہیں جب کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا وی زندگی متاع ناچیز ہے ۔

.....

- 1۔ جناتِ عدن کیا ہے ؟ جنات“ کامعنی ہے ”باغات“ اور ”عدن“ کامعنی ہے ” طولانی توقف“ اور یہاں ابدیت اور ہمیشگی کے معنی میں ہے اور یہ جو ” معدن“ ( کان ) کو ” معدن“ کہتے ہیں وہ بھی اس جگہ کسی مواد کے طولانی توقف کی بناء پر ہے ۔
- 2۔ منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغہ جلد ۳ ص ۹۹۵۔
- 3۔ خصال صدوق ابواب ثمانیہ۔

دنیا پرست تباہ کار

چونکہ نیک و بد ہمیشہ ایک دوسرے سے موازنہ کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں لہذا ” اولوالالباب“ اور حق پرست افراد کہ جن کا تفصیلی ذکر گزشتہ آیات میں آیا ہے کہ صفات بیان کرنے کے بعد محل بحث آیات کے کچھ حصوں میں مفسدین اور وہ کہ جو واقعی اپنی عقل و کفر گنوا بیٹھے ہیں کی چند بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے : اور وہ کہ جو عہد خدا وندی کو محکم کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو منقطع کر دیتے ہیں جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور روئے زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان پر لعنت ہے اور دار آخرت کا عذاب ان کے لئے مخصوص ہے ( وَالَّذِينَ يَبْغُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ) ۔

در حقیقت ان کے تمام اعتقادی و عملی مفسد کا خلاصہ مذکورہ تین عہد و پیمان میں بیان کر دیا گیا ہے :-

(۱) خدائی عہد و پیمان کو توڑنا جس میں فطری ، عقلی اور شرعی عہد و پیمان شامل ہیں ۔

(۲) روابط اور رشتوں کو منقطع کرنا ۔ خدا سے رابطہ ، خدائی رپروں سے رابطہ ، مخلوق سے رابطہ اور اپنے آپ سے

رابطہ -

(۳) آخری حصہ کہ جو پہلے دو حصوں کا نتیجہ ہے روئے زمین میں فساد کرنا۔ جو شخص پیمان الہی توڑتا ہے اور ہر طرف سے رشتوں کو منقطع کر دیتا ہے کیا وہ فتنہ فساد کے علاوہ کوئی کام انجام دے سکتا ہے ، یہ کاوشیں ان لوگوں کی جانب سے مادی مقاصد کے لئے ہی کی جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں وہ کسی بلند مقصد کے قریب ہونے کی بجائے دو ہو جاتے ہیں کیونکہ ”لعنت“ رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے ۔ ۱

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں ”دار“ گھر اور سرائے ( بصورتِ مطلق آیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی گھر آخرت والا گھر ہی ہے کیونکہ دوسرا ہر گھر آخر کار خلل پذیر ہو گا اور ٹوٹ پھوٹ جائے گا ۔ بعد والی آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے : خدا جسے چاہتا ہے وسیع رزق دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے ( اللّٰهُ يَسُّطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ) ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ زیادہ سے زیادہ دنیا سمیٹنے کے لئے روئے زمین پر فساد کرتے ہیں وہ خدائی رشتوں کو توڑتے ہیں اور خدا کے ساتھ عہد شکنی کرتے ہیں تاکہ مادی زندگی کے لئے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کر سکیں لیکن وہ اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ رزق اور اس میں کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے ۔ علاوہ ازیں یہ جملہ ایک سوال کا جواب بھی ہوسکتا جو آیت میں صراحت سے نہیں آیا اور وہ یہ کہ گزشتہ آیات میں حق و باطل کے طرفدار دو گروہوں کے ذکر کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ خدا اپنے رزق اور نعمات سے کس طرح نوازتا ہے تو آیت اس سوال کے جواب میں کہتی ہے کہ روزی اور اس کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے ۔ بہت صورت یہ روزی جلد گزر جانے والی متاع ہے جب کہ وہ چیز جسے اہمیت دی جا نا چاہئے وہ آخرت کا گھر اور رابدی سعادت ہے تاہم اس کے بارے میں اہم نکتہ یہ ہے کہ رزق کے لئے ”مشیتِ الہی“ یہ خدا نہیں کہ بغیر حساب کے اور اسباب سے فائدہ اٹھائے بغیر کسی کو رزق فراوان دے دے یا اس کی روزی کو کم کر دے بلکہ اس کی مشیت کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اسے اس عالم کے اسباب کے اندر تلاش کرے کیونکہ : ” الی اللہ این یجری الامور الیاسبابہا “ یعنی خدا چاہتا ہے کہ تمام امور اسباب کے ساتھ ہی روپذیر ہوں ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : عہد شکن اور فساد فی الارض کرنے والے دنیاوی زندگی پر ہی خوش ہیں حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی متاعِ ناچیز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ( وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ) ۔

نکرہ کی صورت میں ”متاع“ کا ذکر اس کا حقیر ہونا ظاہر کرنے کے لئے ۔ جیسا کہ ہم فارسی میں کہتے ہیں : فلاں موضوع ”مٹاعی“ بیش نیست  
فلاں چیز ”ایک متاع“ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ۔  
یعنی بے وقعت متاع ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ مفسد فی الارض ” کون ہے ؟ ”فساد“ کہ جو ”اصلاح“ (درستی) کا متضاد ہے ہر قسم کی تخریب کاری اور تباہ کاری کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے ۔ راغب نے مفردات میں کہا ہے :  
الفساد خروج الشيء عن الاعتدال قليلا كان او كثيرا و يصاده الصلاح، و يستعمل ذلك في النفس و البدن و الاشياء الخارجة عن الاستقامة۔

چیزیں حالتِ اعتدال سے کس طرح بھی خارج ہو جائیں ، کم یا زیادہ، اسے فساد کہتے ہیں ۔ اس کا متضاد ”صلاح“ ہے ۔ یہ جان و بدن اور ان تمام خرابیاں جو مختلف کاموں میں پیدا ہوتی ہیں اور تمام انفرادی یا اجتماعی مسائل میں ہر قسم کا افراط اور تقریب ”فساد“ کا مصداق ہیں قرآن مجید میں بھی بہت سے مواقع پر ”فساد“ اور ”صلاح“ ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے ہیں ۔ سورہ شعراء کی آیت ۱۵۲ میں ہے :

الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون

وہ لوگ جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے ۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں ہے :

و اللہ یعلم المفسدین من المصلح

خدا مفسدین کو مصلحین میں سے پہچانتا ہے ۔

سورہ اعراف کی آیت ۱۴۲ میں ہے :

واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین

اصلاح کرو اور مفسدین کی راہ کی پیروی نہ کرو۔

بعض مواقع پر ایمان اور عمل صالح کو فساد کے مقابلہ میں قرار دیا گیا ہے :

ام نجعل الذین آمنوا و عملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض

کیا ہم ایمان لانے والوں اور عمل صالح بجالانے والوں کو مفسدین فی الارض کی طرح قرار دیں - (ص-۲۸)

دوسری طرف بہت سی آیات قرآن میں لفظ ”فساد“ کو ”فی الارض“ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جو نشاندہی کرتا ہے کہ

مسئلے کے اجتماعی پہلوؤں پر نگاہ ہے - یہ تعبیر قرآن میں بیس سے زیادہ مواقع پر دکھائی دیتی ہے -

تیسری طرف قرآن مجید کی مختلف آیات میں ”فساد“ افساد“ ایسے گناہوں کے ساتھ آیا ہے جو شاید زیادہ تر مصداق کی

حیثیت رکھتے ہیں - ان میں سے بعض گناہ بہت بڑے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں - کبھی تو خدا اور رسول خدا اور رسول

سے جنگ کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے ، مثلاً:

انما جزاؤ الذین یحاربون اللہ و رسولہ و یسعون فی الارض فساداً

ان لوگوں کی جزاء کے جو اللہ اور اس کے رسول سے جنت کرتے ہیں اور زمین میں فساد کے در پے ہیں (مائدہ

-۳۳) کبھی نسل اور زراعت کو تباہ کرنے کے پلہ قرار پایا ہے ، مثلاً

و اذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیہا ویہلک الحرث و النسل

اور جہاں منہ پھیرا تو ادھر دوڑ دھوپ کرنے لگا تاکہ زمین میں فساد پھیلانے اور زراعت اور نسل کا ستیا ناس کر دے - (

بقرہ - ۲۰۵)

کبھی اس کا ذکر ان رشتوں کو منقطع کرنے کے ساتھ آیا ہے جنہیں قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے ، مثلاً:

الذین ینقضون عہد اللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض

وہ لوگ کہ جو اس سے میثاق باندھنے کے بعد عہد الہی کو توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے

انہیں قطع کر دیتے ہیں اور اور زمین میں فساد کرتے ہیں - (بقرہ - ۲۷)

کبھی اسے بڑا بننے کی خواہش اور سر کشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ، مثلاً

تلك الدار الاخره نجعلها للذین لا یریدون علواً فی الارض و لا فساداً

یہ آخرت کا گھر ہے جو ہم نے ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو زمین پر بڑا ہونے کی خواہش اور فساد بر پا کرنے کا

ارادہ نہیں رکھتے - (قصص - ۸۳)

کبھی قرآن ”فرعون“ کو مفسد گردانتا ہے اور دریائے نیل میں غرق ہوتے ہیں وقت اسکے توبہ کرنے کے متعلق کہتا ہے :

الاول و قد عصیت قبل و کنت من المفسدین

اب ایمان لاتا ہے حالانکہ پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو مفسدین میں سے تھا - (یونس - ۹۱)

کبھی یہی لفظ ”فساد فی الارض“ چوری کے لئے استعمال ہوا ہے - جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے

متعلق ہے کہ انہوں نے چوری کی تہمت لگنے کے بعد کہا:

تالله لقد علمتم ماجئنا لنفسد فی الارض و ما کنا سارقین

بخدا تم جانتے ہو کہ ہم سر زمین مصر میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم کبھی بی چور نہ تھے - (یوسف - ۷۳)

کبھی یہ لفظ کم فروشی کے ہم پلہ ہو کر آیا ہے ، جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعے میں ہے کہ وہ اپنی قوم سے

کہتے ہیں :

ولا تبخسوا الناس اشیاء ہم ولا تعثوا فی الارض مفسدین

کم فروشی نہ کرو اور لوگوں کے حق میں کمی نہ کرو اور زمین پر فساد نہ پھیلاتے پھرو - (ہود - ۸۵)

اور کبھی نظام عالم ہستی اور جہاں خلقت کو خراب اور تباہ کرنے کے معنی میں آیا ہے :

لو کان فیہما الہة الا الہ لفسد تا

اگر زمین و آسمان میں اللہ کہ جو خدائے یگانہ ہے کہ علاوہ اور خدا ہوتے تو یہ فاسد ، خراب اور برباد ہو جاتے

- (انبیاء - ۲۲)

ان تمام آیات سے کہ جو قرآن کی مختلف سورتوں میں آئی ہیں اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ ”فساد“ بطور کلی ”یا“ فساد

فی الارض“ ایک بہت ہی وسیع معنی رکھتا ہے - اس کے مفہوم میں بڑے بڑے جرائم مثلاً فرعون اور دوسرے اَمروں کے

جرائم اور ان سے کم تر کام یہاں تک کہ کم فروشی اور لین دین میں دھوکا بازی جیسے گناہ بھی شامل ہیں - فساد کے وسیع

مفہوم یعنی حد اعتدال سے ہر قسم کا اخراج، کی طرف توجہ رکھی جائے تو یہ وسعت پوری طرح قابل فہم ہے۔ نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ عذاب اور سزاؤں کو میزان جرم کے مطابق ہونا چاہیے: واضح ہوتا ہے کہ ان ”مفسدین“ میں سے ہر گروہ کو ایک الگ سزا ملنا چاہیے اور سب کے لئے ایک جیسی سزا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سورہ مانہ کی آیہ ۳۳ کہ جسمیں ”مفسد فی الارض“ کا ذکر ”خدا اور رسول کے محارب“ کے ساتھ آیا ہے، ان کے لئے چار قسم کی سزائیں ہیں۔ یقیناً حاکم شرع کے ذمہ ہے کہ وہ ان چار سزاؤں (قتل کرنا، سولی پر لٹکانا، ہاتھ پاؤں کاٹنا اور جلا وطن کرنا) میں سے جرم کی مقدار کے مطابق ایک سزا منتخب کرے، ہمارے فقہانے فقہی کتب میں محارب اور مفسد فی الارض کی بحث میں ان سزاؤں کی شرائط اور حدود و تفصیل سے بیان کی ہیں۔ 2

ایسے مفساد کی بیخ کنی کے لئے ہر موقع پر کسی ذریعے سے متمسک ہونا پڑے گا۔ کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پہلا مرحلہ یعنی پندو نصیحت اور تذکر ہی کافی ہوتا ہے لیکن کبھی ایسا وقت آجاتا ہے کہ شدت عمل کے آخری درجہ یعنی جنگ کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

ضمناً فساد فی الارض کی تعبیر ہمیں انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ایک حقیقت کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی مفساد عام طور کسی خاص مقام سے تعلق نہیں رکھتے اور انہیں کسی ایک علاقے میں محصور نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کی وسعت پورے معاشرے اور پوری زمین تک ہوتی ہے اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ کی طرف سرایت کرتے ہیں۔

آیات قرآنی سے یہ نکتہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بعثت انبیاء کے عظیم مقاصد سے ایک ”وسیع مفہوم میں“ زمین سے فساد ختم کرنا ہے۔ جیسا کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت شیعہ علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ وہ اپنی سرکش قوم کے فساد کے مقابلے میں کہتے ہیں:

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت

میرا ہدف صرف یہ ہے کہ جتنا استطاعت میں ہے فساد کے خلاف جنگ کروں اور اصلاح کروں۔ (ہود-۸۸)

۲۔ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن: مندرجہ بالا آیات ہی نہیں جو کہتی ہیں کہ روزی کی کمی بیشی خدا کے ہاتھ میں ہے بلکہ قرآن کی مختلف آیات سے واضح طور پر یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ خدا جس شخص کی چاہتا ہے روزی وسیع کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے کم کر دیتا ہے لیکن اس کا وہ مطلب نہیں جو بعض جاہل لوگ خیال کرتے ہیں کہ کوشش و کار کردگی سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے اور گوشہ نشین ہو جانا چاہیے تاکہ جو کچھ مقدر میں ہے خدا دے دے۔ ان لوگوں کی منفی سوچ مذاہب کو افیون قرار دینے والوں کے لئے بڑی اہم سند ہے۔

یہ لوگ دو بنیادی نکتوں سے غافل ہیں:

پہلا یہ کہ خدا کا چاہنا اور اس کی مشیت و ارادہ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہوا ہے وہ کوئی من پسند اور بغیر کسی کلیہ قاعدہ والا معاملہ نہیں بلکہ اسی طرح ہے جس طرح ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ خدا کی مشیت و ارادہ اس کی حکمت سے جدا نہیں ہے بلکہ ہمیشہ لیاقت اور اہلیت پر موقوف ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ مسئلہ عالم اسباب کی نفی میں نہیں ہے کیونکہ عالم اسباب یعنی جہان تکوینی بھی اس کی مشیت تکوینی ہے اور وہ کبھی بھی اس مشیت تشریحی سے جدا نہیں ہوتی۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رزق کی وسعت و تنگی کے بارے میں خدا کا ارادہ کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے کہ جو انسانوں کی زندگی پر رحم فرماہیں۔ کوشش، ہمت اور اخلاص اور اس کے برعکس سستی، تن آسانی، بخل اور زمینوں کی آلودگی اس میں نتیجہ خیز اثر رکھتی ہے۔ اسی بناء پر قرآن مجید نے بار بار انسان کو اس کی سعی و کوشش اور رجہد و فعالیت کا مرہون منت شمار کیا ہے اور زندگی میں اس کے حصہ کو سعی و کوشش کی میزان پر ٹولا ہے۔ اسی لئے وسائل الشیعہ کی کتاب تجارت میں ایک باب حصول رزق کے لئے کوشش سے متعلق ہے نیز کچھ ابواب بیکاری، زیادہ سونے اور ضروریات زندگی کے حصول میں سستی کی مذمت کے بارے میں بھی ہیں۔

ان ابواب میں منقول احادیث میں سے ایک حدیث جو امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے، میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان الاشیاء لما ازدوجت ازدوج الكسل والعجز فنتجایبہما الفقر

جب شروع شروع میں موجودات نے ایک دوسرے سے ازدواج کیا تو سستی اور عجز ناتوانی نے آپس میں شادی رچائی اور ان سے جو بچہ پیدا ہوا وہ ”فقر“ تھا۔ 3

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا تکتسوا فی طلب معاشکم فان ابائنا کانوا یرکضون فیہا ویطلبونہا

حصولِ رزق میں ضرورت۔ زندگی مہیا کرنے میں سستی سے کام نہ لو کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد ان کے حصول میں دوڑا کرتے تھے اور ان کے لئے تلاش و جستجو کرتے تھے۔ 4  
 ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے :  
 انی لابیغض الرجل ان یکون کسلاناً عن امر دنیاہ، ومن کسل عن امر دنیاہ فہو عن امر آخرتہ اکسل۔  
 میں ایسے شخص سے ناراض ہوں جو اپنے کارِ دنیا میں سست ہو کہ کیونکہ جو کارِ دنیا میں سست ہے ( اگرچہ وہ اس کا نتیجہ جلد بھگتے گا تاہم ) وہ آخرت کے معاملے میں زیادہ سست ہو گا۔ 5  
 نیز امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے ، آپ نے فرمایا:  
 ان الله تعالى لیبغض العبد النوام ، ان الله لیبغض العبد الفارغ  
 یقیناً خدا تعالیٰ زیادہ سونے والے اور بیکار شخص سے ناراض ہے۔ 6

.....

- ۱۔ راغب نے کتاب مفردات میں کہا ہے : ” اس طرح سے دور کرنے کے معنی میں ہے جس میں غصہ ملا ہوا ، جب آخرت میں خدا کی طرف اس لفظ کی اضافت ہو تو سزا کے معنی میں ہے اور دنیا میں رحمت منقطع ہونے کے معنی میں ہے اور اگر لوگوں کی طرف سے ہو تو پھر نفرین کے معنی میں ہے ۔
- 2۔ ہم نے بھی سورہ ماندہ کی آیہ ۳۳ کے ذیل میں ( جلد ۴ پر ) اس سلسلے میں ضروری وضاحت کی ہے ( ار دو ترجمہ دیکھئے ) ۔
- 3۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲۔ ص ۳۸۔
- 4۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲۔ ص ۳۸۔
- 5۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲۔ ص ۳۷۔
- 6۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۲۔ ص ۳۷۔

#### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ رعد / 27 تا 29

- ۲۷۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أُنَابَ ۔
- ۲۸۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔
- ۲۹۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ وَحَسُنَ مَا أَجَبَ ۔

ترجمہ

- ۲۷۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے آیت ( اور معجزہ ) کیوں نازل نہیں ہوتا۔ کہہ دو: خدا جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرتا ہے اور جو شکس اس کی طرف پلٹ آتا ہے اسے ہدایت کرتا ہے ( معجزے کی کمی نہیں ان کی ہٹ دھرمی رکاوٹ کا باعث ہے ) ۔
- ۲۸۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل یادِ خدا سے مطمئن ( اور پر سکون ) ہیں یاد رکھو کہ یادِ خدا سے دل مطمئن ہوتے ہیں ۔
- ۲۹۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے پاکیزہ ترین ( زندگی ) اور بہترین انجام ان کا نصیب ہے ۔

یاد الہی باعثِ تسکینِ دل ہے

اس سورت میں چونکہ توحید ، معاد اور رسالت پیغمبر کے بارے میں بہت سی مباحث ہیں لہذا زیر بحث پہلی آیت دوبارہ پیغمبر اسلام کی دعوت کے مسئلے کی طرف لے جاتی ہے ۔ اس میں ہٹ دھرم منکرین کا ایک اعتراض بیان کیا گیا ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : کافرین کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر معجزہ نازل کیوں نہیں ہوتا (وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ)۔

لفظ ”يقول“ فعل مضارع ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بار بار اعتراض کرتے تھے اور باوجودیکہ انہوں نے رسول اللہ سے بار بار معجزات دیکھتے تھے (اور ہر پیغمبر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقانیت کے ثبوت میں کچھ معجزات پیش کرے) پھر بھی وہ بہانے تراشتے تھے اور گزشتہ معجزات کو نظر انداز کر دیتے تھے اور اپنی من پسند کے نئے معجزے کا تقاضا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ لوگ اور تمام بٹ دھرم منکرین ہمیشہ اپنی مرضی کے معجزات ڈھونڈتے رہتے تھے کہ پیغمبر اور توقع رکھتے تھے کہ پیغمبر ایک جادو گر کی طرح کہیں بیٹھ جائیں اور ان میں سے ہر کوئی جائے اور جو معجزہ طلب کرے وہ فوراً پیش کر دیں اور اگر پھر بھی یہ نہ چاہیں تو ایمان نہ لائیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ پہلے درجے میں انبیاء کی ذمہ داری ہے کہ تبلیغ، تعلیم اور تنبیہ کا ذریعہ اختیار کریں۔ معجزات تو استثنائی امور ہیں کہ جس حسب ضرورت وہ بھی حکم خدا سے (نہ پیغمبر کی خواہش کے مطابق) انجام پاتے ہیں لیکن ہم بار بار آیات قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ دشمنوں کے کئی گروہ اس حقیقت کی پرواہ کئے بغیر ہمیشہ انبیاء کے خلاف مزاحمت کرتے رہے ہیں اور اس قسم کی فرمائشیں کرتے رہے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے : اے پیغمبر ۱ ان سے کہہ دو خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو شخص اس کی طرف لوٹے اسے ہدایت کرتا ہے (قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أُنَابَ)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے لئے معجزے کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں کیونکہ پیغمبر نے کافی مقدار میں معجزات دکھائے ہیں کمی خود تمہارے وجود اندر ہے۔ بٹ دھرمیاں، تعصبات، جہالتیں وہ گناہ کہ جو توفیق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں تمہارے ایمان لانے میں حائل ہیں لہذا خدا کی طرف لوٹو، توبہ رو، جہالت و غرور اور خود خوابی کے پردے اپنی نگاہ فکر سے ہٹاؤ تاکہ واضح طور پر جمال حق کا مشاہدہ کر سکو، کیونکہ : جمال یار نثار و نقاب و پردہ ولی غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد جمال دوست پر تو کوئی نقاب نہیں ہے لیکن راستے کا غبار ہٹا دو تاکہ میں اسے دیکھ سکوں۔

بعد والی آیت میں ”من اناب“ (جو خدا کی طرف پلٹ آئے ہیں) کی بہت عمدہ تفسیر بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل ذکر الہی سے مطمئن اور پر سکون ہیں (الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ)۔ اس کے بعد ایک دائمی وسیع اصول کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے : آگاہ ہو کہ یاد الہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں اور قرار پاتے ہیں (الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ)۔

زیر بحث آخری آیت میں اہل ایمان کا انجام کار بیان کر کے گزشتہ آیت کا مضمون یوں مکمل کیا گیا ہے : وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور انہوں نے صالح اعمال انجام دئے ان کے لئے بہترین زندگی ہے اور ان کا انجام کار بہترین ہوگا (الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَى لَهُمْ وَحَسُنَ مَا أَتَى)۔ بہت سے بزرگ مفسرین نے لفظ ”طوبی“ کو ”اطیب“ کامونٹ سمجھا ہے جس کا مفہوم ہے بہتر، پاکیزہ تر یا بہترین اور پاکیزہ ترین۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس کا متعلق محذوف ہے اس لفظ کا مفہوم ہر لحاظ سے وسیع اور غیر محدود ہوگا۔

اس کا نتیجہ یہ ہو ا کہ ”طوبیٰ لہم“ کے ذریعے ان کے لئے تمام سعادتوں اور پاکیزگیوں کی پیش بینی کی گئی ہے۔ ان کے لئے تمام چیزوں میں سے بہترین مہیا ہوں گی۔

بہترین زندگی، بہترین نعمتیں، بہترین آرام اور سکون، بہترین دوست و احباب اور پروردگار کی بہترین اور خاص مہر بانیاں یہ سب کی سب ایمان اور عمل صالح کی مربوون منت ہیں اور یہ ان کے لئے اجر ہے جو عقیدے کے لحاظ سے محکم اور عمل کے لحاظ سے پاک، فعال، درست کار اور خدمت گزار ہیں۔

لہذا اس لفظ کی مختلف مفسرین کی طرف جو مختلف تفسیریں ہوئی ہیں وہ سب اس کی مصداق ہیں۔ یہاں تک کہ مجمع البیان میں اس کے دس معانی ذکر ہوئے ہیں جو حقیقت میں اس کے وسیع معنی کے مختلف مصداق ہیں۔ کئی ایک روایات میں بھی ہے کہ ”طوبیٰ“ ایک درخت ہے جس کی جڑیں جنت میں رسول اللہ یا حضرت علی کے گھر میں ہیں اور اس کی شاخیں ہر جگہ تکام مومنین اور ان کے گھروں پر سایہ فگن ہیں۔ ہوسکتا یہ روایات ان عظیم پیشواؤں اور ان کے پیروکاروں کے درمیان ان کے مقام رببری اور نہ ٹوٹنے والے رشتوں کی تصویر کشی کرتی ہوں جن کا نتیجہ ایسی طرح طرح کی نعمات ہیں۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں لفظ ”طوبیٰ“ مونٹ کے طور پر آیا ہے اور ”اطیب“ نہیں آیا کہ جو منکر ہے تو اس کی وجہ یہ ہے

کہ یہ حیات یا نعمت کی صفت ہے اور یہ دونوں الفاظ مونث ہیں ۔

چند اہم نکات

۱۔ یاد الہی سے دل کو کیسے سکون ملتا ہے ؟

انسانوں کی زندگی میں اضطراب اور پریشانی ہمیشہ سے ایک بڑی مصیبت کے طور پر موجود ہے ۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اس کے اثرات پوری طرح محسوس ہوتے ہیں ۔ سکون و قرار ہمیشہ سے انسان کی زندگی کی ایک قیمتی گمشدہ چیز رہی ہے ۔ اس کی تلاش میں انسان ہر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے ۔ اگر ہم پوری تاریخ بشر میں صحیح یا غلط طریقے سے کی گئی ان کوششوں کا ذکر کریں کہ جو سکون قرار حاصل کرنے کے لئے کی گئیں تو بہت ہی ضخیم کتاب بن جائے ۔ بعض ماہرین اور علماء کہتے ہیں کہ بعض ہمہ گیر بیماریاں جب پھیلتی ہیں اور وباء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں تو جو افراد ظاہراً اس وبائی بیماری کی وجہ سے مرتے ہیں ان میں سے اکثر خوف اور پریشانی کی وجہ سے دم توڑ دیتے تھوڑے ہی افراد ایسے ہوتے ہیں جو حقیقتاً اس بیماری میں مبتلا ہو کر ختم ہوتے ہیں ۔

اصولی طور پر سکون و پریشانی فرد اور معاشرے کی سلامتی و بیماری اور سعادت و بد بختی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے اور یہ ایسی چیز نہیں ہے جس سے آسانی سے گزر جایا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بہت سی کتابیں پریشانی اور اضطراب قلب پر قابو پانے اور آرام و سکون حاصل کرنے کے طریقوں پر لکھی گئی ہیں ۔ تاریخ بشر ایسے غم انگیز مناظر سے بھری پڑی ہے کہ انسان نے تلاش سکون میں ہر چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا، وادی وادی پھرا اور طرح طرح کی عادتیں اپنائیں ۔

لیکن قرآن نے ایک مختصر اور پر مغز جملے میں انتہائی اطمینان کے لئے نزدیک ترین راستے کی نشاندہی کی ہے ۔

ارشاد ہوتا ہے : جان لو کہ یاد خدا دلوں کے لئے آرام بخش اور باعث سکون ہے ۔

اس قرآنی حقیقت کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل توضیح کی طرف توجہ کیجئے :-

پریشانی اور اضطراب کے عوامل (۱) اضطراب و پریشانی کبھی تاریک اور مبہم مستقبل کی فکر کی بناء پر ہوتی ہے ۔ نعمتوں کا زوال ، دشمن کے چنگل میں گرفتاری ، ضعف کمزوری ، بیماری ، ناتوانی ، درماندگی اور حاجتمندی کا احتمال یہ سب چیزیں انسان کو پریشان کر دیتی ہیں لیکن قادر و متعال اور رحیم و مہربان خدا پر ایمان وہ خدا کہ جو ہمیشہ سے اپنے بندوں کی کفالت اپنے ذمہ لئے ہوئے ہے ۔ ایسی پریشانیوں کو دور کر سکتا ہے اور اسے سکون دے سکتا ہے ۔ اس کی یاد یہ حوصلہ دے سکتی ہے کہ آنے والے حوادث کے مقابلے میں تو در ماندہ اور بے یار و مدد گار نہیں ہے تو توانا، قادر اور مہربان خدا رکھتا ہے ۔

۲۔ کبھی ماضی کی تاریک زندگی فکر انسانی کو اپنی طرف مشغول رکھتی ہے اور ہمیشہ اسے پریشان کئے رہتی ہے ان گناہوں پر پریشانی کہ جو اس نے انجام دئے ہیں اور وہ کوتاہیاں اور لغزشیں جو اس سے سر زد ہوئی ہیں اسے ستاتی رہتی ہیں لیکن اس طرف توجہ کہ خدا غفار، توبہ قبول کرنے والا، رحیم اور غفور ہے ، اسے سکون دیتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ اس کی بارگاہ میں تقصیر و کوتاہی پر معذرت چاہو، گزشتہ گناہوں پر عذر خواہی کرو اور ان کی تلافی کی کوشش کرو کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور تلافی ممکن ہے ۔

۳۔ کبھی طبعی اور مادی عوامل کے مقابلے میں انسان کی کمزوری و ناتوانی اور کبھی داخلی و خارجی دشمنوں کی کثرت اسے پریشان کر دیتی ہے کہ میں طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں میدان جہاد میں کیا کروں یا ان سے دیگر مقابلوں میں کیا کر سکتا ہوں لیکن جب وہ خدا کو یاد کرتا ہے اور اس کی قدرت و رحمت پر بھروسہ کرتا ہے وہ قدرت جو تمام طاقتوں سے برتر ہے اور رکھتی اس کے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتا تو اس کے دل کو سکون آجاتا ہے اور وہ اپنے آپ سے کہتا ہے : وہاں ! میں اکیلا نہیں ہوں ، خدا کے سائے میں میری طاقت لامتناہی ہے ۔

جنگوں میں مجاہدین ۔ راہ خدا کا جذبہ گزشتہ زمانہ ہو یا موجودہ ان کی تعجب انگیز اور خیرہ کن جنگیں یہاں تک کہ ان مواقع پر بھی جب وہ یک و تنہا ہوتے ہیں ان سے وہ سکون و اطمینان واضح ہوتا ہے کہ جو صرف سایہ ایمان میں پیدا ہوتا ہے ۔

جب ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں یا کان سے سنتے ہیں کہ ایک افسر رشید خیرکن معرکے میں اپنی بینائی بالکل کھو بیٹھتا ہے اور وہ مجروح بدن کے ساتھ ہسپتال میں چار پائی پر پڑا ہوتا ہے لیکن ایسے سکون دل اور اطمینان قلب سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے گویا اس کے بدن پر کوئی خراش تک نہیں آئی اس سے ہم ذکر ، خدا کے زیر سایہ پر اعجاز سکون کا

۱۔ ایسے واقعات ہم پر دشمنوں کی مسلط کردہ ایران عراق جنگ میں ایک نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ یہ واقعات مجاہدین بد اور دیگر اسلامی جنگوں کے مجاہدین کی تازی کرتے ہیں۔

۴۔ کبھی انسان کی تکلیف دہ پریشانیوں کی بنیاد زندگی کے لئے بے مقصد ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور زندگی میں تکامل و کمال حاصل کرنے کو ایک عظیم مقصد کے طور پر اپنائے ہوئے ہے اور زندگی کے تمام امور و حوادث کو اسی مقصد کو روشنی میں دیکھتا ہے اسے نہ زندگی کے بے کار ہونے کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بے ہدف اور ٹھکرائے ہوئے افراد کی طرح مضطرب و سرگرداں ہوتا ہے۔

۵۔ پریشانی کا ایک اور عامل یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایک ہدف تک پہنچنے کے لئے بہت زیادہ زحمت اٹھاتا ہے لیکن اسے کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا جو اسی زحمت و مشقت کا قدر دان ہو۔ یہ ناقدری اسے شدید دکھ دیتی ہے اور اسے ایک عالم اضطراب و پریشانی میں غرق کر دیتی ہے لیکن جب وہ احساس کرتا ہے کہ کوئی ہے جو اس کی تمام مساعی اور کاوشوں سے آگاہ ہے، وہاں سب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور وہ ان سب پر اجر و ثواب دے گا تو پھر وہ کیوں پریشان اور بے چین ہوگا۔

۶۔ بدگمانیاں، توہمات اور بے ہودہ خیالات بھی پریشانی کے عوامل میں سے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی وجہ سے اپنی زندگی میں رنج اٹھاتے ہیں لیکن کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے لطف و کرم کی یاد نیز اس حکم کی طرف توجہ کہ ہر صاحب ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حسن ظن سے کام لے اسے یہ پریشانی جاتی رہتی ہے اور اس کی جگہ سکون و اطمینان لے لیتا ہے۔

۷۔ دنیا پرستی اور مادی زندگی کی رنگیوں پر دلہا خستگی انسانوں کے اضطراب و پریشانی کا ایک بہت بڑا عامل رہا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات لباس، جوتے، ٹوپی یا ہزاروں چیزوں میں سے کسی ایک کا خاص رنگ نہ مل سکے تو دنیا پرست کئی گھنٹے، کئی دن یا کئی ہفتے پریشان اور بے آرام رہتے ہیں لیکن خدا پر ایمان اور ایسی چیزوں سے مومن کی آزادی ایسی تمام پریشانیوں کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ ایک مومن ہمیشہ اصلاحی زہد کا حامل ہوتا ہے اور وہ مادی زندگی کی رنگینیوں کا قیدی نہیں ہوتا۔

جس وقت انسانی روح اتنی وسعت حاصل کر لے کہ وہ علی علیہ السلام کی طرح کہے:

دنیاکم هذه اھون عندی من ورقۃ فی فم جرادة تقضمھا

تمہاری دنیا میری نظر میں درخت کے اس پتے سے بھی حقیر ہے جو ایک ٹڈی دل کے منہ میں ہو جسے وہ جبا رہی ہو۔ ۱  
تو پھر کسی مادی چیز تک اسکا نہ پہنچنا یا سے کھو بیٹھنا انسانی روح کا سکون کیسے درہم برہم کر سکتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں کیونکر پریشانی پیدا کر سکتا ہے۔

۸۔ پریشانی کا ایک اور اہم عامل موت کا خوف بھی ہے یہ خوف ہمیشہ انسانوں کی روح کو ستائے رکھتا ہے۔ موت کا امکان چونکہ صرف زیادہ بڑی عمر میں نہیں بلکہ دوسرے سالوں میں بھی ہے، خصوصاً بیماریوں، جنگوں اور بدامنیوں کی حالت میں لہذا یہ وحشت اور خوف عمومی ہو سکتا ہے۔

البتہ اگر ہم عالم شناسی کے حوالے سے موت کو فنا اور رہر چیز کے خاتمے کے معنی میں سمجھیں (جیسا کہ مادی نظریہ رکھنے والوں کا خیال ہے) تو پھر یہ اضطراب بالکل بجا ہے۔ ایسی موت سے واقعاً ڈرنا چاہیئے جو انسان کی تمام آرزوں اور کامیابیوں کا آخری نقطہ ہو لیکن اگر خدا پر ایمان کی وجہ سے موت کو ایک وسیع تر اور اعلیٰ تر زندگی کا دریچہ سمجھا جائے اور موت سے گزرنے کو زندان کے دالان سے گزر کر ایک آزاد فضا تک پہنچنا شمار کیا جائے تو پھر یہ پریشانی بے معنی ہے بلکہ ایسی موت اگر ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے آئے تو اسے پسند کیا جانا چاہیئے اور وہ چاہے جانے کے قابل ہے۔

پریشانی کے عوامل انہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اس کے اور بھی بہت سے عوامل شمار کئے جاسکتے ہیں لیکن یہ بات

قابل قبول ہے کہ زیادہ تر پریشانیوں کی بازگشت مذکورہ عوامل ہی کی طرف ہے لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عوامل خدا پر ایمان کے مقابلے میں پگھل جاتے ہیں ، بے رنگ ہو جاتے ہیں اور نابود ہو جاتے ہیں تو پھر اس بات کی تصدیق کرنا پڑے گی کہ خدا کی یاد دلوں کے سکون و قرار کا باعث ہے (الابذکر اللہ تطمئن القلوب) ۲

۲۔ کیا خوفِ خدا اور اطمینانِ باہم مطابقت رکھتے ہیں ؟ بعض مفسرین نے یہاں ایک اعتراض اٹھایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم مذکورہ آیت میں پڑھتے ہیں کہ یادِ خدا دلوں کے سکون و اطمینان کا باعث ہے جب کہ دوسری طرف سورہ انفال کی آیت ۲ میں ہے :

انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم

مومن وہ ہیں کہ جس وقت خدا کا ذکر کیا جائے تو ان کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

کیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں ؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آرام و سکون سے مراد وہی عوامل کے مقابلے میں سکون ہے کہ جو عام لوگوں ک پریشان کیے رکھتے ہیں ، جن کے واضح نمونے ہم نے سطور بالا میں پیش کئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اہل ایمان اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں دوسرے لفظوں میں جو چیز ان میں نہیں ہوتی وہ ویران گر پریشانیوں ہیں جو دنیا میں عام طور پر ہوتی ہیں باقی رہی اصلاحی پریشانی کہ جو انسان کو خدا اور مخلوق کے بارے میں احساسِ ذمہ داری پر ہوتی ہے اور جو زندگی میں مثبت کردار اور آمادہ کرتی ہے وہ ان میں موجود ہوتی ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے اور خوفِ خدا سے مراد بھی یہی ہے ۔3

۳۔ ”ذکرِ خدا“ کیا ہے اور کس طرح ہے ؟ جیسا کہ راغب اصفہانی نے مفردات میں کہا ہے ”ذکر“ کبھی مطالب و معارف کے حفظ کے معنی میں آتا ہے ، اس فرق کے ساتھ کہ لفظ ”حفظ“ اس کی ابتداء میں بولا جاتا ہے اور لفظ ”ذکر“ اسے جاری رکھتے ہوئے اور کبھی کسی چیز کو زبان سے یاد دل میں یاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ ”ذکر“ دو قسم کا ہے ”ذکرِ قلبی“ ذکرِ زبانی“۔ ان میں ہر ایک پھر دو طرح کا ہے یا تو فراموشی کے بعد ذکر یا بغیر فراموش کئے ذکر۔

بہر حال زیر بحث آیت میں ذکرِ خدا کو کہ جو دلوں کے لئے باعثِ سکون ہے ، سے مراد یہ نہیں کہ اس کا نام زبان پر لایا جائے اور بار بار تسبیح و تحلیل اور تکبیر کہی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کے ساتھ خدا کی طرف اور اس کے عظمت، اس کے علم اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کی طرف متوجہ رہا جائے اور یہ تو جہ انسان میں جہاد و کوشش اور رنیکوں کی طرف حرکت کی بنیاد بنے اور اس کے اور گناہ کے درمیان ایک مضبوط بند کا کردار ادا کرے یہ ہے وہ ذکر جس کے لئے روایاتِ اسلامی میں اس قدر آثار و برکات بیان ہوئی ہیں ۔

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم نے حضرت علی سے جو وصیتیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی :  
یا علی ثلاث لا تطيقها هذه الامة المواسات للاخ في مالہ و انصاف الناس من نفسه و ذکر اللہ علی کل حال، و لیس ہو سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر و لکن اذا ورد علی مایحرم علیہ خاف اللہ عزو جل عنده و ترکہ۔  
یا علی ۱ تین کام ایسے ہیں جن کی اس امت میں طاقت نہیں ہے (اور ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا) : مال میں دینی بھائیوں کے ساتھ مواسات کرنا ، اپنی طرف سے لوگوں کا حق ادا کرنا اور ہر حالت میں خدا کو یاد رکھنا لیکن خدا کی یاد (صرف) سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر نہیں ہے بلکہ یادِ خدا یہ ہے کہ جس وقت انسان کسی فعلِ حرام کا سامنا کرے تو خدا سے ڈرتے اور اسے ترک کر دے۔ 4

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

الذکر ذکر اللہ عزو جل عند المصيبة و افضل من ذلک ذکر اللہ عند ما حرم اللہ علیک فیکون حاجزاً۔

ذکر دو قسم ہے ۔ ایک تو خدا کو مصیبت کے وقت رکھنا ( اور صبر و استقامت سے کام لینا) اور اس سے افضل و برتر یہ ہے کہ محرمات کے مقابلے میں خدا کو یاد رکھا جائے اور اس کے اور حرام کام کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے ۔ 5  
یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ذکرِ خدا کا تعارف ایک سپر اور دفاعی ہتھیار کے طور پر کر وایا گیا ہے ۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرم نے اپنے اصحاب کی طرف رخ کر کے ارشاد فرمایا:  
اتخذوا جننا فقالوا: یا رسول اللہ امن عدد و قد اظلنا؟

قال: لا، ولکن من النار قولوا سبحان اللہ و الحمد للہ ولا الہ الا اللہ و اللہ اکبر

اپنے لئے سپر مہیا کرو۔

اصحاب نے عرض کیا : یا رسول اللہ! کیا دشمنوں کے مقابلے میں جنہوں نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور ہم پرسایہ کئے ہوئے

ہیں؟ فرمایا: نہیں بلکہ جہنم (کی آگ) سے کہو: سبحان الله و الحمد لله و الاله الا الله و الله اكبر (خدا کی پاکیزگی بیان کرو، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرو اس کے علاوہ کسی کو معبود نہ بناؤ اور اسے ہر چیز سے برتر سمجھو) 6۔ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک احادیث میں پیغمبر اکرم کا تعارف ’ذکر اللہ‘ کے طور پر ہوا ہے تو وہ بھی اس بناء پر ہے کہ وہ لوگوں کو یاد خدا دلاتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام سے ”الابذکر اللہ تطمئن القلوب“ کی تفسیر کے ضمن میں نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

محمد تطمئن القلوب وهو ذکر الله وحجابه  
محمد کے ذریعے دلوں کو سکون ہوتا ہے، وہ ہیں خدا کا ذکر اور اس کا حجاب۔

.....

- ۱۔ نہج البلاغہ ۲۲۴۔
- ۲۔ مزید وضاحت کے لئے کتاب ”راہ غلبہ پر نگرانیہا“ کی طرف رجوع فرمائیں۔
- 3۔ تفسیر نمونہ جلد ۸۴ (اردو ترجمہ) پر بھی ہم نے اس سلسلے میں وضاحت کی ہے۔
- 4۔ سفینة البحار جلد ۱ ص ۴۸۴۔
- 5۔ سفینة البحار جلد ۱ ص ۴۸۴۔
- 6۔ سفینة البحار جلد ۱ ص ۴۸۴۔

سورہ رعد / 30 تا 32

۳۰۔ كَذَّبِكَ اَنْ سَلْنَاكَ فِي اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا اُمَّةٌ لِنَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَاب۔

۳۱۔ وَلَوْ اَنْ قُرْاٰنًا سُبِّرَتْ بِهٖ الْجِبَالُ اَوْ قُطِعَتْ بِهٖ الْاَرْضُ اَوْ كَلَّمَ بِهٖ الْمَوْتٰى بَلْ لِلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيعًا اَفَلَمْ يَنْتَسِبْ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ لَّوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَهَدٰى النَّاسَ جَمِيعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرْيٰبًا مِنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يٰٓاْتِيْ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ۔

۳۲۔ وَلَقَدْ اسْتَهْزَءَ بِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْنَهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ۔

ترجمہ

۳۰۔ جیسا کہ (ہم نے گزشتہ انبیاء کو بھیجا) تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا کہ جس سے پہلے دوسری امتیں آئیں اور چلی گئیں، تاکہ ہم نے جو کچھ تجھ پر وحی کی ہے ان کے سامنے پڑھو حالانکہ وہ رحمن (وہ خدا کہ جس کی رحمت سب پر محیط ہے) ست کفر کرتے ہیں کہہ دو وہ میرا پروردگار ہے، اسے کے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں نے اس پر توکل کیا ہے اور میری بازگشت اس کی طرف ہے۔

۳۱۔ اگر قرآن کہ وجہ سے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مردوں کے ساتھ گفتگو کی جائے (وہ پھر بھی ایمان لائیں گے) لیکن یہ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو (جبراً) ہدایت کر دے (لیکن جبری ہدایت کاکوئی فائدہ نہیں) اور کافروں پر ان کے اعمال کی وجہ سے مسلسل سرکوبی کرنے والی مصیبتیں ٹوٹی رہیں گی یا ان کے گھروں کے ارد گرد نازل ہوں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری وعدہ پورا ہو، خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

۳۲۔ (انہوں نے صرف تیرا مذاق نہیں اڑا یا بلکہ) تجھ سے پہلے انبیاء سے بھی انہوں نے استہزاء کیا۔ میں نے کافروں کو مہلت دی اور پھر ان کی گرفت کی، تو نے دیکھا (میری) سزا کیسی تھی؟

شان نزول

مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلی آیت صلح حدیبیہ کے بارے میں ہجرت کے چھٹے سال نزال ہوئی۔ جب صلح نامہ لکھا جانے لگا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا:

لکھو: بسم الله الرحمن الرحيم

اس پر سہیل بن عمرو و اور دیگر مشرکین کہنے لگے: ہم ”رحمان“ ک ونہیں پہچانتے۔ ”رحمن“ تو صرف ایک ہی ہے اور وہ یمامہ میں ہے ( ان کی مراد مسیلمہ کذاب سے تھی کہ جو نبوت کا دعویدار تھا) ، بلکہ لکھو: باسما اللہ زمانہ جاہلیت میں اسی طرح لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت نے حضرت علی سے کہا لکھو: یہ صلح نامہ ہے جو محمد رسول اللہ

ابھی اتنا ہی لکھتا تھا کہ مشرکین قریش کہنے لگے: اگر تم خدا کے رسول ہوتے اور ہم تم سے جنگ کرتے اور خانہ خدا کا راستہ تم پر بند کرتے تو ہم بڑے ظالم ہوتے (جھگڑا تو تمہاری اس رسالت کا ہی ہے) بلکہ لکھو ”یہ صلح نامہ محمد بن عبد اللہ کا ہے۔“

اس وقت اصحاب پیغمبر بھڑک اٹھے۔ کہنے لگے: ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ان سے جنگ کریں۔ پیغمبر اکرم نے فرمایا: نہیں، جس طرح یہ کہتے ہیں ویسے لکھو۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا کے نام ”رحمن“ کے سلسلے میں ان کی بہانہ جوئی، ہٹ دھرمی اور مخالفت پر ان کی شدید سرزنش کی گئی کیونکہ یہ تو خدا کی قطعی صفات میں سے ہے۔

یہ شان نزول اس صورت میں صحیح ہے جب ہم اس سورہ کو مدنی سمجھیں تاکہ یہ صلح حدیبیہ کے واقعے سے مطابقت اختیار کرسکے لیکن اگر جیسا کہ مشہور ہے کہ اسے مکی سمجھیں تو پھر اس بحث کی نوبت نہیں آئے گی مگر یہ کہ اس آیت کی شان نزول کو مشرکین کی اس گفتگو کا جواب سمجھا جائے جو سورہ فرقان میں آئی ہے۔ انہوں نے ”رحمن“ کو سجدہ کرنے کی دعوت پیغمبر کے جواب میں کہا ہے کہ ہم رحمن کو نہیں پہچانتے:

اسجدوا للرحمن قالوا و ما الرحمن

(جب ان سے کہا گیا کہ) رحمن کو سجدہ کرو تو کہنے لگے رحمن کون؟ (فرقان-۶۰)

بہر حال مندرجہ بالا آیت شان نزول سے قطع نظر بھی ایک واضح مفہوم رکھتی ہے کہ جو اس کی تفسیر میں بیان کیا جائے گا دوسری آیت کی شان نزول کے بارے میں بھی بعض عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مشرکین مکہ کی ایک جماعت کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ کانہ کعبہ کی پشت کی طرف بیٹھے تھے۔ انہوں نے پیغمبر اکرم کی طرف کسی کو یہ پیغام دے کر بھیجا:

اگر تو چاہتا ہے کہ ہم تیری پیروی کریں تو مکہ کے ان پہاڑوں کو اپنے قرآن کے ذریعے پیچھے ہٹا دے تاکہ ہماری یہ تنگ زمین کسی حد تک وسیع ہو جائے۔ نیز زمین میں شکاف کر کے اس میں چشمے اور نہریں جاری کر دے تاکہ ہماری یہ تنگ زمین کسی حد تک وسیع ہو جائے۔ نیز زمین میں شگاف کر کے اس میں چشمے نہریں جاری کر دے تاکہ ہم درخت لگائیں اور زراعت کریں تو اپنے گمان میں داؤد سے کم نہیں ہے کہ جس کے لئے خدا نے پہاڑوں کو مسخر کر رکھا تھا کہ جو اس سے ہم آواز ہو کر خدا کی تسبیح کرتے تھے یا یہ کہ ہمارے لئے ہوا کو مسخر کر دے تاکہ ہم اسکے دوش پر سوار ہو کر شامل کی طرف جائیں اور اپنی مشکلات حل کریں اپنی ضروریات پوری کریں اور اسی دن واپس لوٹ آئیں جیسا کہ سلیمان کے لئے مسخر تھی اور تو اپنے گمان میں سلیمان سے کم نہیں ہے نیز اپنے دادا ”قصی“ (قبیلہ قریش کے جد اعلیٰ) یا ہمارے مردوں میں سے کسی اور شخص کو جسے چاہے زندہ کر دے تاکہ ہم اس سے سوال کریں کہ کیا جو کچھ تو کہتا ہے حق ہے یا باطل کیونکہ عیسیٰ مردونکو زندہ کرتا تھا اور تو عیسیٰ سے کم تر نہیں ہے۔

اس پر دوسری آیت نازل ہوئی اور ان سے کہا گیا کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہٹ دھرمی کے وجہ سے ہے نہ کہ ایمان لانے کے لئے کیونکہ ایمان لانے کے لئے درکار کافی معجزات پیش کیے جاچکے ہیں۔

بت دھرم ہر گز ایمان نہیں لائیں گے

ان آیات میں ہم پھر نبوت کی بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔ ان میں مشرکین کی گفتگو کا ایک اور حصہ پیش کیا گیا ہے نیز نبوت کے بارے میں ان کی گفتگو کا واضح جواب دیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جیسے ہم نے گزشتہ انبیاء کو گزشتہ قوموں کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا تجھے بھی ایک امت کے درمیان بھیجا ہے کہ جس سے پہلے امتیں آئیں اور چلی گئیں (لتتلوا علیہم الذی اوحینا الیک) حالانکہ وہ ”رحمن“ (وہ خدا کہ جس کی رحمت اور وسیع و عام فیض مومن و کافر اور یہود و نصاریٰ سب پر محیط ہے) کا انکار کرتے ہیں (وہم یكفرون بالرحمن)۔

کہہ دو: اگر تم انکار کرتے ہو تو رحمن کہ جن کا فیض و رحمت عام ہے، میرا پروردگار ہے (قل ہو ربی) اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں اس پر توکل کرتا ہوں اور میری باز گشت اسی طرف ہے (لا الہ الاہو علیہ توکلت والیہ متاب)۔

اس کے بع دان بہانہ تراش افراد کے جواب میں کہ جو ہر چیز پر اعتراض کرتے ہیں ، فرماتا ہے : یہاں تک کہ اگر قرآن کے ذریعے پہاڑ چلنے لگ جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کے ذریعے مردوں سے گفتگو بھی ہو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے ( وَ لَوْ أَنَّ فُرَاتًا سِيرَتْ بِهٖ الْجِبَالِ أَوْ قُطِعَتْ بِهٖ الْأَرْضُ أَوْ كَلَّمَ بِهٖ الْمَوْتَى ) - لیکن یہ تمام کام خدا کے اختیار میں ہے اور وہ جتنا ضروری سمجھتا ہے انجام دیتا ہے (بَلِّغِ اللّٰہُ الْأَمْرَ جَمِیْعًا) - مگر تم لوگ حق کے طالب نہیں ہو، مگر ہو تے تو جس قدر اعجاز کی نشانیاں اس پیغمبر سے صادر ہوئی ہیں ایمان لانے کے لئے کاملاً کافی ہیں ، یہ تو سب بہانے ہیں -

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : کیا وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو تمام لوگوں کو جبراً ہدایت کر دے (أَفَلَمْ یَبۡیِّنۡ لِّلَّذِیۡنَ آمَنُوۡا اَنَّ لَوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ لَهَدٰی النَّاسَ جَمِیْعًا) -

۱۔ ”أَفَلَمْ یَبۡیِّنۡ“ ”یأس“ کے مادہ سے ناامیدی کے معنی میں ہے مگر بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں علم کے معنی میں ہے لیکن (فخر رازی کے مطابق) ”کچھ لوگوں“ کے بقول کہیں نہیں دیکھا گیا کہ ”یأس“ ”علمت“ کے معنی میں ہو - مفردات میں راغب کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ”یأس“ یہاں اپنے اسی مشہور معنی میں ہے لیکن ہر مایوسی کے لئے ضروری ہے کہ اس کام کے نہ ہوسکنے کا علم ہو - اس بناء پر ان کے یأس کے ہونے کا لازمہ ان کا علم ہے لیکن راغب کی اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں یأس وجود علم کے معنی میں نہیں بلکہ عدم کے علم کے معنی میں ہے اور یہ مفہوم آیت کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا اس بناء پر حق وہی ہے جو مشہور مفسرین نے کہا ہے اور اس کے لئے اقوال عرب سے بھی شواہد پیش کیے گئے ہیں اور ان کے نمونے فخر رازی نے اپنی تفسیر میں پیش کئے ہیں - (غور کیجئے) -

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ داخلی یا خارجی طور پر جبری طریقے سے منکرین اور ہٹ دھرم افراد تک کو بھی ایمان لانے پر آمادہ کر سکتا ہے کہ کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کی قدرت کے سامنے کوئی کام مشکل نہیں ہے لیکن وہ ہر گز ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ایسا جبری ایمان ہے وقعت ہے - ایسا ایمان اس معنویت اور کمال سے محروم ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے -

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : اس کے باوجود کفار ہمیشہ اپنے اعمال کے سبب تباہ کن مصائب کے حملے سے دو چار ہیں یہ مصائب مختلف بلاؤں کی صورت میں نازل ہوتے ہیں اور کبھی ان پر مجاہدین اسلام کے تباہ کن حملوں کی صورت میں آتے ہیں ( وَلَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا تُصِیۡبُهُمۡ بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعًاۙ ) -

یہ مصائب اگر ان کے گھروں پر نازل نہ ہوں تو ان کے گھروں کے آس پاس نازل ہوں گے (أَوْ تَحُلُّ قَرِیۡبًا مِّنۡ دَارِهِمۡ) تاکہ وہ عبرت حاصل کریں ، حرکت میں آئیں اور خدا کی طرف لوٹ آئیں -

یہ تشبیہیں اسی طرح جاری رہیں گی یہاں تک کہ خدا کا آخری حکم آپہنچے (حَتّٰی یَأۡتِیَ وَعَدُ اللّٰہُ) - یہ آخری حکم ہو سکتا ہے موت کی طرف یا روز قیامت کی طرف اشارہ ہو یا بقول بعض کے فتح مکہ کی طرف اشارہ ہو کہ جس نے دشمن کی ساری طاقت کو درہم برہم کر کے رکھ دیا -

بہر حال خدا کا وعدہ حتمی ہے ”خدا کبھی بھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا“ ( اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخَلِّفُ الۡمِیۡعَادَ) - زیر نظر آخری آیت پیغمبر اکرم کی طرف روئے سخن کئے ہوئے کہتی ہے : صرف تمہی نہیں ہو کہ جسے اس کا فر گروہ کے طرح طرح کے تقاضوں اور من پسند معجزوں کی فرمائش کے ذریعے تمسخر اور استہزاء کا سامنا کرنا پڑا ہے بلکہ یہ تو پوری تاریخ انبیاء میں ہوتا رہا ہے ”اور تجھ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا تمسخر اڑایا گیا ہے“ (وَلَقَدْ اسْتَهۡزَءَ بِرُسُلِہِ مِّنۡ قَبۡلِکَ) -

لیکن ہم نے ان کافروں کو فوراً عذاب نہیں کیا بلکہ ”ہم نے انہیں مہلت دی“ (فَأَمَّاۤیۡتُ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا) - اس لئے کہ شاید بیدار ہوجائیں اور شاید راہ حق کی طرف پلٹ آئیں یا کم از کم ان پر کافی اتمام حجت ہو جائے کیونکہ اگر وہ بد کار اور گنہگار ہیں تو خدا کی مہربانی اور اس کا لطف و کرم اور حکمت بھی تو موجود ہے -

بہر حال یہ مہلت اور تاخیر اس معنی میں نہیں کہ ان کی سزا اور کیفر کردار کو فراموش کر دیا جائے لہذا ”اس مہلت کے بعد ہم نے انہیں گرفت کی اور تو نے دیکھا کہ ہم نے انہیں کس طرح سزا دی“ یہ انجام تیری ہٹ دھرم قوم کے بھی انتظار میں ہے (ثُمَّ اَخَذْنٰہُمْ فَکَیۡفَ کَانَ عِقَابِ) -

چند اہم نکات

۱۔ لفظ ”رحمن“ کیوں استعمال کیا گیا ہے ؟

مندرجہ بالا آیات اور ان کے بارے میں مذکورہ شان نزول نشاندہی کرتی ہیں کہ قریش کو لفظ ”رحمن“ کہ قریش کو لفظ

”رحمن“ سے خدا کی توصیف و تعریف پسند نہیں تھی کیونکہ ایسی کوئی چیز ان کے درمیان رائج نہ تھی لہذا وہ اس کا مذاق اراتے تھے حالانکہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ اس لفظ میں ایک خاص لطف پوشیدہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کی صفت رحمانیت اس کے لطف عام کی طرف اشارہ ہے کہ جو دوست اور دشمن سب پر محیط ہے اور مومن اور کافر سب کے شامل حال ہے جب کہ اس کے مقابلے میں صفت رحیمیت خدا کی صفت خاص ہے اور صالح اور مومن بندوں کے بارے میں ہے۔

یعنی تم کس طرح اس خدا پر ایمان لاتے ہو کہ ج و منبع لطف و کرم ہے یہاں تک کہ اپنے دشمنوں کو ہی اپنے لطف و رحمت سے نوازتا ہے۔ یہ تمہاری انتہائی نادانی ہے۔

۲۔ پیغمبر اکرم نے معجزات کا تقاضا کیوں پورا نہ کیا

یہاں ہمیں پھر ان لوگوں کی گفتگو کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ جو یہ خیال کرتے ہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سوائے قرآن کے اور کوئی معجزہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ زیر نظر آیات اور اس قسم کی دیگر آیات سے مدد لیتے ہیں کیونکہ ان آیات کا ظہور یہ بتاتا ہے کہ نبی اکرم نے مختلف معجزات کی فرمائش کو ٹھکرا دیا۔ وہ لوگ پہاڑوں کو ان کی جگہ سے پیچھے ہٹانے کا، وہاں کی زمین میں شگاف کر کے چشمے اور نہریں جاری کرنے کا اور مردوں کے زندہ ہو کر گفتگو کرنے کا تقاضا کر رہے تھے لیکن آپ نے ان کی درخواست رد کر دی۔

لیکن ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ معجزہ ان لوگوں کو کہ جو حقیقت طلب ہیں صرف حقیقت کا چہرہ دکھانے کے لئے ہے نہ یہ کہ پیغمبر ایک معجزہ گر بن جائے اور جو شخص جس عمل فرمائش کرے وہ اسے انجام دیتا جائے چاہے وہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔

من پسند کے معجزات کی ایسی فرمائش صرف ایسے ہٹ دھرم اور کوتاہ فکر افراد کی طرف سے کی جاتی ہے کہ جو کسی حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس امر کی نشانیاں مندرجہ بالا آیات میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ آخری زیر بحث آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ گفتگو ان کی طرف سے پیغمبر کا مذاق اڑانے کے سلسلے میں آئی ہے یعنی وہ لوگ حق کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ ایسی فرمائشوں سے ان کا مقصود پیغمبر اکرم کا تمسخر اڑانا تھا۔

علاوہ از ینان آیات کے بارے میں جو شان ہائے نزول ہم نے پڑھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اکرم سے تقاضا کیا تھا کہ وہ گزشتہ بزرگوں میں سے کسی ایک کو زندہ کر دیں تاکہ وہ ان سے پوچھیں کہ کیا آپ حق پر ہیں یا باطل پر حالانکہ اگر پیغمبر اس قسم کا معجزہ (مردوں کو زندہ کرنا) پیش کر دیں تو پھر اس بات کے پوچھنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ پیغمبر حق پر ہیں یا باطل پر۔ یہی بات نشاندہی کرتی ہے کہ وہ متعصب، ہٹ دھرم اور معاند افراد تھے اور ان کا مقصد حق کی جستجو نہ تھا۔ وہ ہمیشہ عجیب و غریب فرمائشیں کرتے رہتے تھے اور آخر کار وہ ایمان بھی نہیں لاتے تھے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۹۰ کے ذیل میں ہم انشاء اللہ دوبارہ اس مسئلے کی وضاحت کریں گے۔

۳۔ ”قارعة“ کیا ہے؟

”قارعة“ ”قرع“ کے مادہ سے ہے جو کہ کھٹکھٹانے کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر ”قارعة“ کا معنی ہے ”کھٹکھٹانے والی“ یہاں ایسے امور کی طرف اشارہ ہے جو انسان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور اسے تنبیہ کرتے ہیں اور اگر بیدار ہونے کے لئے آمادہ ہو تو اسے بیدار کرتے ہیں۔

در حقیقت ”قارعة“ کا ایک وسیع معنی ہے کہ جس میں ہر قسم کی انفرادی یا اجتماعی مصیبتوں، مشکلات اور دردناک حوادث کا مفہوم شامل ہے۔ اسی لئے بعض مفسرین اسے جنگوں، خشک سالیوں، قتل ہونے اور قید ہونے کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جب دوسرے اسے صرف ان جنگوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو صدر اسلام میں ”سریہ“ کے عنوان سے ہوئیں۔ ”سریہ“ ان جنگوں کو کہا جاتا ہے جن میں پیغمبر اسلام خود شریک نہیں ہوئے بلکہ ان میں آپ نے اپنے اصحاب و انصار کو مامور فرمایا لیکن مسلم ہے کہ ”قارعة“ ان امور میں سے کسی ایک کے لئے مختص نہیں اور اس کے مفہوم میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیات میں ہے کہ یہ تباہ کن حوادث خود انہیں پہنچتے تھے یا ان کے گھر کے آس پاس رونما ہوتے تھے یعنی اگر وہ خود ان بیدار کرنے والے اور تنبیہ کرنے والے حوادث میں مبتلا نہ ہوں تو بھی یہ ان کے

اوس پڑوس یا ان کے نزدیک رونما ہوتے ہیں۔ کیا یہ ان کی بیداری کے لئے کافی نہیں۔

## تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ رعد / 33 تا 34

۳۳۔ أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ بَلْ زَيْنٌ  
لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ وَمَنْ يُضِلِّ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ -  
۳۴۔ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَعَلَذَابُ الْأٰخِرَةِ أَشَقُّ وَمَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ-

ترجمہ

۳۳ کیا وہ کہ جو سب کے سروں پر موجود ہے ( اور سب کانگراں اور نگہبان ہے ) اور سب کے اعمال دیکھتا ہے ( اس کی مانند ہے کہ جو ان میں سے کوئی صفت نہیں رکھتا )۔ انہوں نے خدا کے لئے شریک قرار دیے ہیں۔ کہہ دو: ان کے نام لو، کیا اسے ایسی چیز کی خبر دیتے ہوئے کہ روئے زمین میں جس کے وجود سے وہ بے خبر ہے یا ظاہری اور کھوکھلی باتیں کرتے ہو ( نہیں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے ) بلکہ کافروں کے سامنے ان کے جھوٹ مزین کئے گئے ہیں ( اور اندرونی ناپاکی کی بناء پر ان کا خیال ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہیں ) اور وہ ( خدا کی ) راہ سے روک دینے گئے ہیں اور جسے خدا گمراہ کر دے اس کے لئے کوئی راہنما نہیں ہوگا۔

۳۴۔ ان کے لئے دنیا میں ( دردناک ) عذاب ہے اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے اور خدا کے مقابلے میں کوئی ان کا دفاع نہیں کرسکتا۔

کس طرح خدا کو بتوں کا شریک بناتے ہو؟

ان آیات میں قرآن پھر توحید کی بحث کی جانب لوٹتا ہے اور ان لوگوں کو اس واضح دلیل سے خطاب کرتا ہے : کیا وہ کہ جو تمام عالم ہستی میں ہر چیز کا محافظ اور جس نے سب کو اپنی تدبیر کے زیر پردہ قرار دیا ہے اور تمام لوگوں کے اعمال سے باخبر ہے اس کی طرح ہے کہ جس میں ان صفات میں سے کوئی بھی نہیں (أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ )

۱۔

در حقیقت مندرجہ بالا جملہ وضاحت سے کہتا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کا اس طرح سے احاطہ کر رکھا ہے کہ گویا وہ سب کے سروں پر کھڑا ہے ، جو کچھ انجام دیتا ہے وہ اسے دیکھتا ہے ، جانتا ہے ، اس کا حساب و کتاب رکھتا ہے ، اس کی جزا و سزا دیتا ہے اور تصرف و تدبیر کرتا ہے ۔ اس بناء پر لفظ ” قائم “ ایک وسیع رکھتا ہے کہ جس میں یہ تمام امور شامل ہیں اگر چہ بعض مفسرین نے ان میں ایک پہلو لے لیا ہے ۔

اس کے بعد گزشتہ بحث کی تکمیل اور آئندہ بحث کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے : انہوں نے خدا کے شریک قرار دئیے ہیں ( وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ ) ۔

فوراً ہی انہیں چند طریقوں سے جواب دیا گیا :

پہلا یہ کہ : فرمایا : ان شریکوں کے نام لو ( قُلْ سَمُّوهُمْ ) ۔

نام لینے سے یاتو یہ امر مراد ہے کہ ان کی وقعت اور قدر و قیمت اتنی بھی نہیں کہ ان کا نام و نشان بھی ہو یعنی تم چند بے نام و نشان اور بے وقعت موجودات کا قادر و متعال پر ور دگار کے کس طرح ہم پہلہ قرار دیتے ہو؟ یا مراد یہ ہے کہ ان کی صفات بیان کرو تاکہ ہم دیکھیں کہ کیا وہ عبودیت کے لائق ہیں ؟ اللہ کے بارے میں ہم کہتے ہیں وہ خالق ، راقز زندگی بخشنے والا ، عالم ، قادر اور بزرگ و بر تر ہے تو کیا تم یہ صفات بتوں کے لئے استعمال کرسکتے ہو یا اس کے بر عکس اگر ان کا ذکر کرنا چاہیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ ، پتھر ، لکڑی کے بے حس و حرکت بت جو عقل و

شعور سے عاری ہیں اور اپنے عبادت کرنے والوں کے محتاج ہیں۔ مختصر یہ کہ ہر چیز سے عاری بت تو پھر ان دونوں کو کس طرح ایک جیسا قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا اب تک انہوں نے کسی کو کوئی نقصان پہنچا یا ہے یا کسی کو کوئی فائدہ پہنچا یا ہے، یا کسی کو مشکل حل کی ہے یا کسی کام میں مدد کی ہے؟ تو ان حالات میں کونسی عقل اجازت دیتی ہے کہ انہیں خدا کا ہم پلہ قرار دیا جائے کہ جو تمام برکات و نعمات، سود و زیان اور جزا و سزا کا مالک ہے۔

البتہ کوئی مانع نہیں کہ یہ تمام معانی ”سموہم“ (ان کے نام لو) جملے میں جمع ہوں۔  
دوسرا یہ کہ اس قسم کا کوئی شریک کیسے ہوسکتا ہے جب کہ وہ خداجو تمہارے خیال میں ان کا شریک ہے ان کے وجود کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتا ہب کہ اس کا علم تمام جہان پر محیط ہے۔ ”کیا اسے اس چیز کی خبر دیتے ہو جس کے وجود کو وہ زمین میں نہیں جانتا“  
(أَمْ نُنَبِّئُكَ بِمَا لَآيَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ)۔

یہ تعبیر درحقیقت مد مقابل کے ہے بودہ اور فضول گفتگو ختم کرنے کے لئے بہترین راستہ ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص آپ سے کہتا ہے کہ کل رات فلاں شخص تمہارے گھر مینمہمان تھا اور آپ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم مجھے ایسے مہمان کی خبر دیتے ہو جس کی مجھے اطلاع نہیں ہے یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص میرا مہمان ہو اور میں اس سے بے خبر ہوں اور تم اس سے آگاہ ہو۔

تیسرا یہ کہ دراصل خود تم بھی دل میں ایسی چیز کا ایمان نہیں رکھتے ”صرف ایک کھوکھلی ظاہری بات کا سہارا لئے ہوئے ہ و کہ جس میں کوئی حقیقی مفہوم موجود نہیں ہے“ (أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ)۔

اسی بناء پر یہ مشرکین جب زندگی کی کسی سخت گہائی میں جو ہر طرف سے بند ہو کر پھنس جاتے ہیں تو ”اللہ“ کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ وہ دلی طور پر جانتے ہیں کہ بتوں سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خدا ان کی حالت سورہ عنکبوت کی آی ۶۵ میں بیان فرماتا ہے جب کہ وہ کسی کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سخت طوفان میں گھر جاتے ہیں تو صرف خدا کا رخ کرتے ہیں۔

چوتھا یہ کہ مشرکین صحیح شعور نہیں رکھتے اور چونکہ ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں لہذا عقل مندانه اور صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے۔ اسی بناء پر گرامہ ہی میں ان پڑے ہیں۔ ”پیغمبر اور مومنین کے خلاف ان کی سازشوں کو اور ان کے جھوٹ، تہمتوں اور بہتانوں کو (ان کی اندرونی ناپاکی کی بناء پر) مزین کر دیا گیا ہے“ یہاں تک کہ انہوں نے ان بے وقعت اور بے نام و نشان موجودات کو خدا کا شریک جان لیا ہے (بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ) اور جس شخص کو خدا قرار دے اس کی ہدایت کسی کے بس نہیں ہے (وَمَنْ يُضِلُّ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ)۔

ہم نے بار بار کہا ہے کہ یہ گمراہی جبری معنی میں نہیں ہے اور نہ یہ بغیر کسی شرط اور بنیاد کے من پسند کا مسئلہ ہے بلکہ خدا کی طرف سے گمراہی خود انسان کے غلط کاموں کے عکس العمل کے معنی میں ہے یہ اس کے اپنے اعمال کا رد عمل ہے کہ جو اسے گمراہیوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چونکہ ایسے اعمال میں خدا نے یہ خاصیت پیدا کی ہے لہذا اس کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے۔

زیر نظر آخری آیت میں دنیا و آخرت میں ان کی دردناک سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں فطرتاً شکست و ناکامی، سیاہ روزی اور ذلت و رسوائی شامل ہیں۔ فرمایا گیا ہے: ان کے لئے دنیا زندگی میں بھی سزا ہے اور آخرت کی سزا زیادہ سخت اور شدید تر ہے (لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَعَذَابٌ الْآخِرَةِ أَشَقُّ)۔ کیونکہ وہ سزا دائمی بھی ہے، جسمانی اور روحانی بھی اور اس میں طرح طرح کا عذاب شامل ہے اور اگر وہ یہ گمان کریں کہ اس سے بچ نکلنے کے لئے ان کے پاس کوئی راستہ یا وسیلہ ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ ”خدا کے مقابلے میں انہیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی“ (وَمَا لَهُمْ مِنْ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ)۔

۱۔ درحقیقت مندرجہ بالا جملہ مبتداء پر مشتمل ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، تقدیر میں اس طرح تھا: افمن هو قائم علی کل نفس بما کسبت کمین لیس کذلک یعنی کیا وہ کہ جو اس صفت ک احامل ہے اس جیسا کہ جو اس سے عاری ہے۔

۳۵۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ أَكْلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ۔

ترجمہ

۳۵۔ وہ جنت کہ جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اس کے پھل دائمی ہیں اور اس کے سائے ہمیشہ کے لئے ہیں۔ یہ انجام ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے پرہیز گاری اختیار کی ہے اور کافروں کا انجام آگ ہے۔

تفسیر

اس سورہ کی آیات میں توحید، قیامت اور دیگر اسلامی معارف کا باری باری ذکر آیا ہے۔ اس آیت میں میں معاد کے بارے میں خصوصاً جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنت کے وہ باغ کہ جن کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے ایسے ہیں کہ جن کے درختوں کے نیچے جاری پانی کی نہریں رواں دواں ہیں (مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ)۔

”مثلاً“ کی تعبیر شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت کے گھر کے باغات اور دیگر نعمتوں کی اس محدود جہان میں رہنے والوں کے لئے کسی بیان سے تعریف نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ جہان بعد از موت کے جہان کے مقابلے میں نہایت چھوٹا ہے۔ اس جہان کے لوگوں کے لئے وہاں کی چیزوں کو صرف ”مثلاً“ اور ارشاداتی گفتگو میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ایک بچہ جو عالم جنین میں ہے اگر عقل و شعور رکھتا ہو تو اس کے سامنے اس دنیا کی نعمتوں کی وضاحت ہر گز نہیں ہوسکتی۔ صرف ناقص اور کم رنگ مثالیں پیش کی جاسکتی ہے۔

باغات کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کے پھل دائمی ہیں (أَكْلُهَا دَائِمٌ) نہ کہ اس جہان کے پھلوں کی طرح جو موسمی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص موسم میں پیدا ہوتا ہے بلکہ کسی آفت کی وجہ سے ممکن ہے کسی سال بالکل نہ بولیکن جنت کے پھلوں کو نہ کوئی آفت درپیش ہے اور نہ وہ کسی موسم کے محتاج ہیں بلکہ سچے مومنین کے ایمان کی طرح قائم و دائم ہیں۔ اسی طرح ان درختوں کا سایہ بھی دائمی ہے (وَوَظِلُّهَا)۔ ان کے سائے دنیا کے درختوں کے سائے کی طرح نہیں ہیں کہ ہو سکتا دن کے وقت جب کہ صبح سورج ایک طرف سے چمکتا ہے ان کے سائے سطح باغ میں گہرے ہوں لیکن جب آفتاب عمودی شکل میں چمکتا ہے تو وہ کم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح فصل بہار میں گر میوں میں جب کہ درخت پتوں سے بھرے ہوتے ہیں ان کا سایہ ہوتا ہے مگر فصل خزاں میں سر دیوں میں جب درخت برہنہ ہوجاتے ہیں ان کا سایہ جاتا رہتا ہے۔ (البتہ دنیا میں کہیں کہیں سدا بہار درختوں کے نمونے بھی موجود ہیں کہ جو ہمیشہ پھل پھول دیتے رہتے ہیں یہ درخت ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں خزاں کی خنکی اور فصل سرما نہیں ہوتی)۔

خلاصہ یہ کہ جنت کے سائے اس کی تمام نعمتوں کی طرح جاودانی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ باغات بہشت کے لئے خزاں نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں نور آفتاب یا اس جیسی کوئی چیز ہے ورنہ جہاں شعاع نور نہ ہو وہاں سائے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ یہ جو سورہ دہر کی آیت ۱۳ میں ہے:

لَا يَرُونَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا

وہاں شدت کی دھوپ دیکھیں گے اور نہ زیادہ سردی۔

ہوسکتا ہے یہ موسم کے اعتدال کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سوزش آفتاب اور اسی طرح سخت سردی جنت میں نہیں ہے نہ یہ کہ وہاں سورج بالکل نہیں چمکتا۔

کرۃ آفتاب کا خاموش ہوجانا اس کے ہمیشہ کے لئے ختم ہوجانے کی دلیل نہیں ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے:

قیامت میں زمین و آسمان دوسرے (نئے اور وسیع تر) زمین و آسمان میں تبدیل ہو جائیں گے۔

اور اگر کہا جائے کہ جہاں سورج کی تمازت اور تپش نہیں وہاں پھر سایہ کس لئے ہے؟ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ سائے کا لطف صرف تمازت آفتاب سے بچنے میں نہیں ہے بلکہ پتوں سے طبعی اور اوپر جانے والی رطوبت کہ جو نشاط بخش آکسیجن سے ملی ہوتی ہے سائے کو ایک خاص قسم کی لطافت اور تازگی بھی دیتی ہے۔ اسی لئے درخت کا سایہ کرے کی چھت کے سائے کی طرح ہر گز خشک اور بے روح نہیں ہوتا۔

جنت کی یہ تین صفات بیان کرنے کے بعد، آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ ہے پرہیز گاروں کا انجام، لیکن کافروں کا انجام آگ ہے (تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ)۔

جنت کی نعمتوں کا ذکر اس خوبصورت اور زیبا تعبیر کے ذریعے لطافت اور تفصیل کے ساتھ ہوا ہے لیکن دوزخیوں کے



چلتے تھے۔ یہ گروہ رہ اس چیز کا انکار کر دیتے تھے کہ جو ان کے اپنے میلان، طریقے اور پہلے سے کئے گئے فیصلوں سے ہم آہنگ نہ ہوتی۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ”احزاب“ مشرکین کی طرف اشارہ ہو کیونکہ سورہ احزاب میں بھی ان کا اس لفظ کے ذریعے ذکر کیا گیا ہے۔ اصل میں ان کا کوئی دین و مذہب نہ تھا بلکہ وہ بکھرے ہوئے گروہ اور احزاب تھے کہ جو قرآن اور اسلام کی مخالفت میں متحد تھے۔

عظیم مفسر مرحوم طبرسی اور بعض دوسرے مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مندرجہ بالا آیت صفتِ رحمن کے ساتھ خداوند عالم کی توصیف سے بت پرستوں کے انکار کی طرف اشارہ ہے کہ جب اہل کتاب خصوصاً یہودی اس توصیف سے آشنائی کی بناء پر قرآنی آیات میں لفظ ”رحمن“ کی موجودگی پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور مشرکین مکہ کہ جو اس صفت سے نا آشنا تھے، اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

آیت کے آخر میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کی اور اس کی مخالفت اور ربت دھرمی کی پر واہ نہ کرو بلکہ اپنے حقیقی خط اور صراطِ مستقیم پر قائم رہو اور ”کہو: میں مامور ہوں کہ صرف اللہ کی پرستش کروں کہ جو یکتا و یگانہ خدا ہے اور اس کے لئے کسی شریک کا قائل نہ ہوں میں صرف اس کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میری اور سب کی باز گشت اسی کی طرف ہے“ (قل امرت ان اعبد الله ولا اشرك به اليه ادعوا و اليه ماب)۔

یہانس طرف اشارہ ہے کہ سچے موحد اور حقیقی خدا پرست کا خدا کے فرامین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ اور پروگرام نہیں ہے وہ ان تمام امور کے لئے فرمان بردار ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے کا قائل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جس چیز کے بارے میں اس کی رغبت ہو اسے قبول کر لے اور جس کے بارے میں میلان نہ ہو اس کی مخالفت کرے اور انکار کر دے۔

ایک اہم نکتہ

ایمان اور اجتماعی وابستگیوں: زیر نظر آیت میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کس طرح یہود و نصاریٰ میں سے سچے مومنین کو ”اہل کتاب“ سے تعبیر کر رہا ہے اور جو لوگ اپنے تعصبات اور ہوا و ہوس کے تابع تھے انہیں ”احزاب“ قرار دے رہا ہے۔ امر صدر اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہم عصر یہود و نصاریٰ میں منحصر نہیں بلکہ حقیقی مومنین اور ایمان کے دعویداروں میں ہمیشہ یہی فرق رہا ہے کہ سچے مومنین فرامینِ حق کے سامنے تسلیم محض ہوتے ہیں اور ان میں تفریق و تبعیض کے قائل نہیں ہوتے یعنی اپنی خواہش و رغبت کو ان کے تحت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے اہل کتاب اور اہل ایمان کا لقب سجتا ہے۔

لیکن وہ کہ جو ”نؤمن ببعض و نکفر ببعض“ کا مصداق ہیں یعنی جو کچھ ان کی ذاتی سوچ، رغبت اور ہوا ہوس سے ہم آہنگ ہے اسے قبول کر لیتے اور جو کچھ ایسا نہیں اس کا انکار کر دیتے ہیں یا کچھ ان کے فائدے میں ہے اسے مان لیتے ہیں اور جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہے اس کا انکار کر دیتے ہیں وہ نہ حقیقی مسلمان ہیں اور نہ سچے مومن بلکہ وہ تو اجتماعی وابستگیوں رکھتے اور اپنے مقاصد دین میں تلاش کرتے ہیں اسی لئے تعلیمانِ اسلام اور احکام دین میں ہمیشہ تبعیض کے قائل ہوتے ہیں۔

تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ رعد / 37 تا 40

۳۷۔ وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا وَلَئِنَّ أَنْتَ لَتَنْتَعِتْ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ۔

۳۸۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٍ۔

۳۹ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُنْزِلُ مَا يَشَاءُ أُمَّ الْكِتَابِ۔

۴۰۔ وَإِنْ مَا تُرِيدُكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتُوقِيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ .

ترجمہ

۳۷۔ جس طرح (کہ ہم نے گزشتہ انبیاء کو آسمانی کتاب دی ہے) تجھ پر بھی واضح اور صریح فرمان نازل کیا ہے اور تیرے پاس آگاہی آجائے کہ بعد اگر ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو خدا کے سامنے کوئی تیری حمایت کرنے والا اور بچا نے والا نہیں ہوگا۔

۳۸۔ اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں اور ان کی بیویاں اور اولاد بھی تھی اور کوئی رسول حکم خدا کے بغیر (اپنی طرف سے) کوئی معجزہ نہیں لاسکتا تھا، ہر زمانہ ایک کتاب رکھتا ہے (اور ہر کام کے لئے وقت مقرر ہے)۔

۳۹۔ خدا جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبات عطا کرتا ہے اور ام الكتاب اس کے پاس ہے۔  
۴۰۔ اور وہ بعض سزائیں کہ جن کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تجھے دکھائیں یا (ان سزاؤں کے آنے سے پہلے) ہم تجھے مار دیں تو ہر حالت میں تو فقط ابلاغ پر مامور ہے اور (ان کا) حساب ہمارے ذمہ ہے۔

قطعی اور قابل۔ تغیر حوادث

ان آیات میں بھی نبوت سے مربوط مسائل کا سلسلہ جاری ہے۔  
پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جیسے ہم نے اہل کتاب اور گزشتہ انبیاء پر آسمانی کتاب نازل کی ویسے ہی یہ قرآن بھی تم پر نازل کیا ہے اس حالت میں کہ یہ واضح و آشکار احکام پر مشتمل ہے (وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا حُكْمًا عَرَبِيًّا)۔  
جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے ”عربی“ فصیح اور واضح گفتگو کے معنی میں ہے:

الفصیح اللبیب من الکلام

لہذا جس وقت کہا جاتا ہے: ”امراة روبة“ تو اس کا مفہوم ہے: ”جو عورت اپنی عفت و پاکدامنی سے آگاہ ہو۔“

اس کے بعد راغب مزید کہتا ہے:

قوله حکماً عربياً قيل معناه مفصلاً يحق الهق ويبطل الباطل

یہ جو خدا نے فرمایا ہے ”حکماً عربياً“ اس کا مفہوم ہے ایسی واضح اور آشکار گفتگو جو حق کو ثابت کرتی ہے اور باطل کا بطلان کرتی ہے۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ”عربی“ یہاں ”شریف“ کے معنی میں ہے کیونکہ لغت میں یہ لفظ اس معنی میں بھی آیا ہے۔ اس طرح اس صفت سے قرآن کی توصیف مراد یہ ہے کہ اس کے احکام واضح و آشکار ہیں اور اسے غلط فائدہ اٹھانے اور مختلف تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لئے اس تعبیر کے بعد دیگر آیات میں استقامت، ٹیڑھا پن نہ ہونے اور ی اعلم و آگہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ زمر کی آیت ۲۸ میں ہے:

قرآناً عربياً غیر ذی عوج

یہ آشکار قرآن ہے کہ جو ہر قسم کی کجی اور ٹیڑھ پن سے پاک ہے۔

سورہ حم سجدہ کی آیت ۳ میں ہے:

کتاب فصلت آیاتہ قرآناً عربياً لقوم یعلمون

یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی آیات تشریح شدہ ہیں اور یہ ان کے لئے واضح و آشکار قرآن ہے کہ جو جاننا چاہے۔  
اس طرح اس آیت میں قبل اور بعد کا جملہ تائید کرتا ہے کہ ”عربیت“ سے مراد بیان کا واضح، روشن اور پیچ و خم سے خالی ہونا چاہیے۔

یہ تعبیر قرآن کی سات سورتوں میں آئی ہے لیکن چند ایک مواقع پر ”لسان عربی مبین“ اور اس قسم کے دیگر الفاظ بھی آئے ہیں۔ ممکن ہے وہ بھی اسی معنی یعنی بیان کا روشن، واضح اور ابہام سے خالی ہونا، میں ہو۔

البتہ اس خاص موقع پر ہوسکتا ہے عربی زبان کی طرف اشارہ ہو کیونکہ خدا ہر نبی کو اس کی اپنی قوم کی زبان میں مبعوث کرتا تھا تاکہ وہ سب سے پہلے اپنی قوم کو ہدایت کرے اس کے بعد اس انقلاب کا دامن دوسری جگہوں تک پھیلائے۔

اس کے بعد تہدید آمیز اور قاطع لہجے میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب تک حقیقت تجھ پر آشکار ہوجائے تو اس کے بعد اگر تو ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو تمہیں خدائی عذاب کے ذریعے سزا ہوگی (وَلَئِنْ أَتَبَعْتَ أَهْوَانَهُمْ بَعْدَمَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَاقٍ)۔

پیغمبر اکرم کے مقام عصمت، معرفت اور علم و آگہی کی وجہ سے اگر چہ ان کے لئے انحراف کا احتمال یقیناً نہیں ہے

لیکن یہ الفاظ اولاً تو واضح کرتے ہیں کہ خدا کسی شخص کے ساتھ خصوصی ارتباط نہیں رکھتا بالفاظ دیگر اس کی کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر پیغمبر کا مقام بلند و بالا ہے تو ان کی تسلیم و عبودیت اور ایمان و استقامت کی بناء پر ہے ۔

ثانیاً یہ بات دوسروں کے لئے تاکید ہے کہ جہاں پیغمبر جیسی ہستی راہِ حق سے انحراف اور باطل راستے کی طرف میلان کی صورت میں خدائی سزا سے بچ نہیں سکتی تو ہر دوسروں کی حیثیت واضح ہے ۔  
یہ بعینہ اس طرح ہے کہ کوئی شخص اپنے اچھے اور نیک بیٹے کو مخاطب کر کے کہے ، اگر تو اپنا ہاتھ غلط کاریوں سے آلودہ کرے تو میں تجھے سزا دوں گا تاکہ دوسروں کو اپنا حساب کتاب معلوم ہو جائے ۔

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ” ولی “ سر پرستو محافظ اور ” واق “ ( نگہدار ) اگر چہ معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں تاہم ان میں فرق یہ ہے کہ ایک مثبت پہلو کو بیان کرتا ہے اور دوسرا منفی پہلو کو ۔ ایک نصرت و مدد کرنے والے کے معنی میں ہے اور دوسرا دفاع اور حفاظت کرنے والے کے معنی میں ۔  
بعد والی آیت در حقیقت ان مختلف اعتراضات کا جواب ہے کہ جو دشمن آپ کر کرتے تھے ۔ ان میں سے ایک گروہ کہتا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر نوع بشر میں سے ہو اور اس کی بیوی اور بچے ہوں تو مندرجہ بالا آیت انہیں جواب دیتے ہوئے کہتی ہے : یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہم نے تجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں ۔ ان کی بیویاں بھی تھیں اور اولاد بھی ( وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ) ۱۔  
ان کے اعتراض سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو تاریخ انبیاء سے نا واقف تھے یا اپنے آپ کو نادانی اور رجہالت میں رکھے ہوئے تھے ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے ۔

دوسرا یہ کہ انہیں توقع تھی کہ وہ جو معجزہ بھی تجویز کریں اور جو بھی ان کی خواہشات کا تقاضا ہو آپ اسے انجام دیں ( چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں ) لیکن انہیں جاننا چاہیے کہ ” کوئی رسول حکم خدا کے بغیر کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا “ ( وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ) ۔

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ پیغمبر اسلام کیوں آئے ہیں اور انہوں نے تورات یا انجیل کے احکام کو کیوں تبدیل کر دیا ہے ، کیا یہ آسمانی کتاب نہیں ہیں اور خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا اپنا حکم تبدیل کر دے ؟ ( یہ اعتراض خصوصاً اس امر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے کہ یہودی نسخ احکام کے ناممکن ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے )

زیر نظر آیت اپنے آخری جملے میں انہیں جواب دیتی ہے : ہر زمانے کے لئے ایک حکم اور قانون مقرر ہوا ہے ( تاکہ بشریت اپنے آخری بلوغ تک پہنچ جائے اور آخری حکم صادر ہو ) ( لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ) ۔

لہذا مقام تعجب نہیں کہ ایک دن وہ تورات نازل کرے ، دوسرے دن انجیل نازل کرے اور پھر قرآن ۔ کیونکہ تکامل حیات کے لئے مختلف اور گونا گون ہو گراموں کی ضرورت ہے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ” لکل اجل کتاب “ ان لوگوں کا جواب ہو جو کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر سچ کہتا ہے تو پھر کیوں خدائی عذاب اس کے مخالف کا قلع قمع نہیں کرتا۔ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہے اور کوئی چیز حساب و کتاب کے بغیر نہیں ہے ۔ سزا اور عذاب کا وقت بھی آپہنچے گا۔ 2

جو کچھ گزشتہ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے بعد والی آیت اس کے لئے تاکید و استدلال کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ ہر حادثے اور حکم کے لئے ایک معین زمانہ ہے جیسا کہ کہا گیا ہے :

ان الامور مرهونة باوقاتها

اور اگر دیکھتے ہو کہ بعض آسمانی کتب دیگر کتب کی جگہ لیتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ” خدا جو چیز چاہتا ہے محو کر دیتا ہے جیسے وہ اپنے ارادے اور حکمت کے تقاضے سے کچھ امر کا اثبات کرتا ہے نیز کتاب اصلی اور ام الكتاب اس کے پاس ہے ( يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ) ۔

آخر میں مزید تاکید کے طور پر ان عذابوں کا ذکر ہے کہ پیغمبر جن کا وعدہ کرتے تھے اور وہ ان کا انتظار کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ اعتراض کرتے تھے کہ تمہارے وعدے نے عملی شکل کیوں اختیار نہیں کی ۔ ارشاد ہوتا ہے : اور بعض امور کہ جن کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے ( یعنی تیری کامیابی ، ان کی شکست ، تیرے پیروکاروں کی رہائی اور ان کے پیرو کاروں کی اسارت ) ہم تجھے تیری زندگی میں دکھائیں یا ان وعدوں پر عمل درآمد سے پہلے تجھے اس دنیا سے لے جائیں تیری ذمہ داری بہر صورت پر عمل درآمد سے پہلے تجھے اس دنیا سے لے جائیں تیری ذمہ داری بہر صورت ابلاغ رسالت ہے اور ہماری ذمہ داری ان سے حساب لینا ہے ( وَإِنْ مَا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ) ۔

- .....
۱. بعض مفسرین نے اس آیت کے لئے ایک شان نزول ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے پیغمبر اکرم کی ایک سے زیادہ ازواج ہونے پر اعتراض کیا تھا حالانکہ سورہ رعد مکی ہے اور مکہ میں تعداد ازواج کا معاملہ درپیش نہیں تھا۔
  2. البتہ اس معنی کے مطابق، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا جملے مینتقدیم و تاخیر کا قائل ہونا پڑے گا اور یہ کہنا پرے گا کہ تقدیر میں ”لکل کتاب اجل“ تھا ( غور کیجئے گا)۔

دو اہم نکات

۱. لوح محو و اثبات اور ام الكتاب: ”یمحو الله ما يشاء ويثبت“ مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ انبیاء پر نزول معجزات یا آسمانی کتب کے نازل ہونے کے بارے میں آیا ہے لیکن اس میں ایک عمومی قانون بیان کیا گیا ہے کہ جس کی طرف مختلف منابع اسلامی میں بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ تحقق موجو دات اور عالم کے مختلف حوادث کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ قطعیت ہے کہ جس میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا (مذکورہ بالا آیت میں ”ام الكتاب“ اسی کی طرف اشارہ ہے)۔ دوسرا مرحلہ غیر قطعی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مشروط ہے کہ اس مرحلے میں تبدیلی ممکن ہے لہذا اسے مرحلہ محو و اثبات کہتے ہیں۔

کبھی انہیں ”لوح محفوظ“ اور ”لوح محو و اثبات“ بھی کہا جاتا ہے۔ گویا ان میں سے ایک لوح میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ بالکل محفوظ ہے لیکن دوسری میں ممکن ہے کوئی چیز لکھی جائے اور پھر محو ہو جائے اور اس کی جگہ دوسری چیز لکھی جائے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ کبھی ایک حادثہ پر ہم اس کے ناقص اسباب کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً زہر قاتل کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ انسان کو ختم کر دے، اسے نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص اسے کھائے گامر جائے گا مگر اس سے بے خبر ہوتے ہیں کہ اس زہر کے لئے ایک ”ضد زہر“ بھی ہے اگر اس کے بعد اسے کھا لیا تو اس کے اثرات ختم ہو جائیں گے ( البتہ ممکن ہے ہم بے خبر تو نہ ہوں لیکن اس ”ضد زہر“ کے بارے میں بات کرنا مناسب نہ سمجھیں)۔

اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ حادثہ زہر کھانے سے موت، قطعی پہلو نہیں رکھتا یعنی اس مقام پر ”لوح محو و اثبات“ ہے کہ جس میں دوسرے حوادث پر نظر رکھتے ہوئے تغیر ممکن ہے لیکن اگر حادثے کو اس کی علت تامہ یعنی مقتضی کے وجود، تمام شرائط کی موجودگی اور تمام موانع کے خاتمے کے ساتھ نظر میں رکھیں (مندرجہ بالا مثال میں زہر کھانے اور ”ضد زہر“ نہ کھانے کے ساتھ نظر میں رکھیں) تو پھر یہاں حادثہ قطعی ہے اور اصطلاح کے مطابق اس کی جگہ لوح محفوظ اور ام الكتاب میں ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

یہ بات ایک اور طرح سے بیان کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ خدا کے علم کے دو مرحلے ہیں۔ ”مقتضیات اور علل ناقصہ کا علم“ اور ”علل تامہ کا علم“ جو دوسرے مرحلے سے مربوط ہے اسے علم الكتاب اور لوح محفوظ کہا جاتا ہے اور جو پہلے مرحلے سے مربوط ہے اسے لوح محو و اثبات سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ آسمان کے کسی گوشے میں کوئی لوح اور تختی نہیں رکھی ہوئی کہ جس پر کوئی چیز لکھی جاتی ہو یا مٹا کر اس پر دوسری چیز لکھی جاتی ہو۔

یہاں سے منابع اسلامی کے مطالعہ سے سامنے آنے والے بہت سے سوالات کا جواب دیا جاسکتا ہے کیونکہ کبھی کبھی روایات یا بعض قرآنی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں کام فلاں نتیجے کا سبب بنتا ہے لیکن ہم بعض اوقات اس میں ایسا نتیجہ نہیں دیکھے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس نتیجے کا حصول بعض شرائط یا موانع کا حامل ہوتا ہے کہ جو شرط پوری نہ ہونے یا رکاوٹ دور نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو پاتا۔

نیز بہت سی روایات کہ جو لوح محفوظ، لوح محو و اثبات اور انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے علم کے بارے میں ہیں ان کا مفہوم اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند روایات ہم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

( ۱ ) امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں رسول اللہ سے سوال کیا تو حضور نے فرمایا:

لا قرن عینیک بتفسیرہا ولا قرن عین امتی بعدی بتفسیرہا، الصدقة علی وجہہا وبر الوالدین و اصطناع المعروف بحول الشقاء سعادة، ویزید فی العمر، وقی مصادع السوء۔

اس آیت کی تفسیر میں تیری آنکھوں کو روشن کرونگا اور اسی طرح اپنے بعد اپنی امت کی آنکھوں کو ضرورت مندوں کی صحیح طریقے سے مدد کرنا۔ ماں باپ سے نیکی کرنا اور اچھے کام انجام دینا شقاوت کو سعادت میں دیتا بدل ہے، زدگی

کو طولانی کر دیتا ہے اور خطرات سے بچاتا ہے۔ (المیزان جلد ۱۱ ص ۴۱۹)۔  
یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سعادت و شقاوت کو حتمی اور ناقابلِ تغیر امر نہیں۔ یہاں تک کہ اگر انسان نے ایسے اعمال انجام دیئے ہوں کہ جن کی وجہ سے بدبختیوں کی صف میں شامل ہو تو وہ اپنی جگہ تبدیل کر کے اور نیکیوں کا رخ کر کے خصوصاً مخلوق خدا کی مدد اور خدمت کر کے اپنی سرِ نوشت کو بدل سکتا ہے کیونکہ ان امور کا مقام لوحِ محو و اثبات ہے نہ کہ ام الكتاب توجہ رہے کہ جو کچھ مندرجہ حدیث میں آیا ہے وہ مفہوم آیت کا ایک حصہ ہے کہ ایک مثال کے طور پر بیان ہوا ہے۔

(۲) امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من الامور محتومة كائنة لامهالة، ومن الامور امور موقوفة عند الله، يقدم فيها مايشاء و يحمو مايشاء ويثبت منها مايشاء كچه امور حوادث حتمی ہیں کہ جو یقیناً و نما ہوتے ہیں اور بعض خدا کے ہانکچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں وہ جس میں مصلحت دیکھتا ہے اسے مقدم کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثبت کر دیتا ہے۔ (المیزان جلد ۱۱ ص ۴۱۹)۔

نیز مرقوم ہے کہ امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام فرماتے تھے:

الولاية في كتاب الله لحدثكم بما كان ما يكون الي يوم القيامة، فقلت له آية فقال قال الله: يحمو الله مايشاء و عنده ام الكتاب اگر قرآن میں ایک حدیث نہ ہوتی تو میں گزشتہ اور آئندہ قیامت تک حوادث کی تمہیں خبر دیتا۔

راوی حدیث کہتا ہے: میں نے عرض کیا کہ کونسی آیت ہے تو فرمایا:

خدا فرماتا ہے: يحمو الله مايشاء و يثبت و عنده ام الكتاب (نور الثقلين، جلد ۲ ص ۵۱۲)۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مختلف حوادث کے متعلق دین کے عظیم راہبروں کے کم از کم کچھ علوم لوحِ محو و اثبات سے مربوط ہیں اور لوحِ محفوظ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اسے مخصوص ہے اور وہ اس کے کچھ حصے کی کہ جو میں مصلحت سمجھتا ہے اپنے خاص بندوں کو تعلیم دے دیتا ہے۔

و ان كنت من الاشقياء فامحنى من الاشقياء و اكتبنى من السعدي

اگر شقاوت مندوں میں سے ہونے ان میں سے خذف کر کے مجھے سعادت مندوں میں لکھ دے (یعنی مجھے اس کام کی توفیق دے)۔

بہر حال جیسا کہ کہا جا چکا ہے محو و اثبات کا ایک جامع مفہوم ہے۔ شرائط کی تبدیلی اور موانع کی موجودگی کے زیر اثر اس میں ہر قسم کی تبدیلی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے کسی خاص مصداق کی نشاندہی کی ہے مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ یہ تو بہ کے زیر اثر گناہوں کے محو ہونے یا حالات بدلنے سے روزی کم یا زیادہ ہونے یا اس قسم کے امور کی طرف اشارہ ہے ان میں سے ہر بات اسی صورت میں صحیح ہوسکتی ہے جب مراد ایک مصداق بیان کرنا ہو۔

۲۔ بداء کیا ہے؟ شیعہ اور سنی میں جو ایک پیچیدہ بحث پیدا ہو گئی ہے وہ مسئلہ ”بداء“ کے بارے میں ہے۔

فخر رازی اپنی تفسیروں میں زیر بحث آیت کے ذیل میں کہتا ہے:-

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے لئے ”بداء“ جائز ہے اور ان کے نزدیک بداء کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص ایک چیز کا معتقد ہو پھر ظاہر ہو جائے کہ حقیقت اس کے اعتقاد کے برخلاف ہے اور یہ بات ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ”یحمو الله مايشاء و يثبت“ کی آیت کا سہارا لیا ہے۔

فخر رازی مزید کہتا ہے:

یہ عقیدہ باطل ہے کیونکہ علمِ خدا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے اور جو ایسا ہو اس میں تغیر و تبدل محال ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسئلہ بداء کے بارے میں شیعہ عقیدہ سے عدم آگاہی اور لاعلمی کے سبب بہت سے اہل سنت بھائیوں نے شیعوں کی طرف ایسی ناروا نسبتیں دی ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے:

لغت میں لفظ ”بداء“ آشکار ہونے اور پوری طرح واضح ہونے کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ پشیمانی کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ جو شخص پشیمان ہوتا ہے یقیناً اسے کوئی نئی چیز پیش آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے خدا کے بارے میں بداء کا کوئی مفہوم نہیں اور ممکن نہیں۔ اور کسی عقلمند اور دانا کے لئے ممکن نہیں کہ اسے یہ احتمال ہو کہ کوئی مطلب خدا سے پوشیدہ ہوتا ہے اور پھر وقت گزرنے سے اس پر آشکار ہوجاتا ہے۔ اصولی طور پر یہ بات صریح کفر ہے اور کھٹکنے والی ہے۔ اس بات کا لازمی مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات پاک کی طرف جہالت کی نسبت دی جائے اور اس کی ذات کو محل تغیر اور محل حوادث سمجھا جائے حاشا وکل شیعہ امامیہ ذات پروردگار اور خدائے لایزال کے بارے میں ایسا احتمال ہر گز نہیں رکھتے۔

جس میں شیعہ کا بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں اور جس کے مطابق روایاتِ اہل بیت میں آیا ہے کہ

ماعرَف الله حق معرفته من لم يعرفه بالبداء

وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہم علل و اسباب کے ظواہر کے مطابق محسوس کرتے ہیں کہ ایک واقعہ و وقوع پذیر ہو گیا یا کسی پیغمبر کو ایسا واقعہ پیش آنے کی خبر دی گئی حالانکہ ہم بعد میں دیکھتے ہیں ایسا واقعہ نہیں ہوا تو اس موقع پر ہم کہتے ہیں کہ ”بداء“ واقع ہوا ہے یعنی جس امر کو ہم واقعہ سمجھتے تھے اور اس کے رونما ہونے کو یقینی جانتے تھے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔

اس بات کی بنیاد اور اصلی علم وہی ہے جو گزشتہ بحث میں بیان ہو چکی ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات ہماری آگاہی کا تعلق صرف علل ناقصہ سے ہوتا ہے اور ہم شرائط و موانع نہیں دیکھ پاتے اور ہم اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد جب شرط کے فقدان یا مانع کے وجود سے سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس کی ہم توقع کر رہے ہوتے ہیں اس کے خلاف واقع ہو جاتا ہے تو ہم ان کے مسائل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح کبھی امام پیغمبر یا امام لوح پیغمبر یا امام لوح محو و اثبات سے آگاہی حاصل کر لیتے ہیں جب کہ یہ طبعاً قابل تغیر ہے اور پھر موانع پیش آنے اور شرائط مفقود ہونے کی بناء پر اس طرح رونما نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ”نسخ“ اور ”بداء“ کا آپس میں موازنہ کرنا چاہئے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک نسخ احکام جائز ہے۔ یعنی ممکن ہے ایک حکم شریعت میں نازل ہو اور لوگ سمجھیں کہ یہ ابدی حکم ہے لیکن پھر وہ ذات پیغمبر کے ذریعے منسوخ قرار پا جائے اور اس کی جگہ دوسرا آجائے (جیسے ہم نے تفسیر، فقہ اور حدیث میں قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں پڑھا ہے)۔

یہ درحقیقت ”بداء“ کی ایک قسم ہے لیکن عام طور پر امور تشریحی اور احکام و قوانین میں اسے نسخ کہتے ہیں اور مور تکوینی میں بداء ایک قسم کا نسخ ہے۔ کیا کوئی شخص ایسے منطقی امر کا انکار کر سکتا ہے سوائے ایسے شخص کے جو علت تامہ اور علت ناقصہ کے درمیان فرق نہ کر سکے یا یہ کہ وہ شیعان اہل بیت کے خلاف ہونے والے منحوس پراپیکنڈا کا شکار ہو جائے اور اس کا تعصب اسے اجازت نہ دے کہ شیعہ عقائد کا مطالعہ خود ان کی کتب سے کرے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر الدین رازی نے ”محو اللہ مایشاء اللہ و یثیت“ کے ذیل میں بداء کے بارے میں شیعوں کے عقیدے کی بات تو کی لیکن اس نے اس مسئلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ بداء اسی ”محو و اثبات“ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس نے تو اپنے مخصوص تعصب کی بناء پر شیعوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بداء کے قائل کیوں نہیں۔

اجازت دیجئے کہ مسئلہ بداء کے بارے میں چند ایسے نمونے پیش کئے جائیں کہ جنہیں سب کے قبول کیا ہے۔ (۱) حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ ان کی قوم کی نافرمانی سبب بنی کہ عذاب الہی ان کی طرف آئے اور اس عظیم پیغمبر نے بھی چونکہ انہیں قابل ہدایت نہ سمجھا اور انہیں مستحق عذاب جانا تو انہیں چھوڑ کر چلے گئے لیکن اچانک ”بداء واقع ہوا“ اس قوم کے ایک عالم نے جب آثار عذاب دیکھے تو انہیں جمع کیا اور توبہ کی دعوت دی۔ سب نے بات مان لی اور وہ عذاب کہ جس کی نشانیاں ظاہر ہو چکی تھیں ٹل گیا۔ فلولاً کانت قریة امنت فنعھا ایمانھا الا قوم یونس لما امنوا کشفنا عنهم عذاب الخزی فی الحیوة الدنیا و متعناهم الیٰ حین۔ (یونس۔ ۹۸)۔

(۲) اسلامی تواریخ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دلہن کے بارے میں خبر دی کہ وہ اسی شب زفاف مرجائے گی لیکن وہ آپ کی پیش گوئی کے بر خلاف زندہ رہی جب آپ سے ماجرا پوچھا گیا تو فرمایا : کیا تم نے اس سلسلہ میں کوئی صدقہ دیا ہے۔

انہوں نے کہا :

جی ہاں

تو آپ نے فرمایا :

صدقہ حتمی بلاؤں کو دور کر دیتا ہے۔ 1

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے درحقیقت لوح محو و اثبات سے ارتباط کی وجہ سے ایسے واقعہ کے رونما ہونے کی خبر دی تھی حالانکہ یہ واقعہ مشروط تھا (شرط یہ تھی کہ اس میں صدقہ کی طرح کوئی مانع پیدا نہ ہو گیا ہو تو نتیجہ کوئی اور نکل آیا۔

(۳) بہادربت شکن ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہ اسماعیل کو ذبح کرنے پر مامور ہوئے اور اس ماموریت کے بعد بیٹے کو قربان گاہ میں لے گئے لیکن جب انہوں نے ثابت کر دیا کہ میں پوری طرح آمادہ ہو تو بداء واقع ہو گیا اور واضح ہو گیا کہ یہ ایک امتحان تھا اس عظیم پیغمبر اور انکے فرزند ارجمند کی اطاعت و تسلیم کو آزمایا جائے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ پہلے وہ مامور ہوئے کہ اپنی قوم سے تیس دن تک علیحدہ رہیں اور

احکام تورات حاصل کرنے کے لئے خدائی وعدہ گاہ کی طرف جائیں لیکن پھر ( بنی اسرائیل کی آزمائش کے لئے ) اس مدت کو دس دن بڑھا دیا گیا۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بداء کے ایسے واقعات کا کیا فائدہ؟

اس سوال کا جواب ان کے امور میں توجہ کرنے سے ظاہر مشکل نہیں رہتا جن کاسطور۔ بالا میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بعض اوقات اہم مسائل مثلاً کسی شخص کی آزمائش، کسی قوم کا امتحان، توبہ اور خدائی بازگشت ( جیسے داستان یونس میں آیا ہے ) صدقہ، حاجتمندوں کی مدد اور نیک کاموں کے زیر اثر دردناک برطرف ہو جاتے ہیں۔ ایسے ماور تقاضا کرتے ہیں کہ آئندہ کے واقعات پہلے اس طرح سے منظم ہوں اور پھر شرائط و حالات بدلنے سے وہ بھی بدل جائیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کی سر نوشت خود انہی کے ہاتھ ہے اور روش کی تبدیلی سے وہ اپنی تقدیر بدلنے پر قادر ہیں اور یہ بداء کے ساتھ نہیں پہچانا وہ اس کی پوری معرفت نہیں رکھتا، یہ بھی انہی حقائق کی طرف اشارہ ہے اسی لئے ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

مابعث الله عزوجل نبیاً حتی يأخذ علیہ ثلاث خصال الاقرار بالعبودية وخلق الانداد، و ان اله يقدم ما يشاء و يؤخر ما يشاء خدا نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس سے یہ تین پیمان لے۔ پر وردگار کی بندگی کا اقرار، ہر قسم کے شرک کی نفی اور یہ کہ خدا جس چیز کو چاہتا ہے مقدم کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے موخر کرتا ہے۔ 2 حقیقت میں پہلا پیمان خدا کی اطاعت اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے مربوط ہے دوسرا عہد شرک کے خلاف قیام کرنے سے متعلق ہے اور تیسرا مسئلہ بداء سے مربوط ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ حالات تبدیل کر کے اپنے آپ کو لطف الہی یا عذاب خدا کا حقدار بنا لیتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا پہلوؤں کی بناء پر علماء شیعہ نے کہا ہے کہ جب ” بداء “ کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو یہ ”ابداء“ کے معنی میں ہوتی ہے یعنی کسی ایسی چیز کو ظاہر کر دیتا ہے جو پہلے ظاہر نہ ہو اور جس پیشین گوئی نہ کی جاسکتی ہو۔

لیکن شیعوں کی طرف یہ نسبت دینا کہ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کبھی کبھی اپنے کام پر پشیمان ہو جاتا ہے یا کسی ایسی چیز سے باخبر ہو جاتا ہے کہ جس سے پہلے آگاہ نہ ہو یہ بہت بڑی زیادتی ہے اور ایسی تہمت ہے جسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔

اسی لئے ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

من زعم ان الله عزوجل بيد و له في شيء لم يعلمه امس فابروا منه

جو شخص یہ گمان کرے کہ خدا پر کوئی ایسی چیز آج آشکار ہوتی ہے جسے وہ کل نہیں جانتا تھا تو ایسے شخص سے بیزاری اختیار کرو۔ 3

سورہ رعد / 41 تا 43

۴۱۔ أُولَئِكَ يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْفُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَأْمَعَقَبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ -

۴۲۔ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ -

۴۳۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسَتْ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ -

ترجمہ

۴۱۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ ہم ہمیشہ زمین کے اطراف (وجوانب) کو کم کر رہتے ہیں ( معاشرے، تمدن اور علماء تدریجاً ختم ہوتے رہتے ہیں ) اور خدا حکومت کرتا ہے اور کسی شخص کو اسے روکنے یا اس کے احکام رد کرنے کا یارا نہیں اور وہ سریع الحساب ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے ان سے پہلے سازشیں کیں اور منصوبے بنائے لیکن منصوبہ بنانا تو خدا کا کام ہے کہ جو ہر شخص کے کام سے آگاہ ہے اور عنقریب کفار جان لیں گے کہ دوسرے گھر میں ( نیک و بد ) انجام کس کا ہے۔

۴۳۔ جو کافر ہو گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ر ورسول نہیں ہے۔ کہہ دے کہ خدا اور وہ لوگ کہ جن کے پاس علم کتاب ( اور قرآن کی آگاہی ) ہے ( میری ۹ گواہی کے لئے کافی ہیں۔

.....

1. بحار الانوار چاپ قدیم ، جلد ۲ ص ۱۳۱ از امالی صدوق ۔
2. اصول کافی ، جلد ۱ ص ۱۱۴ ، سفینة البحار جلد ۱ ص ۶۱ ۔
3. سفینة البحار جلد ۶۱ ۔

انسان اور معاشرے ختم ہو جاتے ہیں ، خدا باقی رہتا ہے

گزشتہ آیات میں روئے سخن رسول اللہ کی رسالت کے منکرین کی طرف تھا ۔ ان آیات میں اس بحث کو جاری رکھا گیا ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ انہیں تنبیہ کی جائے ، انہیں بیدار کیا جائے ، ان کے سامنے استدلال کیا جائے الغرض مختلف طریقوں سے انہیں عقلی راہ پر لگا کر غور و فکر کرنے اور پھر اپنی حالت کی اصلاح کرنے پر آمادہ کیا جائے ۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے : ان مغرور اور ہٹ دھرم افراد نے دیکھا نہیں کہ ہم مسلسل زمین کے اطراف و جوانب کو کم کرتے رہتے ہیں ( أَوْلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ) ۔

واضح ہے کہ زمین سے یہاں مراد اہل زمین ہیں ۔ یعنی کیا وہ اس واقعیت کی طرف نگاہ نہیں کرتے کہ ہمیشہ اقوام ، تمدن اور حکومتیں زوال پذیر ہوتی ہیں ۔ وہ قومیں کہ جو ان سے زیادہ قوی تھیں ، زیادہ طاقتور تھیں اور زیادہ سرکش تھیں ، ان سب نے اپنے اپنے منہ می میں چھپا لئے ۔ یہاں تک کہ علماء بزرگ اور دانشور کہ جو زمین کا سہارا تھے انہوں نے بھی اس جہان سے آنکھیں بند کر لیں اور ابدایت کے ساتھ وابستہ ہو گئے ۔ کیا یہ ہمہ گیر قانون حیات کہ جو تمام افراد ، تمام انسانی معاشروں اور ہر چھوٹے بڑے پر جاری و ساری ہے ان کے بیدار ہونے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ اس چند روزہ زندگی کو ابدی نہ سمجھیں اور اسے غفلت میں نہ گزار دیں ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : حکومت اور فرمان جار کرنا خدا کے لئے ہے اور کسی شخص میں اس کے فرمان کو ر ف کرنے اور سے روکنے کا یارا نہیں ہے (وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَأُمْعَبِّ لِحُكْمِهِ) ۔ اور وہ سریع الحساب ہے ( وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ) ۔ اس بناء پر ایک طرف تو اس نے تمام افراد اور سب قوموں کو پشیمانی پر قانون ۔ فنا رقم کر دیا ہے اور دوسری طرف کسی کی مجال نہیں کہ اس فرمان کو یا خدا کے دوسرے فرامین کو بدل سکے اور تیسری طرف وہ بندوں سے بڑی تیزی سے حساب لیتا ہے اور اس طرح سے اس کی جزاء قطعی ہے ۔

کئی ایک روایات کو جو تفسیر برہان ، نور ثقلین ، دیگر تفاسیر اور کتب حدیث میں آئی ہیں ان میں زیر نظر آیت کی تفسیر علماء اور دانشمندیان کی گئی ہے کیونکہ ان کا فقدان زمین اور اسلامی معاشرے کمی اور نقصان کا سبب بنتا ہے ۔

مفسر ۔ بزرگ طبرسی اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں :

نقصها بذهاب علمائها ، وفقهائها و خيارها

ہم زمین میں اس کے علماء فقہا اور نیک لوگوں کے لئے چلے جانے سے کمی واقع کرینگے ۔ ۱۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس وقت حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام شہید ہوئے تو عبد اللہ بن عمر نے یہ آیت پڑھی :

انا نأتی الارض ننقصها من اطرافها

اس کے بعد کہا :

یا امیر المومنین لقد كنت الطرف الاکبر فی العلم ، الیوم نقص علم الاسلام و مضی رکن الایمان

اے امیر المومنین آپ عالم انسانیت میں علم انسانیت میں علم کی بہت بڑی ”طرف“ تھے ۔ آپ شہادت سے آج اسلام کا علم و دانش نقصان کی طرف جھگ گیا اور ایمان کا ستون گر گیا ۔ 2

باقی رہا یہ کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ زمین کے نقصان سے مراد کفار کی زمینوں کا کم ہونا اور مسلمان علاقوں میں اضافہ ہونا ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت تو ایسی فتوحات نہیں تھیں کہ کفار جنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور قرآن ان کی طرف اشارہ کرتا ۔ نیز یہ جو بعض مفسرین کہ جو علوم طبیعی میں مستغرق ہیں وہ زیر نظر آیت کو قبطین کی طرف سے زمین کے کم ہونے اور استوائی جانب سے زیادہ ابھر نے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں ، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ قرآن کی زیر نظر آیت میں یہ چیز بیان کرنے کا موقع نہیں ہے ۔

بعد والی آیت میناسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے : صرف یہی گروہ نہیں کہ جو سازشوں اور مکرو فریب کے ساتھ تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے بلکہ ” ان سے پہلے والے بھی سازشیں اور مکاریں کیا کرتے تھے “ ( وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ) ۔

لیکن ان کے منصوبے نقش بر آب ہو گئے اور ان کی سازشیں حکم خدا سے بے اثر ہو کر رہ گئیں کیونکہ وہ ہر شخص کے معاملات خود اس سے بہتر جانتا ہے نکہ ”تمام منصوبے خدا کے لئے ہیں“ (فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا) وہ ہے کہ جو ہر شخص کے کسب و کار سے آگاہ ہے اور ”وہ جانتا ہے کہ ہر شخص کیا انجام دیتا ہے“ (يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ)۔ اور پھر تہدید کے لہجے میں انہیں ان کے انجام کار سے ڈرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کفار بہت ہی جلد جالیں گے کہ انجام کار اور نیک و بد عاقبت دوسرے جہان میں کس کس کے لئے ہے (وَسَيَعْلَمُ الْكَافِرُ لِمَنْ عَشِيَ الدَّارِ)۔ جس طرح سے یہ سورت قرآن اور کتاب اللہ کے ذکر سے شروع ہوئی تھی اسی طرح زیر بحث آخری آیت میں قرآن کے معجزہ ہونے پر بہت زیادہ تاکید گئی ہے اور اسی پر سورہ رعد ختم ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ کافر کہتے ہیں کہ تو رسول نہیں ہے (وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا اَسْتَأْتِرُكَ مَرْسَلًا) یہ لوگ ہر روز ایک نیا بہانہ تراشتے ہیں، ہر وقت معجزہ کا تقاضا کرتے ہیں اور پھر بھی آخر کار کہتے ہیں کہ تو پیغمبر نہیں ہے۔

ان کے جواب میں کہو: یہی کافی ہے کہ دو ہستیاں میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہیں ایک اللہ اور دوسرا وہ کہ جس کے پاس کتاب کا علم اور قرآن کی آگاہی موجود ہے (قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ)۔ ایک تو خود خدا جانتا ہے میں اس کا بھیجا ہوا ہوں اور دوسرے وہ لوگ کہ جو میری اس آسمانی کتاب یعنی قرآن کے بارے میں کافی آگہی رکھتے ہیں وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کتاب انسانی دماغ کی ساختہ نہیں ہے خدایے بزرگ کے سوا یہ کسی اور کی ہو، یہ بھی مختلف پہلوؤں سے قرآن کے اعجاز ہونے کے بارے میں ایک تاکید ہے۔ اس کی تفصیل ہم دیگر خصوصاً کتاب، قرآن و آخرین پیامبر میں بیان کر چکے ہیں۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کی بنا پر (ومن عندہ علم الکتاب) سے مراد مضامین قرآن مجید سے آگاہ افراد ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ اہل کتاب کے علماء کی طرف اشارہ ہے بہت سی روایات میں آیا ہے (من عندہ علم الکتاب) سے مراد حضرت علی بن ابی طالب اور دیگر ائمہ ہدی مراد ہیں۔

اس سلسلے کی روایات تفسیر نور الثقلین اور تفسیر برہان می جمع کردی گئی ہیں لیکن یہ روایات اس بات کی دلیل نہیں کہ مفہوم آیت اسی پر منحصر نہیں ہے جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے کہ یہ ایک مصداق یا مصادیق نامہ و کاملہ کی طرف اشارہ ہیں۔ بہر حال یہ روایات پہلی تفسیر کہ جسے ہم نے انتخاب کیا ہے کی تائید کرتی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم اپنی گفتگو پیغمبر اکرم سے منقول ایک روایت پر ختم کریں

ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر گرامی سے ،، قال الذی عندہ علم من الکتاب،، اس شخص نے کہا کہ جس کے پاس کتاب میں سے علم تھا (یہ آیت حضرت سلیمان کے واقعہ کے ضمن میں ہے)

کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ذاک وصی اخی سلیمان بن داود

وہ میرے بھائی سلیمان بن داود کا وصی اور جانشین تھا ابو سعید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ،، قل کفی باللہ شہیدا بینی وبینکم ومن عندہ علم الکتاب،، کس کے بارے میں ہے اور کس طرف اشارہ ہے رسول اللہ نے فرمایا: ذاک اخی علی بن ابی طالب

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں۔ (المیزان ج، ۱۱ ص ۴۲۷)

پروردگار! اپنی رحمت کے دروازے ہم پر کھول دے اور اپنی کتاب کا علم ہم پر ارزانی فرما۔

بار الہا! قرآن کی آگہی سے ہمارے دل اس طرح سے روشن اور ہماری فکر کو ایسا توانا بنا ہم تجھے چھوڑ کر تے رے غر کی طرف نہ جائیں، کسی چیز کو تیری مشیت پر مقدم نہ کریں، خود غرضیوں، تنگ نظریوں اور خود بینیوں کے تنگ و تاریک گڑھوں میں نہ گریں، تے رے بندوں کے درمیان تفرقہ نہ ڈالیں، اپنے اسلامی انقلاب کو خطرے کی طرف کھینچ نہ لے جائیں اور اسلام، قرآن اور ملت اسلامی کی مصلحتوں کو ہر چیز پر مقدم رکھیں۔

خداوند! عراق کے ظالم حکام کو خواب غفلت سے بیدار کر کہ جنہوں نے یہ خانماں سوز، ویران گر اور تباہ کن جنگ دشمنان اسلام کی تحریک ہم پر مسلط کی ہے اور اگر وہ بیدار ہونے والے نہیں تو انہیں نابود فرما اور ہمیں اپنی کتاب کے زیر سایہ آگہی عطا فرما جس سے ہم حق و عدالت کے دشمنوں پر کامیابی کے لئے جائز اور تمام ممکنہ وسائل سے استفادہ کریں۔

.....

معاشرے یا بطور کلی اہل زمین - یہ تمام لوگوں کے لئے جس بیداری ہے چاہے وہ نیک ہوں یا برے حتی کہ علماء اور دانشمندیوں کے لئے بھی کہ جو انسانی معاشروں کے ستون ہیں جب کہ ان میں سے کبھی ایک کے چلے جانے سے پوری دنیا کو نقصان پہنچتا ہے - یہ سب کے لئے بولتی ہوئی بلا دینے والی صدائے ہوشیار باش ہے -

## تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 1-3

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
 ۱۔ الرَّ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ -  
 ۲۔ اللَّهُ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَيُوَلِّئُ لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ -  
 ۳۔ الَّذِينَ يَسْتَجِيبُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْأَجْرَةِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ -

ترجمہ

رحمن و رحیم کے نام سے

۱۔ اللہ - یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر نازل کی تاکہ تو پروردگار نے فرمان سے لوگوں کو (شرک ، ظلم اور طغیان کی تاریکیوں سے نکال کر) ایمان ، عدل اور صلح کی ) کی روشنی کی طرف جائے ، عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف۔  
 ۲۔ وہی خدا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ، اسی کا ہے - کافروں کے لئے افسوس ناک بے عذاب۔ شدید -

۳۔ وہی کہ جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور ( لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ راہ حق کو ٹیڑھا کر دیں اور دور کی گمراہی میں ہیں -

تفسیر

ظلمتوں سے نور کی طرف

یہ سورہ بھی قرآن کی بعض دیگر سورتوں کی طرح حروف مقطعه (ألر) سے شروع ہوئی ہے - ان حروف کی تفسیر ہم سورہ بقرہ، آل عمران اور اعراف کی ابتداء میں بیان کر چکے ہیں - یہاں نکتے کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ۲۹ مقامات پر قرآن کی سورتوں کا آغاز حروف مقطعه سے ہوا ہے - ان میں سے ۲۴ مقامات ایسے ہیں جن میں بلا فاصلہ قرآن مجید کے بارے میں گفتگو آئی ہے - یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ قرآن اور حروف مقطعه کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہی تعلق ہو جس کا ذکر ہم سورہ بقرہ کی ابتداء میں کر چکے - وہ یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ اس سے واضح کرے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب اپنے با عظمت معافی و مفاہیم کہ جن کی بناء پر وہ تمام انسانوں کی ہدایت اپنے ذمہ لئے ہوئے ہے کہ باوجود اسی سادہ سے خام مال ( الف ، باء) سے تشکیل پائی ہے اور یہ اس اعجاز کی اہمیت کی نشانی ہے کہ وہ سادہ ترین چیز سے افضل ترین چیز کو وجود بخشا ہے -

بہر حال الف ، لام، را - کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے : یہ وہ کتاب ہے کہ جو ہم نے تجھ پر اس لئے نازل کی کہ تو لوگوں کو گمراہیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے - ( كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ) -  
 درحقیقت نزول قرآن کے تمام تر بیٹی ، انسانی ، روحانی اور مادی مقاصد اسی ایک جملے میں جمع ہیں ، ” ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے جانا“۔ ظلم و جہالت سے نور علم کی طرف ، ظلمت کفر سے نور ایمان کی طرف ، ظلمت ظلم سے نور عدالت کی ، فساد سے نور صلاح کی طرف ظلمت گناہ سے نور تقویٰ کی طرف اور ظلمت افتراق سے نور وحدت کی طرف۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ یہاں ” ظلمات “ بعض دیگر قرآنی سورتوں کی طرح جمع کی شکل میں آیا ہے اور ” نور “ واحد

کی صورت میں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمام نیکیاں، پاکیزگیاں، ایمان و تقویٰ اور فضیلت نورِ توحید کے سائے میں اپنے آپ میں وحدت و یگانگی کی حالت میں ہیں اور سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور متحد ہیں اور ان سے ایک متحد و واحد معاشرہ، جو ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ کیڑے کی مانند ہو تیار کیا جاسکتا ہے۔

لیکن ظلمت ہر مقام پر پر اگندگی اور صفوں میں تفرقہ کا سبب ہے۔ ستم گر، بدکار، آلودہ گناہ اور منحرف لوگ عموماً اپنی انحرافی راہوں میں بھی وحدت نہیں رکھتے اور آپس میں حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں۔

تمام نیکیوں کا سرچشمہ چونکہ خدا کی ذاتِ پاک اور ادراکِ توحید کی بنیادی شرط اسی حقیقت کی طرف توجہ ہے لہذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے: یہ سب کچھ ان (لوگوں) کے پروردگار کے اذن و حکم سے ہے (بِإِذْنِ رَبِّهِمْ)۔ اس نور کے بارے میں مزید توضیح کے لئے فرمایا گیا ہے: عزیز و حمید خدا کی راہ کی طرف (إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ)۔ ۱

وہ کہ جس کی عزت اس کی قدرت کی دلیل ہے کیونکہ کسی کے بس میں نہیں کہ اس پر غلبہ حاصل کرسکے اور اس کا حمید ہونا اس کی بے پایاں نعمات کی نشانی ہے کیونکہ حمد و ستائش ہمیشہ نعمتوں، عنائتوں اور زیبائی پر ہوتی ہے۔

اگلی آیت میں معرفتِ خدا کے لئے ایک درسِ توحید دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہی خدا کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اسی ہے (اللّٰهُ الَّذِي لَمْ يَأْتِ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ)۔ 2

تمام چیزیں اس کی ہیں کیونکہ وہی موجودات کاخالق ہے، اسی بناء پر وہ قادر و عزیز بھی ہے، تمام نعمتیں بخشنے والا اور حمید بھی۔

ذکر مبداء کے بعد آیت کے آخر میں مسئلہ معاد کی جانب توجہ توجہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وائے ہو کفار پر قیامت کے شدید عذاب سے (وَوَيْلٌ لِلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ)۔

اگلی آیت میں بلا فاصلہ کفار کا تعارف کروایا گیا ہے۔ ان کی صفات کے تین حصوں کا ذکر کر کے ان کی کیفیت کو پوری طرح مشخص کر دیا گیا ہے اس طرح سے کہ ہر شخص ان کا سامنا کرتے ہیں انہیں پہچان لے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو اس جہان کی پست زندگی کو آخرت کی زندگی پر مقدم شمار کرتے ہیں (الَّذِينَ يَسْتَحْبِبُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ)۔ 3

اسی وجہ سے وہ ایمان، حق، عدالت، شرفِ آزادگی اور سر بلندی کہ جو آخرت سے لگاؤ رکھنے والوں کی خصوصیات میں سے ہیں اپنے گھٹیا مفادات، شہوات اور ہوا و ہوس پر قربان کر دیتے ہیں

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ایسے لوگ اسی ہر بس نہیں بلکہ خود ہی میں پڑنے کے بعد دوسروں کو بھی بھٹکا نے کی کوشش کرے ہیں اور ”وہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہیں“۔ (وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ)۔

در حقیقت وہ اللہ کی راہ کہ جو راہِ فطرت ہے اور انسان خود سے چل کر اسے عبود کر سکتا ہے اس میں طرح طرح کی دیوار اٹھاتے ہیں اور رکاوٹیں کھری کرتے ہیں۔ اپنی ہوا و ہوس اور خواہشا کی بنا سنوار کر پیش کرتے ہیں، لوگوں کو گناہ کا شوق دلاتے ہیں اور راستی و پاکیزگی کے راستے سے خوف زدہ کرتے ہیں۔

ان کا کام فقط اللہ کے راستے میں رکاوٹیں اور دیواریں کھڑی کرنا نہیں بلکہ ”کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے اسے بگاڑ کر پیش کریں“ (وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا)۔

در اصل وہ پوری توانائیوں سے کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیں اور اپنا ہم مسلک بنالیں لہذا ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ کے سیدھے کو ٹیڑھا کر کے دکھائیں۔ اس لئے وہ اس میں طرح طرح کی خرافات اور بے ہودہ گیاں پیدا کرتے ہیں، مختلف تحریفات سے کام لیتے ہیں۔ قبیح بدعتوں کو رواج دیتے ہیں اور کثیف طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ ”ان صفات و اعمال کے حامل ہونے کی وجہ سے ایسے افراد بہت دور کی گمراہی میں ہیں“ (أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ)۔ یہ وہی لوگ ہیں کہ راہِ حق سے زیادہ دور ہونے کی بناء پر جن کا راہِ حق کی طرف لوٹ آنا آسانی سے ممکن نہیں لیکن یہ سب کچھ خود انہی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ایمان اور راہِ خدا کو نور سے تشبیہ دینا

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”نور“ عالم مادہ کا لطیف ترین موجود ہے، اس کی رفتار نہایت تیز ہے اور جہانِ مادہ میں اس کے آثار و برکات ہر چیز سے زیادہ ہیں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام مادی نعمات و برکات کا سرچشمہ نور ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان اور راہِ خدا میں قدم رکھنے کو نور سے تشبیہ دینا کس قدر پر معنی ہے۔

نور اتحاد کا سبب ہے اور ظلمت انتشار کا عامل ہے۔ نور زندگی کی علامت ہے اور ظلمت موت کی نشانی ہے۔ اسی بناء

پر قرآن مجید میں بہت سے قیمتی امور کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے ۔  
 ان میں سے ایک عمل صالح ہے ۔  
 یوم تری المؤمنین و المؤمنات یسعی نور ہم بین ایدیہم و بایمانہم  
 وہ دن کہ جب تو صاحب ایمان مردو اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب رواں دواں ہو  
 گا ۔ ( حدید - ۱۲ ) ۔

ایمان اور توحید کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے ۔ مثلاً  
 اللہ ولی الذین آمنوا یخرجہم من الظلمات الی النور  
 اللہ ان لوگوں کا ولی و سر پرست ہے جو ایمان لائے ہیں کہ جنہیں وہ ظلمتوں سے نور کی ہدایت کرتا ہے ۔ ( بقرہ - ۲۵۷ )  
 قرآن کو بھی نور سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :  
 فالذین آمنوا بہ و عزروہ و نصروہ و اتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ہم المفلحون  
 اور جو پیغمبر پر ایمان لائے ہیں ، اس کی عزت و توقیر کرتے ہیں ، اس کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے  
 ہیں کہ جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے ، وہ فلاح پانے والے ہیں ۔ ( اعراف - ۱۵۷ )  
 نیز خدا کے آئین و دین کو اس پر برکت وجود سے تشبیہ دی گئی ہے :

یریدون ان یطفوا نور اللہ باقواہم  
 وہ چاہتے ہیں کہ پھونکوں سے نور خدا کا خاموش کر دیں ۔ ( توبہ - ۳۲ )  
 اور سب سے بڑھ کر خدا کی ذات پاک کہ جو افضل ترین وجود ہے بلکہ سب کی ہستی جس کے وجود مقدس کا پر تو ہے  
 کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :

اللہ نور السموات و الارض  
 اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے ۔ ( نور - ۳۵ )  
 یہ تمام امور ایک ہی حقیقت کی طرف پلٹتے ہیں کیونکہ یہ سب اللہ ، اس پر ایمان ، اس کی گفتگو اور اس کی راہ کے پر  
 تو ہیں ۔ لہذا یہ لفظ ان مواقع پر مفرد کی شکل میں آیا ہے ۔ جب کہ اس کے برعکس ”ظلمات“ چونکہ ہر جگہ انتشار و تفرقہ  
 کا عامل ہے لہذا جمع کی صورت میں تعدد و تکثر کی علامت کے طور پر ذکر ہوا ہے اور خدا پر ایمان لانا ، اس کی راہ  
 میں قدم رکھنا چونکہ حرکت بیداری کا سبب ہے ، اجتماعیت و وحدت کا عامل ہے اور ارتقاء و پیش رفت کا ذریعہ ہے لہذا  
 یہ تشبیہ ہر لحاظ سے رسا ، با معنی اور باعث تربیت ہے ۔

۲۔ ”لتخرج“ کامفہوم :

پہلی آیت میں ”لتخرج“ کی تعبیر درحقیقت دو نکات کی طرف اشارہ کرتی ہے :  
 پہلا یہ کہ قرآن مجید اگر انسان کے لئے ہدایت و نجات کی کتاب ہے تاہم اسے اجراء و نفاذ کرنے والے اور علمی صورت  
 بخشنے والے کی احتیاج ہے لہذا پیغمبر جسے راہبر کی ضرورت ہے جو اس کے ذریعے راہ حقیقت سے بھٹکے ہوؤں کی  
 بدبختی کی ظلمات سے نور سعادت کی طرف ہدایت کرے ۔ لہذا قرآن بھی اپنی اس قدر عظمت کے باوجود رہبر ، رانما ،  
 مجری اور نافذ کرنے والے کے بغیر تمام مشکلات حل نہیں کر سکتا ۔  
 دوسرا یہ کہ خارج کرنے کی تعبیر درحقیقت تغیر و تبدل کے ساتھ حرکت دینے اور چلانے کی دلیل ہے ۔ گویا بے ایمان لو  
 گ ایک تنگ و تاریک فضا میں ہوتے ہیں اور پیغمبر و رہبر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں وسیع اور روشن فضا میں لے جاتے  
 ہیں ۔

۳۔ سورۃ کے آغاز و اختتام پر ایک نظر :

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ اس سورۃ کا آغاز لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف ہدایت سے ہوا ہے اور اختتام بھی  
 لوگوں کو ابلاغ و انداز پر ہوا ہے ۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ بہر حال اصلی ہدف خود لوگ ، ان کی سرنوشت اور ان کی  
 ہدایت ہے اور درحقیقت انبیاء و مرسلین کا بھیجنا اور آسمانی کتب کا نزول سب اس کو پانے کے لئے ہے ۔

- ۴۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ .  
 ۵۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ .  
 ۶۔ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُدَّبُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْبُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكَ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ .  
 ۷۔ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ .

ترجمہ

- ۴۔ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ ان کے سامنے (حقائق) آشکار کرے پھر خدا جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے (اور مستحق سمجھے) ہدایت کرتا ہے اور وہ تو توانا و حکیم ہے ۔  
 ۵۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال اور انہیں ایام اللہ یاد دلا اس میں ہر صبر کرنے والے اور شکر گزار کے لئے نشانیاں ہیں ۔  
 ۶۔ وہ وقت یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد رکھو جب کہ اس نے تمہیں آل فرعون (کے چنگل سے) سے نجات بخشی ۔ وہ کہ جو تمہیں بدترین طریقے سے عذاب دیتے تھے ۔  
 تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (خدمت گاری کے لئے) زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف بہت بڑی آزمائش تھی ۔  
 ۷۔ (اسی طرح) اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر شکر گزاری کرو گے تو تم پر (اپنی نعمت کا) اضافہ کروں گا اور اگر کفران کرو گے تو میرا عذاب سخت ہے ۔

تفسیر

زندگی کے حساس دن

- گزشتہ آیات میں قرآن مجید اور اس کے حیات بخش اثرات کے متعلق گفتگو تھی ۔ زیر بحث پہلی آیت میں بھی ایک خاص پہلو سے اس موضوع کے بارے میں بات کی گئی ہے اور وہ ہے انبیاء اور آسمانی کتب کی زبان کا اس پہلی قوم کی زبان سے ہم آہنگ ہونا جس کی طرف وہ مبعوث ہوئے ۔  
 فرمایا گیا ہے : ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں ( وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ ) ۔  
 کیونکہ پہلے پہل تو کسی پیغمبر کا تعلق اسی قوم سے پیدا ہوتا ہے جس میں وہ قیام کرتے ہیں ، انبیاء کے ذریعے پہلی وحی کی شعاع اسی پر پڑتی ہے اور ان کے اولین اصحاب و انصار اسی میں سے ہوتے ہیں لہذا پیغمبر کو انہی کی زبان میں گفتگو کرنا چاہئے ” تاکہ وہ ان کے لئے حقائق کو واضح طور پر پیش کر سکے “ (لِيُبَيِّنَ لَهُمْ)  
 اس جملے میں درحقیقت اس کے نکتے کی طرف ہی اشارہ ہے کہ عام طور پر انبیاء کی دعوت ان کے پیروکاروں پر کسی انجانے اور غیر مانوس طریقے سے منعکس نہیں ہوتے تھی بلکہ واضح و روشن طور پر عام مروجہ زبان میں وہ تعلیم و تربیت کرتے تھے ۔  
 اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : ان کے سامنے منہ دعوت الہی کی وضاحت کے بعد ”خدا جس شخص کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے“ (فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ) ۔  
 یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آخر کار کسی کا ہدایت یافتہ ہونا یا گمراہ ہونا انبیاء کاکام تو تبلیغ اور تبیین ہے ۔ بندوں کی حقیقی ہدایت و رہنمائی تو خدا ہی کے ہاتھ ہے ۔  
 اس بناء پر کہیں یہ تصور نہ ہو کہ اس کا مطلب جبر ، لازمی طور پر ہونا اور انسان کی آزادی کا سلب ہونا ہے ، بلافاصلہ مزید ارشاد فرمایا گیا ہے : وہ عزیز حکیم ہے ( وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ) ۔

اپنی عزت و قدرت کی وجہ سے وہ ہر چیز پر قادر و توانا ہے اور کوئی شخص اس کے ارادے کے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق وہ کسی شخص کو بلا سبب ہدایت نہیں کرتا اور نہ کسی کو بلا وجہ گمراہ کرتا ہے بلکہ بندے اپنے ارادے کی انتہائی آزادی کے ساتھ ”سیر الیٰ اللہ“ کے لئے قدم اٹھاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے دل پر نور ہدایت اور فیضِ حق کی کرنیں پڑتی ہیں۔ جیسا کہ سورہ عنکبوت کی آیت ۶۹ میں ہے :

والذی جاہدوا فینا لنہدینہم سبیلنا

جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور جدو جہد کرتے ہیں ہم یقینی طور پر انہیں اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں نے تعصب، ہٹ دھرمی، حق دشمنی، شہوات میں غوطہ زنی اور ظلم میں آلودگی کے باعث ہدایت کے لئے اپنی قابلیت گنوا دی ہے وہ فیضِ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں اور ضلالت و گمراہی کی وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے :

کذلک یضلّ اللہ من ہومسرف مرتاب

اسی طرح خدا ہر اسراد کرنے والے اور آلودہ شک شخص کو گمراہ کرتا ہے۔ (مومن - ۳۴)

یہ بھی فرمایا گیا ہے :

وما یضلّ بہ الا الفاسقین

اس کے ذریعہ خدا صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے (بقرہ۔ ۲۶) نیز یہ بھی ارشاد ہوتا ہے :

یضلّ اللہ الظالمین

خدا ستمگروں کو گمراہ کرتا ہے۔ (ابراہیم - ۲۷)

گویا ہدایت اور گمراہی کا سرچشمہ خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔

اگلی آیت میں اپنے ہم عصر طاغوتوں کے مقابلے میں انبیاء کے قیام کا ایک نمونہ ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ظلمتوں سے نکال کر وادی نور میں لے جانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات (مختلف معجزات) کے ساتھ بھیجا اور ہم نے اسے حکم دیا کہ اپنی قوم کو ظلمات سے ویر کی طرف ہدایت کرو (وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ)۔ ۱۰

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی پہلی آیت میں پڑھا ہے پیغمبر اسلام کے پروگرام کا خلاصہ بھی لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکال لے جانا تھا۔

یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہ سب خدا کے انبیاء و رسل ہیں بلکہ سب کے سب انسانوں کے معنوی اور روحانی راہنما ہیں۔ کیا برائیاں، گمراہیاں، کج رویاں، ظلم و ستم، استعمار، ذلتیں، زبوں حالیاں، فتنہ و فساد اور گناہ ظلمت و تاریکی کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ اور کیا ایمان و توحید، تقویٰ و پاکیزگی، آزادی و استقلال اور سربلندی و عزت نور و ضیا کے سوا کچھ اور ہے۔ اس بناء پر تمام رہبروں کی دعوت کے درمیان بالکل یہی قدر مشترک اور قدر جامع ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیری ذمہ داری ہے کہ تو اپنی قوم کو ”ایام اللہ“ یا دلائل (وَدَّكُرْهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ)۔

مسلم ہے کہ تمام دن ایام الہی ہیں جیسے تمام جگہیں اور مقامات خدا سے تعلق رکھتے ہیں اب اگر کسی خاص مقام کو ”بیت اللہ“ سے موسوم کیا جائے تو یہ اس کی خصوصیت کی دلیل ہے۔ اسی طرح مسلم ہے کہ ”ایام اللہ“ کا عنوان مخصوص دنوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو بہت زیادہ امتیاز و درخشندگی رکھتے ہیں۔

اسی بناء پر مفسرین نے اس کی تفسیر میں مختلف احتمالات پیش کئے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ گزشتہ انبیاء اور ان کی سچی اور اچھی امتوں کی کامیابی کے دنوں کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح وہ ایام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں کہ جن میں انہیں ان کی اہلیت کی بناء پر انواع و قسام کی نعمتوں سے نوازا گیا۔

بعض نے کہا کہ یہ ان دنوں کی طرف اشارہ ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے سرکش قوموں کو عذاب زنجیر میں جکڑا اور طاغوت و سرکش افراد کو ایک ہی فرمان سے تباہ و برباد کر دیا۔

بعض نے ان دونوں حصوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن اصولی طور پر اس گویا، عمدہ اور رسا تعبیر کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تمام دن ”ایام اللہ“ ہیں کہ جو نوع بشر کی زندگی کی تاریخ میں حاملِ عظمت ہیں۔ ہر وہ دن کہ جس میں کوئی فرمانِ الہی اس طرح درخشندہ ہوا کہ باقی امور کو اپنے تحت الشعاع لے آیا وہ ایام اللہ میں سے ہے۔

جس روز انسانوں کی زندگی میں سے نیا باب کھلا، انہیں درسِ عبرت دیا گیا، ان میں کسی پیغمبر نے ظہور یا قیام فرمایا

یا جس دن کوئی منکر ، طاغوت اور فرعون ظلمت کے گڑھے میں پھنکا گیا ۔ خلاصہ یہ کہ وہ دن کہ جس میں حق و عدالت برپا ہوئی اور ظلم و بدعت خاموش ہوئی وہ ایام اللہ میں سے ہے جیسا کہ ہم دیکھیں گے ائمہ معصومین علیہم السلام کی اس تفسیر کے ذیل میں منقول روایات میں بھی حساس دنوں کی نشاندہی کی گئی ہے ۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے : اس گفتگو میں اور تمام ایام اللہ میں ہر صابر و با استقامت اور شکر گزار انسان کے لئے نشانیاں ہیں (إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ) ۔

”صبار“ اور ”شکور“ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں ان میں سے ایک صبر و استقامت زیادہ ہونے اور دوسرا نعمت و احسان پر شکر گزاری زیادہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے ۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ صاحب ایمان افراد نہ تو سختیوں اور مشکلوں کے دنوں میں حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو حوالہ حوادث کر دیتے ہیں اور نہ ہی کامیابی اور نعمت کے دنوں میں غرور و غفلت میں گرفتار ہوتے ہیں اور ”ایام اللہ“ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ان دونوں کا تذکرہ گویا اسی مقصد کی نشاندہی کر رہا ہے ۔

بعد والی آیت میں تاریخ بنی اسرائیل میں ایام اللہ اور درخشاں و پر بار دلوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کا ذکر مسلمانوں کے لئے بھی تذکرہ تھا ۔ ارشاد ہوتا ہے : اس وقت کو یاد کرو کہ جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس نعمت خدا کا تذکرہ کرو کہ جب اس نے تمہیں آل فرعون سے نجات بخشی (وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ) ۔

وہی فرعون کی جنہوں نے تم پر بدترین عذاب مسلط کر رکھا تھا ، تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو خدمت اور کنیزی کے لئے زندہ رکھتے تھے (يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيَدْبَحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ) ۔ اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری بہت بڑی آزمائش تھی (وَفِي ذَلِكَ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ) ۔

اس دن سے زیادہ با برکت کونسا دن ہو گا کہ جس دن تمہارے سروں سے خود غرض ، سنگدل اور استعمارگر لوگوں کو دور کیا گیا ۔ وہی لوگ کہ جو تمہارے ساتھ ایک بہت بڑا ستم روا رکھے ہوئے تھے ۔ اس ظلم سے بڑھ کر کیا ہوسکتا تھا کہ وہ تمہارے بیٹوں کے سر جانوروں کی طرح کاٹ دیتے تھے (توجہ رہے کہ قرآن نے ذبح کہا ہے قتل نہیں) اور اسے بڑھ کر یہ کہ تمہاری عزت و ناموس بے شرم دشمن کے چنگل میں کنیزوں کی طرح گرفتار تھی ۔

نہ صرف بنی اسرائیل کے لئے بلکہ اقوام و ملل کے لئے آزادی و استقلال کے حصول اور طاغوت کی دست برد سے نجات کا دن ایام اللہ میں سے ہے کہ جسے انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے ۔ ایسی یاد کہ جس کے سبب وہ گزشتہ حالت کی طرف لوٹنے سے محفوظ ہیں ۔

”یسومونکم“ سوم (بروزن ”صوم“) کے مادہ سے ہے ۔ دراصل یہ کسی چیز کے پیچھے جانے اور اس کی جستجو کے معنی میں ہے نیز یہ لفظ کسی پر کسی کام کو زبردستی ٹھونسنے کے معنی میں بھی آیا ہے ۔ 2

”یسومونکم سوء العذاب“ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تم پر بدترین سختیاں اور عذاب مسلط کرتے تھے ۔ کیا یہ کم مصیبت ہے کہ ایک گروہ کی فعال قوت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے اور اس کی عورتوں کو کسی سرپرست کے بغیر چند ظالموں کے چنگل میں کنیزوں کی طرح باقی رہنے دیا جائے ۔

ضمناً ”یسومون“ کا فعل مضارع کی صورت میں ہونا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کام مدتوں جاری رہا ۔ 3

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بیٹوں کا سر کاٹنے اور عورتوں کی کنیزی کے ذکر کے بعد ان کا واؤ کے ذریعے ”سوء العذاب“ پر عطف کیا گیا ہے حالانکہ یہ خود ”سوء العذاب“ کا مصداق ہیں ۔ ایسا ان دونوں عذابوں کی اہمیت کی بناء پر ہوا ہے ۔ نیز یہ نشاندہی کرتا ہے کہ فرعون کی جابر اور ستم گر قوم بنی اسرائیل پر اور مظالم بھی روا رکھتی تھی لیکن ان میں سے یہ دو ظلم بہت شدید اور نہایت سخت تھے ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : یہ بات بھی یاد رکھو کہ تمہارے پروردگار نے اعلان کیا کہ اگر میری نعمتوں کا شکر بجا لاؤ تو یقیناً میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا اور اگر کفران کرو تو میرا عذاب اور سزا شدید ہے (وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ) 4۔

ہوسکتا ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کا تسلسل ہو ۔ آپ (علیہ السلام) نے انہیں اس نجات ، کامیابی اور نعمات فراوان پر شکر گزاری کی دعوت دی اور ان سے نعمت میں اضافے کا وعدہ کیا اور کفران کی صورت میں عذاب کی تہدید کی اور یہ ممکن ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہو اور مسلمانوں سے خطاب ہو لیکن بہر حال نتیجے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگر بنی اسرائیل کو خطاب ہو پھر بھی قرآن مجید میں ہمارے لئے ایک اصلاحی درس کے طور پر آیا ہے ۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ شکر کے بارے میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے ”لا زید نکم“ (یقیناً میں اپنی نعمت تم پر زیادہ کر دوں گا)۔

جب کہ کفران نعمت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ تمہیں عذاب کروں گا بلکہ ارشاد ہوتا ہے: ”میرا عذاب شدید ہے“ تعبیر کا یہ فرق پروردگار کا انتہائی لطف و کرم ہے۔

.....

- ۱۔ حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے ظاہر ہونے والے معجزات کی طرف زیر نظر آیت میں لفظ ”آیات“ کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ کے مطابق وہ تو اہم معجزات تھے جن کی تفصیل اس آیت کے ضمن میں آنے لگی (انشاء اللہ)۔
- 2۔ مفردات راغب، تفسیر المنار (جلد ۱ ص ۳۰۸ اور تفسیر ابو الفتوح رازی کی جلد ۷ ص ۷ کی طرف رجوع کریں۔
- 3۔ توجہ رہے کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس آیت کی نظیر سورہ بقرہ کی آیت ۴۹ میں بھی ہے۔
- 4۔ تاڈن باب تفعل سے ہے اور تاکید سے اعلان کرنے کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے افعال کا مادہ ”ایڈان“ اعلان کے معنی میں ہے اور جب تفعل کے معنی میں آئے تو اس سے اضافہ اور تاکید کا استفادہ ہوتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ایام اللہ کی یاد آوری

۱۔ ایام اللہ کی یاد آوری: جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ”اللہ“ کی طرف ”ایام“ کی اضافت انسانوں کی زندگی کے اہم اور تقدیر ساز دنوں کی طرف اشارہ ہے اور ان دنوں کی عظمت کی بناء پر انہیں خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ نیز اس بناء پر کہ اگر ایک عظیم نعمت الہی کسی لائق قوم کے شامل حال ہو۔ یا عظیم عذاب الہی کسی سرکش و طغیان گر قوم کو دمن گیر ہو تو دونوں صورتوں میں تذکرہ کرو یا د و آوری کے لائق ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام سے منقوم روایات میں ”ایام اللہ“ کی تفسیر مختلف دنوں سے کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

ایام اللہ، یوم یقوم القائم (علیہ السلام) و یوم الکرة و یوم القیامة

ایام اللہ مہدی موعود (علیہ السلام) کے قیام کا دن، روز رجعت اور قیامت ہیں۔ 1

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے:

”ایام اللہ“ تین دن ہیں قیام مہدی (علیہ السلام) کا دن، موت کا دن اور قیامت کا دن۔ 2

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے:

ایام اللہ نعمائہ و بلائہ و ببلانہ سبحانہ

ایام اللہ اس کی نعمتوں اور اس کی طرف مصائب کے ذریعے آزمائشوں کے دن ہیں۔ 3

جیسا کہ ہم نے با ربا کہا ہے کہ اس قسم کی احادیث کبھی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ مفہوم انہی میں منحصر ہے بلکہ ان میں بعض مصادیق کے بعض حصوں کا بیان ہے۔

بہر حال عظیم دنوں کی یاد آوری (چاہے وہ کامیابی کے دن ہو یا سختی کے) ملتوں کی بیداری اور ہوشیاری میں بہت مؤثر ہوتی ہے۔ اسی آسمانی پیام سے ہدایت لیتے ہوئے ہم تاریخ اسلام کے عظیم دنوں کی یاد زندہ و جاودا رکھتے ہیں اور ان یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ہر سال ہم نے کچھ دنوں کو مخصوص کیا ہوا ہے، ان دنوں میں ہم اپنے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور اس سے ہم درس لیتے ہیں، ایسے درس کہ جو ہمارے آج کے لئے بہت زیادہ مؤثر ہیں۔

نیز ہماری موجودہ تاریخ خصوصاً انقلاب اسلامی ایران کی پر شکوہ تاریخ میں بہت دن ایسے ہیں جو ”ایام اللہ“ کے مصادیق ہیں۔ ہر سال ہمیں ان کی یاد زندہ رکھنا چاہئے ایسی یاد کہ جس میں شہیدوں، غازیوں، مجاہدوں اور عظیم دلاوروں کی یاد رچی بسی ہو اور پھر ان سے ہدایت لینا چاہئے۔

لہذا ان عظیم دنوں کا ذکر ہمارے مدارس کی درسی کتب میں ہونا چاہئے اور ان کی یاد ہماری اولاد کی تعلیم و تربیت کا حصہ ہونا چاہئے اور ہمیں آئندہ نسلوں کے بارے میں ”ذکر ہم“ (انہیں یاد دلاؤ) کی ذمہ داری پوری کرنا چاہئے۔ قرآن مجید میں بھی بار بار ”ایام اللہ“ کی یاد دہانی کر وائی گئی ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں بھی او مسلمانوں کے بارے میں بھی نعمتوں اور سختیوں کے دنوں کو یاد رکھا گیا ہے۔

۲۔ جابروں کے طور طریقے

۲۔ جابروں کے طور طریقے : ہم نے بار بار قرآنی آیات میں پڑھا ہے کہ فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ یہ کام صرف فرعون اور فرعون بنی نہیں کرتے تھے بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر استعمار گر کا یہی شیوہ اور طریقہ تھا کہ وہ فعال جنگجو اور پر عزم قوتوں کا ایک حصہ نابود کر دیتے اور دوسرے کو کمزور کر کے اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے استعماری اور استثماری کام کاری نہیں رکھ سکتے تھے۔

لیکن اہم بات یہ کہ سمجھیں کہ ایسی قوتیں کبھی تو فرعونوں کی طرح لڑکوں کو نابود ہی کر دیتی ہیں اور کبھی منشیات ، شراب اور بدکاری جیسی بری عادتوں میں غرق کر کے فعال قوتوں کو ناکارہ بنا دیتی ہیں اور انہیں زندہ نما مردہ بنا دیتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس پر مسلمانوں کو گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ان کی نسل، نو ایسے کاموں پر پڑ گئی اور اپنی ایمانی جسمانی قوت گنوا بیٹھی تو پھر انہی جان لینا چاہیے کہ ان کے لئے غلامی یقینی ہے۔

سب سے بڑی نعمت آزادی ہے

۳۔ سب سے بڑی نعمت آزادی ہے : یہ امر جاذب نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں ”ایام اللہ“ کے ذکر کے بعد صرف ایک دن کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دن کہ جو فرعونوں کے جنگل سے بنی اسرائیل کی نجات کا دن ہے (اذانجکم من ایل فرعون) حالانکہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اور بھی بہت سے عظیم دن تھے کہ جن میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی ہدایت کے زیر سایہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم نعمتیں بخشی تھیں لیکن زیر بحث آیات میں ”یوم نجات“ کا ذکر قوموں کی سر نوشت میں آزادی اور استقلال کی انتہائی اہمیت کی دلیل ہے۔

جی ہاں ! جب تک کوئی قوم وابستگی سے نجات حاصل نہ کرے ، غلامی اور استعمار کے جنگل سے آزاد ہو اس کی صلاحیتیں استعداد اور کمال ظاہر نہیں ہو سکتا اور وہ اللہ کی راہ میں قدم نہیں رکھ سکتی وہ راہ کہ شرک ، ظلم اور بیدار کے خلاف قیام کا راستہ ہے۔

اسی بناء پر عظیم الہی رہبروں کا پہلا کام یہی تھا کہ وہ قوموں کو فکری ، ثقافتی ، سیاسی اور اقتصادی غلامی سے آزاد کروائیں اور اس کے بعد کوئی اور کام کریں اور توحید و انسانیت کے پروگراموں کو عملی شکل دیں۔

۴۔ شکر نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ

۴۔ شکر نعمت اور کفرانِ نعمت کا نتیجہ : اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتوں پر ہمارے تشکر کا محتاج نہیں اور اگر وہ شکر گزاری کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی ہم پر ایک اور نعمت کا موجب ہے اور ایک اعلیٰ درجے کا تربیتی انداز ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ شکر کی حقیقت کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس کا نعمت کی زیادتی سے کیا تعلق ہے اور رکس طرح وہ خود ایک عاملِ تربیت ہو سکتا ہے۔

شکر کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبانی شکر کیا جائے یا ”الحمد للہ“ وغیرہ کہا جائے بلکہ شکر کے تین مراحل ہیں : پہلا مرحلہ یہ ہے کہ سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ نعمت عطا کرنے والا کون ہے یہ توجہ ، ایمان اور آگاہی شکر کا پہلا ستون ہے۔

دوسرا مرحلہ اس سے بھی بالاتر ہے اور وہ عمل کا مرحلہ ہے یعنی عملی شکر یہ ہے یعنی ہم پوری طرح سے غور کریں کہ ہر نعمت ہمیں کس مقصد کے لئے دی گئی ہے اور اسے ہم اس کے اپنے مقام پر صرف کریں اور اگر ایسا نہ کیا تو پھر ہم نے کفرانِ نعمت کیا۔ جیسا کہ بزرگوں نے فرمایا ہے :

الشکر صرف العبد جمیع ما انعمہ اللہ تعالیٰ فیما خلق لاجلہ

شکر یہ ہے کہ بندہ ہر نعمت کو اس کے مصرف ہی میں صرف کرے۔

واقعاً خدا نے ہمیں آنکھیں دی ہیں ، اس نے ہمیں دیکھنے اور سننے کی نعمت کیوں بخشی ہے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی مقصد تھا کہ ہم جہاں مینا سکی عظمت کو دیکھیں ، راہ حیات کو پہچانیں اور ان وسائل کے ذریعے تکامل و ارتقاء کی طرف قدم بڑھائیں اور ، ادراک ، حق کریں ، حمایتِ حق کریں ، اس کا دفاع کریں اور باطل کے خلاف جنگ کریں۔ اگر خدا کی ان عظیم نعمتوں کو ہم نے ان کے راستے میں صرف کیا تو ان کا عملی شکر ہے اور اگر یہ نعمتیں طغیان ، خود پرستی ، غرور ، غفلت اور خدا سے دوری کا ذریعہ بن گئیں تو یہ عین کفران ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

ادنی الشکر رؤیة النعمة من اللہ من غیر علة يتعلق القلب بها دون اللہ ، و الرضا بما اعطاه ، وان لا تعصیه بنعمة و تخالفه بشیء

من امره و نهيه بسبب من نعمته

کمترین شکر یہ ہے کہ تو نعمت کو خدا کی طرف سے سمجھے بغیر اس کے کہ تیرا اس نعمت میں مشغول رہے اور تو خدا کو بھول جائے اور (شکر) اس کی عطا پر راضی ہونا ہے اور یہ کہ تو اس کی نعمت کو اس کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے اور اس کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کے باوجود تو اس کے اوامر و نواہی کو روند نہ ڈالے۔ 4۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ طاقت، علم، قوت فکر و نظر، معاشرتی حیثیت، مال و ثروت اور تند رستی و سلامتی میں سے ہر ایک کے شکر کا راستہ کیا ہے اور کفران کی راہ کونسی ہے۔ تفسیر نور الثقلین میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث بھی اس تفسیر کے لئے ایک واضح دلیل ہے۔ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

شکر نعمۃ اجتناب المحارم

شکرانِ نعمت گناہوں سے بچنے کا نام ہے۔ 5۔

یہیں سے شکر اور نعمت میں اضافے کے درمیان تعلق واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جب بھی انسانوں نے نعمت الہی کو بالکل مقاصدِ نعمت کے تحت صرف کیا تو انہوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ وہ اہل ہیں اور یہ اہل بیت سے زیادہ سے زیادہ فیض اور فزون تر نعمت کا سبب بنی۔

اصولی طور پر شکر دو طرح کا ہے:

۱۔ شکر تکوینی اور

۲۔ شکر تشریحی

شکر تکوینی یہ ہے کہ ایک موجود خود کو حاصلِ نعمت کو اپنے رشد و نمو کے لئے استعمال کرے۔ مثلاً باغیاں دیکھتا ہے کہ باغ کے فلاں حصے میں درخت خوب پھل پھول رہے ہیں اور ان کی جتنی زیادہ خدمت کی جائے اتنے ہی زیادہ شگوفے پھوٹتے ہیں۔ یہی امر سبب بنتا ہے کہ باغیان باغ کے درختوں کے اس حصے کی خدمت پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور اپنے کارکنوں کو ان کی نگہبانی کی نصیحت کرتا ہے کیونکہ درخت زبان حال سے پکار رہے ہوتے ہیں کہ اے باغیان! ہم اس بات کے اہل ہیں کہ تو اپنی نعمت و احسان ہم پر زیادہ کرے۔ وہ بھی اس پکار کا مثبت جواب دیتا ہے۔

بسوزند چوب درختان بی بر سزا خود بمین است مر، بی بری را

بے ثمر درختوں کی لکڑیاں جلیں کیونکہ بے ثمری کی ہی سزا ہے۔

جہاں شکر کی بھی یہی حالت ہے فرق یہ ہے کہ درخت میں خود اختیاری نہیں ہے اور وہ فقط تکوینی قوانین کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں لیکن انسان اپنے ارادہ و اختیار کی طاقت سے اور تشریحی تعلیم و تربیت سے استفادہ کرتے ہوئے اس راہ پر استفادہ کرتے ہوئے اس راہ پر آگاہی سے قدم رکھ سکتے ہیں۔ لہذا وہ شخص کہ جو طاقت کی نعمت کو ظلم و سرکشی کا وسیلہ بنایا ہے گویا زبان حال سے پکار رہا ہوتا ہے کہ خداوند! میں اس نعمت کے لائق نہیں اور جو شخص اپنی صلاحیت کو حق و عدالت کی راہ میں کام میں لاتا ہے وہ گویا زبان حال سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ پروردگار! میں اس لائق ہوں، لہذا اضافہ فرما۔

یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ جس وقت ہم شکر الہی بجالاتے ہیں، چاہے وہ فکر و نظر سے ہو، چاہے زبان سے اور چاہے عمل سے، شکر کی یہ توانائی خود ہر مرحلے میں ایک نئی نعمت ہے اور اس طرح سے شکر کرنا ہمیں اس کی نئی نعمتوں کا مرہون منت قرار دیتا ہے اور یوں یہ ہر گز ہمارے بس میں نہیں کہ اس کے شکر کا حق ادا کر سکیں۔ جیسا کہ امام سجاد علیہ السلام کی پندرہ مناجاتوں میں سے مناجات شاکرین میں ہے:

کیف لی بتحصیل الشکر و شکر کی ایسا یفتقر الی شکر، فکلمات قلت لک الحمد و جب علی لذلک ان اقول لک الحمد میں تیرے شکر کا حق کیسے ادا کر سکتا ہوں کہ جب یہ شکر ایک اور شکر کا محتاج ہے اور جب میں ”لک الحمد“ کہتا ہوں تو مجھ پر لازم ہے کہ اس شکر گزاری کی توفیق پر کہوں: ”لک الحمد“

لہذا انسان کے لئے مرحلہ شکر کا افضل ترین مقام یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی نعمتوں پر شکر سے عاجزی کا اظہار کرے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: فیما وحی اللہ عز وجل الی موسیٰ اشکر نی حق شکر ی فقال یا رب و کیف اشکرک حق شکرک و لیس من شکر اشکرک بہ الا و انت انعمت بہ علی قال یاموسیٰ الان شکر تنی حین علمت ان ذلک منی۔

خدا نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ میرا حق شکر ادا کرو تو انہوں نے عرض کیا: پروردگار! میں تیرا حق شکر کس

طرح ادا کروں جب کہ میں جب بھی تیرا شکر بجا لاتا ہوں تو یہ توفیق بھی خود میرے لئے ایک نعمت ہوگی۔  
 اللہ نے فرمایا: اب تونے میرا حق شکر ادا کیا جب کہ تونے جانا کہ حتیٰ یہ توفیق بھی میری طرف سے ہے۔ 6  
 بندہ ہمان نہ کہ زتقصیر خویش عذر بہ درگاہ خدا آورد  
 ورنہ سزا وار خد اوند پیش کس نتواندکہ بجا آورد  
 اچھا بندہ وہی ہے کہ جو اپنی کوتاہیوں کا عذر بار گاہ الہی میں پیش کردے ورنہ اس کی خدانہی کاحق کوئی بجا نہیں  
 لاسکتا ہے۔

- 1- تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۶۔
- 2- تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۶۔
- 3- تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۶۔
- 4- سفینة البحار جلد ۱ ص ۷۱۰۔
- 5- نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۲۹۔
- 6- اصول کافی جلد ۴ ص ۸۰ (باب الشکر)۔

شکر نعمت کے بارے میں چند اہم نکات

- ۱- حضرت علی (علیہ السلام) نہج البلاغہ میں اپنے حکمت آمیز کلمات میں فرماتے ہیں :  
 اذا وصلت الیکم اطراف النعم فلا تنفروا و اقصاها بقلبة الشکر  
 جس وقت نعمات الہی کا پہلا حصہ تم تک پہنچ جائے تو کوشش کرو کہ شکر کے ذریعے باقی حصے کو بھی اپنی طرف  
 جذب کرو نہ یہ کہ شکر گزاری میں کمی کر کے اسے اپنے آپ سے دور بھگا دو۔ 1  
 ۲- یہ بات بھی قابل توجہ ہے نعمتوں پر صرف خدا کی سپاس گزاری اور تشکر کافی نہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی شکر یہ ادا  
 کرنا چاہیے کہ جو اس نعمت کا ذریعہ بنے ہیں اور ان کی زحمات و مشقات کا حق بھی اس طریقے سے ادا کرنا چاہیے  
 اور اس طرح انہیں اس راہ میں خدمات کی تشویق دلانا چاہیے۔ ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے مروی  
 ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا :  
 جب روز قیامت ہوگا تو اپنے بعض بندوں سے فرمائے گا: کیا تم نے فلاں شخص کا شکر یہ ادا کیا ہے۔  
 تو وہ عرض کرے گا: پرور دگارا: میں نے تیرا شکر یہ ادا کیا ہے۔  
 اللہ فرمائے گا: چونکہ تو اس کا شکر بجا نہیں لایا تو گویا تونے شکر بھی ادا نہیں کیا۔  
 پھر امام (علیہ السلام) نے فرمایا:  
 اشکر کم اللہ اشکر کم للناس  
 تم میں سے خدا کا زیادہ شکر کرنے والے وہ ہیں جو لوگوں کا زیادہ شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ 2  
 ۳- خدا کی نعمتوں کی افزائش کہ جس کا شکر گزاروں سے وعدہ کیا گیا ہے صرف اس لئے نہیں ہے کہ انہیں نئی نئی مادی  
 نعمتیں بخشی جائیں بلکہ خود شکر گزاری کہ جو خدا کی طرف خاص توجہ اور اس کی ساحت مقدس سے نئے عشق کے  
 ساتھ ہو ایک عظیم روحانی نعمت ہے کہ جو انسانی نفوس کی تربیت اور انہیں فرامین الہی کی اطاعت کی طرف رغبت  
 دلانے کے لئے بہت مؤثر ہے۔ بلکہ شکر ذاتی طور پر زیادہ سے زیادہ معرفت الہی کا ذریعہ ہے۔ اسی بنائے پر علماء  
 عقائد علم کلام میں ”وجوب معرفت الہی“ کو ثابت کرنے کے لئے ”وجوب شکر۔ منعم“ کی دلیل پیش کرتے ہیں۔  
 ۴- معاشرے میں تحریک پیدا کرنے اور پیش رفت کے لئے روح شکر گزاری کا حیا بہت اہم کردار کرتا ہے۔ وہ لوگ کہ  
 جنہوں نے اپنے علم و دانش سے یا فدا کاری اور شہادت سے یا کسی دوسرے طریقے سے اجتماعی اہداف کی پیش رفت  
 کے لئے خدمت کی، ان کی قدر دانی اور ان کا تشکر معاشرے کو آگے بڑھانے کا بہت اہل عامل ہے۔  
 جس معاشرے میں تشکر اور قدر دانی کی روح مردہ ہو اس میں خدمت کے لئے لگاؤ اور گرم جوشی بہت کم ہوتی ہے۔ اس  
 کے برعکس جس معاشرے میں لوگوں کی زحمتوں اور خدمتوں کی زیادہ قدر دانی کی جاتی ہو وہاں نشاط و مسرت زیادہ  
 محسوس کی جاسکتی ہے اور ایسی قومیں زیادہ ترقی کرتی ہیں۔  
 اسی حقیقت کی طرف توجہ کے سبب ہمارے ہاں گزشتہ بزرگوں کی زحمتوں کی قدر دانی کے اظہار کے لئے ان کے  
 سوسالہ، ہزار سالہ روز ولادت وغیرہ کے موقع پر اور دیگر مناسب مواقع پر پر گرام منعقد کئے جاتے ہیں اور ان کی

خدمات کے تشکر اور سپاس گزاری سے لوگوں میں زیادہ سے زیادہ حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے -  
مثلاً ہمارے ملک میں ہر پابونے والے اسلامی انقلاب کو جو اڑھائی ہزار سالہ تاریک دور کا اختتام ہے اور ایک دور نو کا  
آغاز ہے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال اور ہر ماہ بلکہ ہر روز شہدائے انقلاب کی یاد تازہ کی جاتی ہے ، انہیں ہدیہ عقیدت  
وسلام پیش کیا جاتا ہے -

ان تمام لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے جو ان کی طرف منسوب ہے اور ان کی خدمات کو سراہا جاتا ہے تو یہ امر سبب بنتا ہے  
کہ دوسروں میں فدا کاری اور قربانی کا عشق پیدا ہو اور لوگوں میں فدا کاری کا سطح بلند تر ہو اور قرآن کی تعبیر کے  
مطابق اس نعمت کا تشکر اس میں اضافے کا باعث ہو اور ایک شہید کے خون سے ہزاروں شہداء پیدا ہو اور ”لازیدنکم“  
زندہ مصداق بن جائیں -

.....

1- نہج البلاغہ کلمات قصار شماره ۱۳۔

2- اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۸۱ حدیث ۳۰۔

### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 8- 10

۸۔ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنَّ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ.  
۹۔ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا أَعْيُنَهُمْ فِي  
أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ.  
۱۰۔ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِى اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفَرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا  
بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ -

ترجمہ

۸۔ موسیٰ نے (بنی اسرائیل سے) کہا: اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں تو (خدا کو کوئی نقصان نہیں  
پہنچے گا کیونکہ) خدا بے نیاز اور لائق ستائش ہے -

۹۔ کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی کہ جو تم سے پہلے تھے۔ قوم نوح، عاد، ثمود، اور وہ جو ان کے بعد تھے وہی  
کہ جن سے خدا کے علاوہ کوئی آگاہ نہیں ہے۔ ان کے پیغمبر ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے لیکن انہوں نے (تعجب  
اور استہزاء سے) اپنے منہ پر ہاتھ رکھا کہ ہم اس چیز کے کافر ہیں جس کے لئے تم مامور ہو اور جس کی طرف تم بلاتے  
ہو اس کے بارے میں ہمیں شک ہے -

۱۰۔ ان کے رسولوں نے کہا: کیا اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، وہ کہ  
جو تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے گناہ بخش دے اور تمہیں مقرر و وعدہ گاہ تک باقی رکھے۔ انہوں نے کہا: (ہم یہ  
باتیں نہیں سمجھتے ہم تو اتنی بات جانتے ہیں کہ) تم تو ہمارے جیسے انسان ہو اور تم چاہتے ہو کہ ہمارے آباء و اجداد جن  
کی پوجا کرتے تھے اس سے باز رکھو تم ہمارے لئے کوئی واضح دلیل لاؤ۔

تفسیر

کیا خدا کے بارے میں شک ہے؟

زیر نظر پہلی آیت شکر گزاری اور رکفران نعمت کی بحث کی تائید و تکمیل ہے اور یہ آیت حضرت موسیٰ بن عمران کی

زبانى گفتگو كے ضن ميں نقل ہوئى ۔ فرمايا گيا ہے : موسىٰ نے بنى اسرائيل كو ياد دہانى كر وائى كہ اگر تم روئے زمين كے تمام لوگ كافر ہ و جائیں ( اور خدا كى نعمت كاكفران كريں ) تو اسے كوئى نقصان نہيں پہنچا سكتے كيونكہ وہ بے نياز اور لائق ستائش ہے ۔ ( وَقَالَ مُوسَىٰ اِنْ تَكْفُرُوا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَعَنِيْ حَمِيْدًا ) ۔  
 در حقيقت شكر نعمت اور خدا پر ايمان تمہارے لئے نعمت ميں اضافے ، تمہارے تكامل و ارتقاء اور تمہارى عزت و افتخار كا سبب ہے ۔ ورنہ خدا تو ايسا بے نياز ہے كہ اگر پورى كائنات كافر ہو جائے تو اس كے دامن كبريا ئى پر كوئى گر دنہيں پڑسكتى كيونكہ وہ سب بے نياز ہے ۔ يہاں تك كہ وہ تشكر و ستائش كا محتاج بھى نہيں كيونكہ وہ ذاتى طور پر لائق حمد ہے ( حميد ) ۔

اگر اس كى ذات پاڪ مينياز و احتياج ہوتى تو وہ واجب الوجوب نہ ہوتا ۔ لہذا اس كے غنى ہونے كا مدہوم يہ ہے كہ تمام كمالات اس ميں جمع ہيں جو ايسابے وہ ذاتى طور پر تعريف كے لائق ہے كيونكہ ” حميد“ كامعنى اس كے سوا كچھ نہيں كہ وہ لائق حمد ہے ۔

اس كے بعد چند آيات ميں بعض گزشتہ اقوام كا انجام بيان كيا گيا ہے ۔ وہى اقوام كہ جنہوں نے نعماتِ الہى پر كفرانِ نعمت كا راستہ اختيار كيا او ربا ديان الہى كى دعوت پر ان كى مخالفت كى اور كفر كى راہ اپنائى ۔ ان آيات مينان كى منطق اور ان كے انجام كى تشريح كى گئى ہے تاكہ گزشتہ آيت كے مضمون پر تاكيد ہو جائے ارشاد ہوتا ہے : كيا تم تك ان لوگوں كى خبر نہيں پہنچى ہے كہ جو تم سے پہلے تھے ( اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ) ۔

ہو سكتا ہے كہ جملہ حضرت موسىٰ عليه السلام كى گفتگو كا آخرى حصہ ہو او ريہ بھى ممكن ہے كہ قرآن كى طرف سے مسلمانوں كو خطاب كى صورت ميں ايك مستقل بيان ہو ۔ بہر حال نتيجے كے لحاظ سے دونوں صورتوں ميں كوئى فرق نہيں ۔

اس كے بعد مزيد فرمايا گيا ہے : قوم نوح ، عاد اور ثمود جيسى قومين او روہ كہ جو ان كے بعد تھيں (قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ) ۔

وہى كہ جنہيں خدا كے علاوہ كوئى نہيں پہچانتا اور اس كے علاوہ كوئى ان كے حالات سے آگاہ نہيں ہے ( لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ) ۔

2

اس كے بعد كى سر گزشت كى وضاحت كرتے ہوئے فرماياگيا ہے : ان كے پيغمبر واضح دلائل كے ساتھ ان كى طرف آئے ليكن انہوں نے تعجب و انكار كى بناء پر اپنے منہ ہاتھ ركھ كر كہا كہ جن چيزوں كے لئے تم بھيجے گئے ہو ہم ان سے كفر كرتے ہيں ( جَاۤئْتُهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوا اُۤبْدِيَهُمْ فِىۡ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِہِ ) ۔ كيونكہ ” ہم ہر اس چيز كے بارے ميں شك ركھتے ہيں كہ جس كى طرف تمہيں دعوت ديتے ہو “ اور اس شك كے ہوتے ہوئے كس طرح ممكن ہے كہ ہم تمہارى دعوت قبول كر ليں ( وَاِنَّا لَفِىۡ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوۡنَا اِلَيْہِۭ مَرِيۡبٍ ) ۔

يہاں ايك سوال سامنے آتا ہے كہ انہوں نے پہلے انبياء كے بارے ميں كفر اور بے ايمانى كا اظہار كيا ليكن اس كے بعد انہوں نے كہا ہمیں شك ہے او رلفظ ” مريب “ كے ساتھ اپنى بات مكمل كى ، يہ دونوں چيزيں آپس ميں كيا مناسبت ركھتى ہيں ؟ ۔

اس كا جواب يہ ہے كہ تردد و شك كا اظہار در حقيقت عدم ايمان كى علت ہے كيونكہ ايمان كے لئے يقين كى ضرورت ہے اور شك اس ميں ركاوٹ ہے ۔

گزشتہ آيت ميں چونكہ مشركين اور كفار نے شك كو بنياد قرار ديتے ہوئے عدم ايمان كا اظہار كيا لہذا بعد والى آيت مينبلا فاصلہ مختصر سى عبارت ميں واضح دليل پيش كر كے ان كے شك كى نفى كى گئى ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : ان كے پيغمبروں نے ان سے كہا كہ كيا اس خدا كے وجود ميں شك كرتے ہو كہ جو آسمانوں اور زمين كا پيدا كرنے والا ہے ( قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِى اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ) ۔

” فاطر “ در اصل شگاف كرنے والے كے معنى ميں ہے ليكن يہاں پيدا كرنے والے كے لئے كنايہ كے طور پر استعمال ہوا ہے كہ جو ايك حساب شدہ پريگرام كے تحت كسى چيز كو پيدا كرتا ہے اور پھر اس كى حفاظت كرتا ہے كيونكہ اس كے وجود كى بر كت اور نور ہستى سے ظلمت عدم چھٹ جاتى ہے اور شگافتہ ہو جاتى ہے جيسے سپيدہ سحر ظلمت شب كا پر دہ چاك كر ديتا ہے اور جيسے كھجور كا خوشہ اپنے غلاف كو شگافتہ كر ديتا ہے اسى لئے عرب اسے ” فطر “ ( بر وز ” نثر “ ) كہتے ہيں ۔

يہ احتمال بھى ہے كہ ” فاطر “ جہاں كے ابتدائى مادہ كے ٹكڑے ميں شگاف كرنے كى طرف اشارہ ہو جيسا كہ جديد سائنس كہتى ہے كہ مادہ عالم مجموعى طور پر باہم پيو ستہ چيز تى كہ جو بعد ميں شگافتہ ہو كر مختلف كروں كى شكل ميں ظاہر ہوئى ۔

بہر حال قرآن دیگر اکثر مواقع کی طرح خدا کے وجود اور صفات کو ثابت کرنے کے لئے یہاں نظامِ عالم ہستی اور آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ذکر کرتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا شناسی کے مسئلے میں اس سے زیادہ زندہ اور زیادہ روشن کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ اس عجیب و غریب نظام کا ہر گوشہ اسرار سے معمور ہے کہ جو زبانِ حال سے پکا پکار کر کہتا ہے کہ سوائے ایک قادرِ حکیم اور عالمِ مطلق کے کوئی بھی ایسی قدرت پیش نہیں کر سکتا۔ اسی بناء پر جس قدر انسانی علم ترقی کر رہا ہے اتنے ہی اس نظام کے دلائل آشکار ہو رہے ہیں اور یہ امر ہمیشہ ہر لمحہ خدا سے نزدیک کرتا ہے۔

واقعاً قرآن کسی قدر عجائب و غرائب کا حامل ہے کہ جس خدا شناسی اور توحید کی بحث کو اسی ایک جملے میں استفہامِ انکاری کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ ”افی اللہ شک فاطر السموات والارض“

وہ جملہ کہ جس کے لئے تجزیہ و تعلق لاور وسیع بحث کے لئے ہزار ہا کتابیں بھی کافی نہیں ہیں۔ اس کے بعدمکرین کے لئے دوسرے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ اعتراض پیغمبرانِ الہی کی رسالت کے بارے میں ہے (کیونکہ انہیں توحید کے بارے میں بھی شک تھا اور دعوتِ پیغمبر کے بارے میں بھی)۔ یہ مسلم ہے کہ دانا و حکیم پر وردگار اپنے بندوں کو ہر گز رہبر کے بغیر نہیں رہنے دیتا بلکہ ”وہ انبیاء بھیج کر تمہیں دعوت دیتا ہے تاکہ تمہیں گناہوں اور آلوگیوں سے پاک کرے اور تمہارے گناہ بخش دے“ (يَدْعُوكُمْ لِيُعْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ)۔ اور اس کے علاوہ ”تمہیں معین زمانے تک باقی رکھے“ تاکہ تم اپنے کمال اور ارتقاء کی راہ طے کر سکو اور اس زندگی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو (وَيُوخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى)۔

در حقیقت دعوتِ انبیاء کے دو اہداف تھے۔ ایک گناہوں کی بخشش یعنی انسان کے جسم و روح اور زندگی کی پاکیزگی اور دوسرا مقررہ مدت تک زندگی کہی بقا۔ اور یہ دونوں دراصل ایک دوسرے کی علت و معلوم ہیں کیونکہ وہی معاشرہ باقی رہ سکتا ہے جو گناہ و ظلم سے پاک ہو۔

تاریخِ مینہت سے ایسے معاشرے تھے جو ظلم و ستم، ہوس بازی اور طرح طرح کے گناہوں کی بناء پر ”جواں مرگ“ کا شکار ہو گئے اور قرآن اصطلاح میں وہ ”اجل مسمی“ تک نہ پہنچ سکے۔

امام صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں ایک جامع اور جاذبِ نظر حدیث منقول ہے۔ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

من يموت بالذنوب اكثر مما يموت بالاجال، ومن يعيش بالاحسان اكثر ممن يعيش بالاعمال جو لوگ گناہوں کی وجہ سے مر جاتے ہیں ان کی تعداد طبعی موت مرنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے اور وجو نیکی کے باعث زندہ رہتے ہیں (اور طویل عمر پاتے ہیں) ان کی تعداد عام عمر کے ساتھ زندہ رہنے والوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ 4 امام صادق علیہ السلام ہی سے منقول ہے:

ان الرجل يذنب الذنب فيحرم صلوة الليل و ان العمل السيء اسرع في صاحبه من السكين في اللحم۔ بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے اور نیک اعمال سے مثلاً نماز تہجد سے محروم ہو جاتا ہے۔ (جان لو کہ) برا کام انسان کی تباہی و بربادی مینگوشت کے لئے چھری سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ 5

ضمناً آیت میں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ انبیاء پر ایمان لانا اور ان کے پروگراموں پر عمل کرنا ”اجل معلق“ کو روکتا ہے اور حیاتِ انسانی کو ”اجل مسمی“ تک جاری و ساری رکھتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کی ایک دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ انسان اپنے بدن کی توانائی کے مطابق اختتامِ عمر تک پہنچے اور دوسری ’اجل معلق‘ ہے مختلف عوامل یا ر کاوٹوں کی وجہ سے انسانی عمر کا راستے ہی مینختم ہو جا نا اور ایسا عام طور پر خود اس کے بغیر سوچے سمجھے کئے گئے اعمال کی وجہ سے اور طرح طرح کے گناہوں کے باعث ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم سورہ انعام کی آیہ ۲ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرم کفار نے اس حیاتِ بخش دعوت کو قبول نہ کی کہ جس میں واضح طور پر منطبق توحید موجود تھی۔ اور اپنے انبیاء کو ایسا جواب دیا کہ جس سے ان کی ہٹ دھرمی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کے آثار جھلکتے تھے۔ کہنے لگے:- تم تو ہم جیسے بشر ہو، اس کے علاوہ کچھ نہیں (قَالُوا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا)۔ علاوہ ازین ”تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روکو کہ جس کی ہمارے آباء اجداد پوجا کرتے تھے (ثُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْْبُدُوْنَ اَبَاؤُنَا)۔

بہر حال ان سب امور سے قطع نظر ”تم ہمارے لئے کوئی واضح دلیل لاؤ“ (فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ)۔ لیکن ہم نے بار بار کہا ہے (اور قرآن نے بھی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے) کہ انبیاء و رسل کا بشر ہونا نہ صرف ان کی نبوت میں مانع نہیں بلکہ ان کی نبوت کی تکمیل کرنے والا امر ہے اور جو لوگ اس امر کی و انبیاء کی نبوت کے انکار کی

دلیل سمجھتے تھے ان کا مقصد زیادہ تر بہانہ سازی تھا ۔

اسی طرح اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ عام طور پر آنے والی نسل کا علم گزشتگان سے زیادہ ہوتا ہے ان کا آباؤ اجداد کی راہ و رسم کا سہارا لینا ایک اندھے تعصب ، بے وقعت بے ہودگی اور خرافات کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا ۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ تقاضا کہ کوئی واضح دلیل پیش کریں ، اس بناء پر نہ تھا کہ انبیاء کے پاس کوئی واضح دلیل نہ تھی بلکہ ہم با رہا آیات قرآنی میں پڑھتے ہیں کہ بہانہ جو لوگ واضح دلائل اور ”سلطان مبین“ کا انکار کرتے تھے اور ہر وقت نئی دلیل اور کسی نئے معجزے کی فرمائش کرتے رہتے تھے تاکہ اپنے لئے فرار کی راہ پیدا کرسکیں ۔ بہر حال آئندہ آیات میں ہم پڑھیں گے کہ انبیاء ان کا جواب کس طرح دیتے تھے ۔

.....

۱۔ واضح ہے کہ ” ان تکفروا “ جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزاؤء محذوف ہے اور ” ان اللہ لغنی حمید“ اس پر دلالت کرتا ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا : ان تکفروا لا تضروا اللہ شیئی

2۔ جملہ ”لا یعلم الا اللہ“ ممکن ہے پہلے جملے پر معظوف ہو اور واو حذف ہو گئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جملے کے لئے جملہ وصفیہ کی شبیہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی قوموں کے کچھ حالات ہم تک پہنچے ہیں لیکن مسلم ہے کہ بیشتر حصہ ہم تک نہیں پہنچا کہ جس سے صرف خدا ہی آگاہ ہے ۔ گزشتہ اقوام کی تاریخ میں اس قدر اسرار، خصوصیات اور جزئیات تھیں کہ شاید وہ کچھ کہ جو ہم تک پہنچا ہے اس کے مقابلے میں جو نہیں پہنچا بہت ہی کم اور نا چیز ہے ۔

3۔ اس بارے میں کہ ” لیغفر لکم من ذنوبکم“ میں ”من“ کا کیا مفہوم ہے ، مفسرین میں اختلاف ہے ۔ بعض اسے تبعیض کے معنی میں لیتے ہیں یعنی ”تمہارے بعض گناہوں کو بخش دے گا“ ۔ لیکن اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے کہ ایمان لانا تمام گناہوں کی بخشش کا باعث ہے ، تو یہ احتمال بہت بعید معلو ہوتا ہے ۔ ( ”الاسلام یجب عما قبلہ“ اسلام ماقبل کے گناہ ساقط کردیتا ہے ) بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ ”من“ بدلیت کے معنی میں ہے ، اس کے مطابق اس جملے کا معنی یہ ہو گا : ”خدا تمہیں دعوت دیتا ہے کہ ایمان لانے کے بدلے تمہارے گناہ بخش دے“ ۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ”من“ زائدہ ہے اور تاکید کے لئے آیا ہے یعنی ”خدا تمہیں ایمان کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ تمہارے تمام گناہ بخش دے ۔ یہ آخری تفسیر تمام تفاسیر سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

4۔ سفینة البحار جلد ۱ ص ۴۸۸ ۔

5۔ سفینة البحار جلد ۱ ص ۴۸۸ ۔

سورہ ابراہیم / آیہ 11-12

۱۱۔ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَمَا كَانَ لَنَا اَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَىٰ اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۔

۱۲۔ وَمَا لَنَا اِلَّا نَتَّوَكَّلَ عَلَىٰ اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا اَدَّبْتُمُوْنَا وَعَلَىٰ اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۔

ترجمہ

۱۱۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا : یہ ٹھیک ہے کہ تم جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ( اور اسے اہل پاتا ہے ) نعمت عطا کرتا ہے ( اور اسے مقام رسالت پر فائز فرماتا ہے ) اور ہم حکم خدا کے بغیر ہر گز معجزہ نہیں لاسکتے ( اور ہم تمہاری دھمکیوں سے نہیں ڈرتے ) اور بالایمان افراد کی طرح صرف اللہ پر توکل کرنا چاہتے ہیں ۔

۱۲۔ ہم اللہ پر کیوں توکل نہ کریں جب کہ اس نے ہمیں ہماری ( سعادت کی ) راہوں کی طرف رہبری کی ہے اور ہم تمہاری ایذا سانیوں پر یقینا صبر کریں گے ( اور اپنی رسالت کی انجام دہی سے دستبردار نہیں ہوں گے ) اور توکل کرنے والوں کی صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیئے ۔

صرف اللہ پر توکل کرو

ان دو آیات میں انبیاء کے ہٹ دھرم دشمنوں کی بہانہ سازیوں کا جواب دیا گیا ہے کہ جن کا ذکر گزشتہ آیات میں کیا گیا تھا ۔ وہ کہ جو کہتے تھے کہ تم نوع بشر مینسے کیونہو، ان کے جواب میں پیغمبران گرامی نے کہا یقیناً ہم تمہی جیسے بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے اور اسے نعمت عطا کرتا ہے ( قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ) ۔

یعنی یہ امر فراموش نہ کرو کہ اگر بشر کی بجائے فرشتے کا انتکاب ہوتا تو اس کے پاس بھی اپنی طرف سے کچھ نہ ہوتا ۔ تمام نعمات کہ جن مینسے ایک رسالت و رہبری کی ہے ، خدا کی طرف سے ہیں ۔ تو جو ایسا مقام فرشتے کو دے سکتا ہے

وہ انسان کو بھی دے سکتا ہے -

واضح ہے کہ اللہ کی طرف سے ایسی نعمت کی عطا بلا وجہ نہیں ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ خدا کی مشیت اس کی حکمت سے ہم آہنگ ہے یعنی ہم جہاں بھی پڑھیں کہ ”خدا جسے چاہتا ہے“ تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ”خدا جسے چاہتا ہے اور اہل پاتا ہے“ یہ ٹھیک ہے کہ مقام رسالت بالآخر خدائی نعمت ہے لیکن اہلبیت (علیہ السلام) بھی ذات پیغمبر میں حتماً موجود ہوتی ہے -

اس کے بعد دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے تیسرے سوال کا جواب دیا گیا ہے گویا آباؤ اجداد کی سنت کو بطور دلیل پیش کرنا اس قدر کمزور اور بے بنیاد تھا کہ ہر عاقل انسان تھوڑے سے غور و فکر سے اس کی کمزوری کو جان لیتا ہے -  
علاوہ ازہم قرآن کی دیگر آیات میں اس کا جواب دیا جاچکا ہے -

بہر حال تیسرے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے : معجزات لانا ہمارا کام نہیں - ہم کوئی جادو گر نہیں کہ ایک طرف بیٹھ جائیں اور جو شخص بھی من پسند کے معجزے کی فرمائش کرے اسے پیش کرتے رہیں اور معجزہ بے ار زش کھیل کود ہو کر رہ جائے بلکہ ”ہم کوئی معجزہ حکم الہی کے بغیر نہیں لاسکتے“ ( وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ) -  
علاوہ ازیں ہر پیغمبر لوگوں کے تقاضا کے بغیر بھی اس قدر معجزہ پیش کر دیتا ہے جو کافی ہوتا کہ وہ ایک کی حقانیت کے اثبات کی سند ہو - اگر چہ ان کے دعوت کے مضامین اور انکا مکتب خود تنہا عظیم ترین معجزہ ہے لیکن بہانہ تراش عام طور پر ان باتو پر کان دھرتے اور ہر روز ایک نئی فرمائش کرتے ہیں اور پیغمبر اسے قبول نہ کریں تو شور و غوغا بر پا کر دیتے ہیں -

اس کے بعد اس بناء پر کہ ان کی دھمکیوں کا بھی قاطع جواب دیا جائے انبیاء اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے : ”تمام باایمان افراد کو صرف خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے“ وہی خدا کہ جس کی قدرت کے مقابلے میں تمام قدرتیں ناچیز اور حقیر ہیں ( وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ) -

پھر مسئلہ توکل کو ایک واضح استدلال کے ساتھ بیان کرتے : ہم اللہ پر توکل کیوں نہ کریں اور تمام مشکلات میں اس کی پناہ کیوں نہ لیں ، ہم ناچیز طاقتوں اور دھمکیوں سے کیوں ڈریں جب کہ اس نے ہماری ہدایت سعادت کی راہوں کی طرف کی ہے ( وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلًا ) -

اس نے جب کہ ہمیں سعادت کی راہوں کی طرف ہدایت ، کی افضل ترین نعمت عطا کی ہے تو یقیناً وہ ہر قسم کی جارحیت ، کارشکنی اور مشکل میں ہمیں اپنی حمایت کے زیر سایہ رکھے گا -

پھر وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتے : اب جب کہ ہمارا سہارا خدا ہے ایسا سہارا کہ جو ناقابل شکست ہے اور سب سے بلند ہے تو ”ہم یقینی طور پر تمہاری سب اذیتوں کے مقابلے میں پامردی اور صبر و شکیبائی دکھائیں گے“ (وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْنَا ) -

اور وہ اپنی بات یوں ختم کرتے: تمام توکل کرنے والوں کو صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے ( وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ) -

چند اہم نکات

۱- مومنین اور متوکلین

۱- مومنین اور متوکلین : زیر بحث پہلی آیت میں ہے کہ مومنین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے اور دوسری آیت میں ہے کہ متوکلین کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے - گویا دوسرا جملہ پہلے کی نسبت زیادہ وسعت کا حامل ہے یعنی مومنین کے لئے تو آسان ہے کیونکہ خدا پر ایمان ہو تو یہ ایمان اس کی قدرت ، حمایت اور اس پر توکل کے ایمان سے جدا نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ غیر مومنین اور سب لوگوں کے پاس خدا کے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے - کیونکہ جس کی طرف بھی نگاہ کریں اس کے پاس خود اپنی طرف سے تو کچھ بھی نہیں تمام نعمتیں ، طاقتیں اور عنایتیں اس کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہیں پس انہیں بھی اس کے آستان پر سر جھکا نا چاہیے اور اس سے طلب کرنا چاہیے - کیونکہ یہ توکل انہیں اللہ پر ایمان کی دعوت بھی دے گا -

۲- انبیاء اور معجزات

۲- انبیاء اور معجزات: زیر بحث آیات ایسے لوگوں کے لئے واضح جواب ہیں کہ جو انبیاء سے معجز کی نفی کرتے ہیں یا قرآن حکیم کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے معجزات کا انکار کرتے ہیں - یہ آیات ہمیں سمجھاتی ہیں کہ انبیاء یہ ہر گز نہیں کہتے تھے کہ ہم معجزہ نہیں لائیں گے بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم حکم خدا اور اذن الہی کے بغیر یہ کام نہیں کریں گے کیونکہ معجزہ اس کا کام ہے ، اس کے اختیار میں ہے اور جب وہ قرین مصلحت سمجھتا ہے

ہمیں معجزہ دیتا ہے ۔

۳۔ توکل کی حقیقت اور فلسفہ

۳۔ توکل کی حقیقت اور فلسفہ : ”توکل“ در اصل ”وکالت“ کے مادہ سے وکیل انتخاب کرنے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک اچھا وکیل وہی ہے جو کم از کم چار صفات کا حامل ہو:

۱۔ کافی علم و آگاہی ۔ ۲۔ امانت داری ۔ ۳۔ طاقت و قدرت ۔ ۴۔ ہمدردی

شاید یہ امر بھی یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ مضتد کاموں کے لئے ایک مدافع کا انتخاب اس موقع پر ہوتا ہے کہاں انسان ذاتی طور پر دفاع پر قادر نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس موقع پر دوسری قوت سے استفادہ کرتا ہے اور اس کی طاقت و صلاحیت سے اپنی مشکل حل کرتا ہے ۔

لہذا خدا پر توکل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہیں کہ انسان زندگی کی مشکلات و حوادث ، مخالفین کی دشمنیوں اور سختیوں ، پیچیدگیوں اور کبھی اہداف کے راستے میں حائل رکاوٹوں میں جب خود انہیں دور کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے پنا وکیل قرار دے اور اس پر بھروسہ کرے اور خود بھی ہمت و کوشش سے باز نہ رہے بلکہ جہاں کسی کام کو خود انجام دینے کی طاقت رکھتا ہو وہاں بھی مؤثر حقیقی خدا ہی کو جانے کیونکہ ایک موحد کی چشم بصیرت کے دریچے سے دیکھا جائے تو تمام قدرتوں اور قوتوں کا سرچشمہ وہی ہے ۔

”توکل علی اللہ“ کا نقطہ مقابل یہ ہے کہ اس کے غیر پر بھروسہ کیا جائے ۔ یعنی کسی غیر پر تکیہ کر کے جینا ، دوسرے سے وابستہ ہونا اور اپنی ذات میں استقلال و اعتماد سے عاری ہونا ۔

علماء اخلاق کہتے ہیں کہ خدا کی توحید افعالی کا ثمرہ مستقیم توکل ہے کیونکہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ ایک موحد کی نظر میں ہر حرکت ، ہر کوشش ، ہر جنبش اور عالم میں صورت پذیر ہونے والی ہر چیز آخر کار اس جہاں کی پہلی علت یعنی ذاتِ پاک خدا سے ارتباط رکھتی ہے ۔ لہذا ایک مؤحد کی نگاہ میں تمام طاقتیں اور کامیابیاں اسی کی طرف سے ہیں ۔

توکل کا فلسفہ

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ :  
اولاً: توکل علی اللہ زندگی کے سخت حوادث و مشکلات میں اس ناقابلِ فنا منبعِ قدرت پر توکل انسان کی استقامت و مقاومت کا سبب بنتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے میدان احد میں سخت ضرب لگائی اور دشمن میدان چھوڑنے کے بعد راستے میں سے پلٹ آئے تاکہ مسلمانوں پر آخری ضرب لگائیں اور یہ خبر مسلمانوں کو پہنچی تو قرآن کہتا ہے کہ صاحب ایمان افراد اس خطر ناک لمحے میں وحشت زدہ ہوئے جب کہ وہ اپنی فعال قوت کا ایک اہم حصہ کھو چکے تھے بلکہ ”توکل“ اور قوتِ ایمانی نے ان کی استقامت کے نمونے متعدد آیات میں نظر آئے ہیں ۔ ان میں سے آل عمران کی آیت ۱۲۲ میں قرآن کہتا ہے :

توکل علی اللہ نے مجاہدین کے دو گروہوں کو میدانِ جہاد میں سستی سے بچا یا ۔

سورہ ابراہیم کی آیہ ۱۲ میں دشمن کے حملوں اور نقصانات کے مقابلے میں توکل اور صبر کا باہم ذکر ہوا ہے ۔

آل عمران کی آیہ ۱۵۹ میں اہم کاموں کی انجام دہی کے لئے پہلے مشورے کا ، پھر پختہ ارادے کا اور پھر توکل علی اللہ کا حکم دیا گیا ہے ۔

یہاں تک کہ قرآن کہتا ہے :

انہ لیس لہ سلطان علی الذین آمنوا وعلی ربہم یتوکلون

شیطان و سوسوں کا صرف وہ لوگ مقابلہ کر سکتے ہیں اور اس کے نفوذ سے بچ سکتے ہیں کہ جو ایمان اور توکل کے حامل ہوں ۔ (نحل۔ ۹۹)

ان آیات سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شدید مشکلات میں انسان ضعف اور کمزوری محسوس نہ کرے بلکہ اللہ کی بے پایاں قدرت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو کامیاب اور فاتح سمجھے ۔ گویا توکل امید آفرین ، قوت بخش ، تقویت پہنچانے والا اور استقامت میں اجافے کا سبب ہے ۔ توکل کا مفہوم اگر گوشہ نشینی اختیار کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا ہوتا تو مجاہدین اور اس قسم کے لوگوں میں تحریک پیدا کرنے کا باعث نہ بنتا ۔

اگر کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ عالم اسباب اور طبیعی عوامل کی طرف توجہ روحِ توکل سے مناسبت نہیں رکھتی تو وہ انتہائی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ طبیعی عوامل کے اثرات کو ارادہ الہی سے جدا کرنا ایک طرح کا شرک ہے ۔ کیا ایسا نہیں کہ عوامل طبیعی کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور سب کچھ اسی کے ارادے اور فرمان کے تحت ہے ۔ البتہ

اگر عوامل کو ایک مستقل طاقت سمجھا جائے اور انہیں اس کے ارادے کے مد مقابل قرار دیا جائے تو یہ وہ مقام ہے جو روح توکل سے مطابقت نہیں رکھتا۔

کیسے ممکن ہے کہ توکل کی ایسی تفسیر کی جائے حالانکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جو متوکلین کے سید و سردار ہیں اپنے اہداف کی پیش رفت کے لئے کسی موقع، صحیح منصوبہ، مثبت تکنیک اور مختلف ظاہری وسائل سے غفلت نہیں برتتے تھے۔

یہ سب چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ توکل کا وہ منفی مفہوم نہیں ہے۔

ثانیاً: توکل علی اللہ انسان کو ان وابستگیوں سے نجات دیتا ہے کہ جو ذلت و غلامی کا سرچشمہ ہیں اور اسے آزادی اور خود اعتمادی بخشتا ہے۔

”توکل“ اور ”قناعت“ ہم ریشہ ہیں اور فطرتاً دونوں کا فلسفہ بھی کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود ان میں فرق بھی ہے۔ یہاں ہم چند ایک اسلامی روایات پیش کرتے ہیں جن سے توکل کا حقیقی مفہوم اور اصلی بنیاد واضح ہو سکے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الغنی و العز یجولان فاذا ظفرا بمواضع التوکل او طنا

بے نیازی اور عزت محو جستجو رہتی ہیں جہاں توکل کو پالیتی ہیں وہیں ڈیرے ڈال دیتی ہیں اور اسی مقام کو اپنا وطن بنا لیتی ہیں۔ ۱

اس حدیث میں بے نیازی اور عزت کا اصلی وطن ”توکل“ بیان کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے منقول ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: میں نے وحی الہی کے قاصد جبرئیل سے پوچھا کہ توکل کی اہے تو اس نے کہا:

العلم بان المخلوق لا یضر ولا ینفع، ولا یعطى ولا ینعم، واستعمال البأس من الخلق فاذا کان العبد کذلک لم یعمل لا حد سوی اللہ فہذا هو التوکل۔

جب بندہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ مخلوق نقصان پہنچا سکتی ہے نہ فائدہ اور عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے اور وہ مخلوق کے ہاتھ سے آنکھ اٹھالیتا ہے تو پھر وہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے کام نہیں کرتا اور اس کے سوا کسی سے امید نہیں باندھتا تو یہ ہے حقیقتِ توکل۔ ۲

کسی نے حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا علیہ السلام سے پوچھا:

ماحد التوکل؟

تو آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

ان لاتخاف مع اللہ احداً (سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۶۸۲)۔

یہ کہ تو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے کسی سے نہ ڈرے۔ 3

.....

۱. اصول کافی، جلد ۲، باب ” حدیث ۳۔
۲. بحار الانوار، جلد ۱۵، حصہ ۲ ص ۱۴ چاپ قدیم
3. توکل کے بارے میں مزید وضاحت کے لئے کتاب ” انگیزہ پیدا نش. رجوع کریں۔

تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 13-17

۱۳ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ۔

۱۴۔ وَلَنُصَبِّحَنَّكُمْ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ۔

۱۵۔ وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيبٍ۔

۱۶۔ مِنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَى مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ۔

۱۷۔ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسَبِّغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ۔

ترجمہ

۱۳۔ جنہوں نے اپنے رسولوں سے کفر کیا انہوں نے کہا : یقیناً ہم تمہیں اپنی سر زمین سے نکال باہر کرینگے مگر یہ کہ ہمارے دین کی طرف لوٹ اؤ تو ایسے موقع پر ان کے پروردگار نے ان کی طرف وحی کی کہ میں ظالموں کو ہلاک کردوں گا۔

۱۴۔ اور تمہیں ان کے بعد زمین میں سکونت بخشوں گا یہ (کامیابی) اس کے لئے ہے کہ جو میرے مقام (عدالت) سے ڈرتا ہو اور میرے عذاب کا خوف رکھتا ہو۔

۱۵۔ انہوں نے (خدا سے) فتح و کامرانی کا تقاضا کیا اور ہر جبار، منحرف نا امید اور نا بود ہوا۔

۱۶۔ اس کے پیچھے جہنم ہو گی اور اسے متعفن پانی پلایا جائے گا۔

۱۷۔ وہ اسے بڑی مشکل سے گھونٹ گھونٹ کر کے پئے گا اور وہ اسے خوشی سے پینے کو تیار نہیں اور ہر جگہ سے موت اس کی طرف آنے لگی لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے عذاب شدید ہے۔

تفسیر

منحرف جابروں کا طرز عمل اور ان کا انجام

بے منطق افراد کا طریقہ ہے کہ جب وہ اپنی بات اور عقیدے میں کمزوری پر آگاہ ہوتے ہیں تو پھر دلیل کا راستہ چھوڑ کر طاقت اور ظلم کا سہارا لیتے ہیں۔ اس جگہ پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بت دھرم اور بہانہ ساز کافر قوموں نے جب انبیاء کی متین و رسا منطق کہ جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے، سنی تو انہوں نے اپنے انبیاء سے کہا : ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمہیں اپنی سر زمین سے نکال دیں گے مگر یہ کہ ہمارے دین (بت پرستی) کی طرف پلٹ اؤ

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مِلَّتِنَا﴾۔

یہ جاہل مغرور گویا ساری زمین کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور اپنے انبیاء کو ایک شہری کے حقوق ملنے کے بھی قائل نہیں تھے۔ اسی لئے کہتے تھے ”ارضنا“ (ہماری زمین) حالانکہ خدا نے زمین اور اس کی تمام نعمتیں صالح اور نیک لوگوں کے لئے پیدا کی ہیں اور یہ خود سر، جابر اور متکبر در حقیقت اس میں کوئی حق نہیں رکھتے چہ جائیکہ سب کچھ اپنا سمجھیں۔

ہوسکتا ہے ”لتعودن فی ملتنا“ (ہمارے دین کی طرف لوٹ اؤ) سے غلط فہمی پیدا ہو کہ انبیاء قبل رسالت بت پرستی کے مذہب پر تھے حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ قطع نظر اس کے کہ وہ معصوم تھے اور قبل رسالت بھی تھے ان کی عقل و درایت اس سے کہیں زیادہ تھی وہ ایسا احمقانہ کام کرتے پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ کرتے۔ ہو سکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ اعلان نبوت سے قبل انبیاء پر تبلیغ کی ذمہ داری نہ تھی شاید ان کی خاموشی کے سبب یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ وہ مشرکین کے ہم عقیدہ تھے۔

اس سے قطع نظر اگر چہ خطاب خود انبیاء کو ہے لیکن در حقیقت ان کے پیرو کاروں پر بھی محیط ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان کے پیرو کار پہلے مشرکین کے مذہب پر تھے اور مشرکین کی نظر صرف انہی پر ہے۔ نیز اصطلاح کے مطابق ”لتعودن“ عمومی تعبیر ہے اور باب تغلیب میں سے ہے (یعنی حکم اکثریت کو عمومیت پر محمول کرنا)۔ ۱۔ بعض دوسری قرآنی آیات کی طرف رجوع کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ ”عود“ جب ”فی“ کے ساتھ ہو تو بھی بازگشت کا معنی دیتا ہے (غور کیجئے گا)

قرآن مزید کہتا ہے کہ خداوند عالم ایسے مواقع پر پیغمبروں کی دلجوئی کرتا اور انہیں اطمینان دلاتا ”اور ان کی طرف وحی کرتا کہ میں یقیناً ظالموں کو ہلاک کروں گا“ ﴿فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهَلِكَنَّ الظَّالِمِينَ﴾۔

لہذا ان دھمکیوں سے ہر گز نہ ڈرو اور تمہارے انہی ارادے کی راہ میں ذرہ بر سستی بھی حائل نہیں ہونا چاہیئے۔ ظالم منکرین چونکہ انبیاء کو اپنے علاقے سے جلا وطن کر دینے کی دھمکی دیتے تھے تو خدا تعالیٰ اس کے مقابلے میں ان سے وعدہ کرتا ہے کہ ”ہم تمہیں اس علاقے میں ان کی نابودی اور تباہی کے بعد سکونت بخشیں گے“ ﴿وَلَنُصَبِّحَنَّكُمْ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾۔

لیکن یہ توفیق و کامیابی سب کو نصیب نہیں ہوتی ” یہ ان کے لئے ہے جو میرے مقام سے ڈریں اور احساسِ ذمہ داری کریں اور اسی طرح انحراف ، ظلم اور گناہ پر ہونے والی تہدیدِ عذاب سے ڈریں اور اسے سنجیدگی سے لیں “(ذَلِكْ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعَبَدَ)۔

لہذا عنایت اور نعمت اور لطف و کرم نہ حساب کتاب کے بغیر ہے اور نہ بلاوجہ بلکہ ایسے افراد کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو احساسِ ذمہ داری کے ساتھ پروردگار کے مقامِ عدل کے مقابلے میں نہ ظلم و ستم کرتے ہیں اور نہ دعوتِ حق کے جواب میں دشمنی کرتے ہیں۔

اور ایسے موقع پر کہ جب انتہا ہو گئی تھی اور وہ اپنی قوم کے سامنے اپنی ذمہ داری انجام دے چکے تھے، جنہیں ایمان لانا تھا لا چکے تھے اور باقی اپنے کفر پر ٹٹے ہوئے تھے اور مسلسل انبیاء و رسل کو دھمکیاں دے رہے تھے ”تو انہوں نے خدا سے فتح و کامرانی کا تقاضا کیا“ (وَاسْتَفْتَحُوا)۔ تو خدا نے بھی ان سچے مجاہدوں کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اس طرح سے کہ ”منحرف جابر نا امید ، زیاں کار اور نابود ہو گئے“ (وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ)۔

خاب ”خبیثہ“ (بر وزن ”غیبہ“) کے مادہ سے مطلوب ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے کہ جو تقریباً نامیدی کامفہوم دیتا ہے۔

”جبار“ یہاں متکبر اور سرکش کے معنی میں ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے اسے کوئی حکم دیا۔ اس نے نافرمانی کی اور فرمانِ پیغمبر پر عمل نہیں کیا تو آپ نے فرمایا :  
دعوها فانها جبارة

اسے چھوڑو و یہ سرکش عورت ہے۔ 2

لیکن لفظ ”جبار“ کبھی کبھی خدا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جس کا ایک اور معنی ہے اور وہ ہے ”محتاجِ اصلاح

موجود کی اصلاح کرنے والا“ یا ”وہ کہ جو ہر چیز پر مسلط ہے“۔ 3

لفظ ”عنید“ دراصل ”عند“ (بر وزن ”زند“) سے سمت کے معنی میں ہے۔ یہاں انحراف اور راہِ حق کے علاوہ کی طرف جھکاؤ کے معنی میں ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

كل جبار عنيد من ابى ان يقول لاله الا الله

جبارِ عنید وہ ہے کہ جو لالہ الا اللہ کہنے سے انکار کرے۔ (نور الثقلین جلد ص ۵۳۲)۔

ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے :

العنيد المعرض عن الحق

عنید وہ ہے جو حق سے ر وگردانی کرے۔ (نور الثقلین جلد ص ۵۳۲)۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ ”جبار“ صفتِ انسانی یعنی روحِ سرکشی کی طرف اشارہ ہے اور ”عنید“ افعالِ انسانی میں اس صفت کے اثر کی طرف اشارہ ہے کہ جو اسے حق سے منحرف کر دیتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے جہان میں ان جبارانِ عنید کے نتیجے عمل پر انہیں ملنے والی سزاؤں کے بارے میں دو آیات میں پانچ چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ پانچ چیزیں یہ ہیں :

۱) اس نامیدی اور خسران کے پیچھے یا ایسے شخص کے پیچھے جہنم اور جلانے والی آگ ہوگی (مِنْ وَرَائِهِ جَهَنَّمُ)۔ لفظ ”وراء“ اگرچہ پس پشت کے معنی میں (لفظ ”امام“ کے مقابلے میں) ہے لیکن ایسے مواقع پر نتیجہ اور انجام کار کے معنی میں ہے جیسا کہ فارسی میں بھی اس معنی میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اگر فلاں غذا کھاؤ تو اس کے پیچھے بیماری ہے یا اگر فلاں شخص سے دوستی کرو تو اس کے پیچھے بدبختی اور پشیمانی ہے یعنی اس کا نتیجہ اور معلول اسی طرح ہے۔

۲) اس جلانے والی آگ میں جب وہ پیا سا ہو گا تو ہم اسے آبِ ”صدید“ پلائیں گے (وَيُسْقَى مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ)۔

جیسا کہ علماء لغت نے کہا ہے کہ ”صدید“ ایک طرح کی میل کچیل کو کہتے ہیں کہ جو چمڑے اور گوشت کے درمیان جمع ہوجاتی ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ میل اور خون کی طرح بد دو دار متعفن اور بد رنگ پانی اسے پلا یا جائے گا۔

۳) یہ گنہگار، مجرم اور جبارِ عنید جب دیکھے گا کہ اسے پینے کے لئے ایسا پانی ملا ہے تو بڑی تکلیف کر کے مشکل سے اسے گھونٹ گھونٹ پئے گا اگرچہ ہرگز اسے پینا نہیں چاہے گا ”بلکہ ہم اس کے حلق میں یہ پانی ڈالیں گے“

يَنْجَرُّهُ وَلَا يَكَادُ يُسْبِغُهُ)۔ 4

۴) اسے اس قدر عذاب، تکلیف اور ناراحتی کا سامنا ہو گا کہ ”ہر طرف سے موت اس کی طرف آئے گی لیکن اس کے

باوجود وہ مرے گا نہیں، تاکہ اپنے اعمال کا انجام بھگتے گا (وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ)۔ اگرچہ ظاہراً یوں لگتا ہے کہ جو کچھ عذاب بیان کیا گیا ہے اس سے بڑھ کر نہیں ہو گا لیکن قرآن مزید کہتا ہے: اس کے پیچھے عذابِ شدید ہے (وَمَنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ)۔

اس طرح جس قدر شدید عذاب اور بر انجام فکر انسانی میں آسکتا ہے حتیٰ کہ جو کچھ نہیں آسکتا وہ ان خود غرض ظالموں اور بے ایمان و گنہگاروں جابروں کے انتظار میں ہے۔ ان کا بستر آگ ہے، ان کے پینے کے لئے متعفن اور نفرت آور پانی ہے اور ان کے لئے طرح طرح کا عذاب ہے اور اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں بلکہ زندہ رہیں گے اور اس کا مزہ چکھیں گے۔

یہ ہر گز تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس قسم کی سزائیں غیر عادلانہ ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں کے اعمال کا نتیجہ اور طبیعی اثر ہے بلکہ ان کے کام اس طرح دوسرے گھر میں مجسم ہوتے ہیں کہ جہاں عمل اپنی مناسب شکل میں مجسم ہو گا۔

اگر ہم اپنے زمانے کے بعض ظالموں کے اعمال اور جرائم پر نظر کریں کہ جن کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے یا ایسے گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا صحیح طور پر مطالعہ کریں تو بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ یہ سزا ان کے لئے بہت کم ہیں۔ 4۔ اسی تباہ کن جنگ ہی کو لیجئے کہ جس کا سامنا ہمیں اس وقت یہ بحث کرتے ہوئے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا ماحصل ایک ستم گر حکمران کی خود خوابی یا زیادہ صحیح الفاظ میں ایک پاگل جبار۔ عنید کی خود سری کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کے لئے کسی عاقلانہ مقصد کا تصور نہیں ہوسکتا۔ اس میں کیسے کیسے مظالم کئے گئے ہیں کہ جن کے ذکر سے زبان و قلم عاجز ہیں۔ ہم نے خود ملک کے مغربی اسپتالوں میں مجر وحینِ جنگ کو دیکھا ہے۔ معصوم بچوں سے لے کر بوڑھوں اور عورتوں تک زخی حالت میں دیکھا ہے ان میں سے بہت سے اپنی آنکھیں اور ہاتھ پاؤں کھو بیٹھتے ہیں اور واقعاً ان کی ایسی حالت ہے کہ ان پر ایک نظر کی جائے تو انسان ہل کر رہ جائے۔ تو غور کیجئے کہ جس وقت ایک ظالم اور ستم گر لاکھوں انسانوں کو مصائب میں اس طرح تڑپائے تو اس کے لئے کیسی سزا اور عذاب ہونا چاہیے۔

.....

- ۱۔ اس غلط فہمی کو کا ایک اور جواب بھی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ”عود“ کا مادہ اگر ”الی“ کے ساتھ متعدی ہو تو باز گشت اور لوٹنے کے معنی میں ہے اور اگر ”فی“ کے ساتھ متعدی ہو تو حالت کی تبدیلی کے معنی میں ہے اور باز گشت کا معنی نہیں دیتا۔ لہذا ”لتعودن فی ملتنا“ کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی حالت کو بدل دو اور اپنا دین چھوڑ کر ہمارے دین کو قبول کرلو۔ لیکن دیگر آیات مثلاً کما ارادوا ان یخرجوا منها اعدیٰ وا فیہا (سجدہ: ۲۰)
- 2۔ تفسیر فخر رازی، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔
- 3۔ مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۲۵۹ (اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں۔
- 4۔ ”یسیعہ“ ”اساعۃ“ کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے ”پینے کی چیز حلق میں ڈالنا“۔

چند اہم نکات

۱۔ مقام۔ پروردگار سے کیا مراد ہے؟

۱۔ مقام۔ پروردگار سے کیا مراد ہے؟ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ظالموں پر کامیابی اور ان کی نابودی کے بعد زمین پر حکومت ان افراد کا حصہ ہے کہ جو ”مقامِ الہی“ سے ڈریں۔ یہاں لفظ ”مقام“ سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مختلف احتمالات پیش کئے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تمام احتمالات صحیح ہوں آیت سے سب مراد ہوں:

الف: اس سے مراد محاسبہ کرتے وقت پروردگار کی حیثیت ہے۔ جیسا کہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے مثلاً

و اما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الہوی

مگر جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے ڈرتا رہا اور جی کو نا جائز خواہشوں سے روکتا رہا۔ (نازعات۔ ۴۰)

اور ول من خاف مقام ربہ جنتان

اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اس کے لئے دو باغ ہیں (رحمن۔ ۴۶)۔

ب: ”مقام“ ”قیام“ کے معنی میں ہے اور ”قیام“ نظارت و نگرانی کے معنی میں ہے یعنی جو اللہ کی طرف سے اپنے اعمال کی شدید نظارت سے ڈرتا ہے اور احساس مسئولیت کرتا ہے۔

ج: ”مقام“ اجرائے عدالت اور احقاق، حق کے لئے قیام کرنے کے معنی میں ہے یعنی جو پروردگار کی اس حیثیت سے

ڈرتے ہیں -

بہر حال جیسے کہ ہم نے کہا ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب معانی جمع ہوں - یعنی وہ لوگ کہ جو خدا کو اپنے اوپر ناظر و نگران سمجھتے ہیں اور اس کے حساب اور اجزائے عدالت سے ڈرتے ہیں اور ان کا یہ خوف اصلاحی ہے کہ جو انہیں ہر کام میں احساس ذمہ داری کی دعوت دیتا ہے اور انہیں ہر قسم کی نا انصافی ، ظلم اور گناہ سے روکتا ہے ، کامیابی اور روئے زمین پر حکومت آخر کار انہی کا حصہ ہے -

۲۔ ”استفتحوا“ کامفہوم

۲۔ ”استفتحوا“ کامفہوم : اس لفظ کی تفسیر کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے - بعض اسے فتح و کامرانی کے تقاضا کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے - اس کا شاید سورہ انفال کی آیہ ۱۹ میں ہے :

ان تستفتحوا فقد جائکم الفتح

اے مومنین ! اگر تم فتح و کامرانی کا تقاضا کرتے ہوئے تو یہ فتح و کامرانی تمہارے پاس آگئی ہے -

بعض قضاوت کا تقاضا کرنے کا معنی لیتے ہیں - یعنی انبیاء نے خدا سے تقاضا کیا کہ ان کے اور کافروں کے درمیان فیصلہ کرے - اس کا شاید سورہ اعراف کی آیہ ۸۹ ہے :

ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق و انت خیر الفاتحین

خداوند ! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے -

۳۔ ایک جابر حکمران اور قرآن کی یہ آیت

۳۔ ایک جابر حکمران اور قرآن کی یہ آیت : تواریخ اور تفسیر میں آیا ہے کہ ایک دن جابر حکمران ولید بن یزید عب الملک اموی نے اپنے مستقبل کے لئے قرآن سے فال نکالی - اتفاقاً ابتدائے صفحہ میں یہ آیت اس کے سامنے آگئی : ”واستفتحوا وخاب کل جبار عنید“ -

وہ بہت زیادہ پریشان ہوا - اسے سخت غصہ آیا - یہاں تک کہ اس لعین نے وہ قرآن جو اس کے ہاتھ میں تھا پارہ پارہ کر دیا پھر یہ اشعار پڑھے :

اتوعد کل جبار عنید ؟ فہا انا ذاک جبار عنید

اذا ماجئت ربک یوم حشر فقل یا رب مزقنی الولید

کیا تو ہے کہ جو ہر جبار عنید کو دھمکا تا ہے ؟

تویہ لے میں وہی جبار عنید ہوں

جب روز حشر اپنے پروردگار سے ملنا

تو کہہ دینا خداوند ! مجھے ولید نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا

زیادہ وقت نہ گزارا کہ یہ لعین اپنے دشمنوں کے ہاتھوں بدترین طریقے سے مارا گیا - انہوں نے اس کا سر کاٹ کر اسی کے محل کی چھت پر لٹکادیا اور پھر وہاں سے ہٹا کر شہر کے دروازے پر لٹکا دیا - (تفسیر قرطبی ص ۳۵۷۹) -

تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 18

۱۸۔ مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَأَيْقَدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ذَلِكُمْ هُوَ الصَّلَاةُ الْبَاطِلَةُ -

ترجمہ

جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان لوگوں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں کہ جنہیں ایک طوفانی دن میں نیز آندھی

کا سامنا کر پڑے تو ان میں یہ طاقت نہیں کہ جو انہوں نے انجام دیا ہے اسے اپنے ہاتھ میں لیں اور یہ بہت دور کی گمراہی ہے

تیز آندھی اور خاکستر

اس آیت میں ہے ایمان افراد کے اعمال کے لئے بہت رسا اور نہایت عمدہ مثال بیان کی گئی ہے یہ آیت کفار کے انجام کے بارے میں گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہے۔  
 ارشاد ہوتا ہے: جنہوں نے اپنے پروردگار سے کفر کیا ان کے اعمال اس خاکستری مانند ہیں جسے ایک طوفانی روز تیز آندھی کا سامنا کرنا پڑے (مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ)۔  
 جیسے کہ ایک طوفانی روز تیز آندھی کے سامنے راکھ اس طرح بکھر جاتی ہے کہ کوئی شخص اسے جمع نہیں کر سکتا اسی طرح منکرین حق کے بس میں نہیں کہ جو اعمال وہ انجام دے چکے ہیں انہیں اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ وہ سب تباہ و بر باد ہ جائیں گے اور ان کے ہاتھ خالی رہ جائیں گے (لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَى شَيْءٍ)۔ اور یہ بہت دور کی گمراہی ہے (ذَلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ)۔

چند اہم نکات

ان کے اعمال کو گرد و غبار کی مانند خاکستر سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے  
 ۱۔ بکھر جانے والی راکھ: اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان کے اعمال گرد و غبار کی مانند کوئی مفید نہیں ہیں انہیں خاکستر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی باقی ماندہ تھوڑی سی آگ ہے۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ہوسکتا ہے ان کے اعمال کا ظاہر ہو اور اندر سے کچھ نہ ہو۔  
 ایک چھوٹے سے برتن میں مٹی ہو تو ہو سکتا ہے اس میں ایک خوبصورت پھول آگے لیکن اگر بہت ساری خاکستر ہو تو وہ اس قدر فضول ہے کہ اس میں سے فضول قسم کی گھاس تک نہیں اُگتی۔  
 ۲۔ کافروں کے اعمال خاکستر کی مانند ہیں: کفار کے اعمال کو خاکستر کے ذرات میں کوئی پیوند یا جوڑ نہیں ہوتا یہاں تک کہ پائی کی مدد سے بھی انہیں ایک دوسرے سے نہیں جوڑا جا سکتا اور اس کا ہر ذرہ دوسرے سے تیزی سے لگ ہو جاتا ہے۔

گویا یہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ مومنین کے اعمال باہم متصل اور پیوستہ ہوتے ہیں، ان کا ہر عمل دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور توحید و وحدت کی روح نہ صرف مومنین کے درمیان موجود ہے بلکہ ایک صاحب ایمان فرد کے اعمال کے درمیان بھی موجود ہے لیکن بے ایمان افراد کے کاموں میں ایسا کوئی بہاؤ اور اتصال نہیں ہوتا۔  
 ۳۔ ایک طوفانی دن اور آندھی: تیز آندھی چلے تو راکھ بکھر جاتی ہے لیکن ”فی یوم عاصف“ (ایک طوفانی دن) کہہ کر مزید تاکید کی گئی ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے چلنے والی تیز ہوا راکھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر پھینک دے کہ جو زیادہ دور نہ ہو۔ لیکن اگر دن طوفانی ہو صبح سے شام تک آندھیاں چلیں اور ہر طرف سے طوفان ہوتو ظاہر ہے اس قسم کی راکھ اس طرح سے منتشر ہوگی کہ اس کا ہر ذرہ کہیں بہت دور جا پڑے گا۔ اس طرح سے کہ کسی کے بس میں نہ ہوگا کہ اسے جمع کر سکے۔

۴۔ پتوں اور راکھ کے بکھر جانے میں فرق ہے: اگر آندھی گھاس پھوس کے ڈھیر یا پتوں پر چلے اور انہیں مختلف جگہوں اور دور دراز کے مقامات پر بکھیر دے تو پھر بھی ایک اندازہ ہوسکتا ہے لیکن اگر راکھ کے چھوٹے چھوٹے ذرے بکھر جائیں تو وہ آنکھوں سے اس طرح محو ہو ں گے کہ گویا بالکل نابود ہو گئے ہیں۔

۵۔ تیز آندھی کے اثرات: نظام آفرینش میں ہوا بلکہ تیز آندھی کے بہت سے اصلاحی آثار ہیں اس کے تخریبی آثار استثنائی پہلو رکھتے ہیں۔ بہر حال اس کے مندرجہ ذیل آثار قابل توجہ ہیں:

الف: ہوا آندھی مختلف نباتات کے بیج مختلف جگہوں پر پھیلا دیتی ہے اور ایک باغبان اور کسان کی طرح سارے کرۂ ارض پر بیج بکھیر دیتی ہے۔

ب: بودوں کی تلقیح کرتی ہے اور نر کے بیج نباتات کے مادہ حصوں پر چھڑکتی ہے۔

ج: بادلوں کو سمندروں کی سطح سے ہانک کر خشک زمینوں کی طرف لے جاتی ہے۔

د: بلند پہاڑوں کو آہستہ آہستہ رگڑ کر نرم اور بار آور کر دیتی ہے۔

ر: قبطی منطقوں کا موسم منطقہ استوا کی طرف اور خط استواء کا موسم سرد علاقوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور کرۂ زمین میں حرارت کو اعتدال پر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

س: سمندر کے پانی میں موجیں پیدا کرتی ہے اور اسے زیر و زبر کرتی ہے اس طرح اس میں ہوا پہنچتی ہے جب کہ سمندر کا پانی کھڑا اور جامد رہے تو متعفن ہو جائے۔

اس طرح نباتات اور تمام زندہ موجودات ہوا کے چلنے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

لیکن خاکستر کم وزن، کھوکھلی اور سیاہ روہوتی ہے۔ اس میں کوئی زندہ موجود نہیں رہ سکتا، یہ سر سبز اور بار آور نہیں ہوتی۔ اس کے ذرات ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا ہوتے ہیں۔ جب یہ خاکستر ہوا کا سامنا کرتی ہے تو فوراً ہی منتشر ہو جاتی ہے اور اس کا بے خاصیت ظاہر بھی نظروں سے محو ہو جاتا ہے۔

۲۔ ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں؟

۲۔ ان کے اعمال کیوں کھوکھلے ہیں: یہ امر قابل غور ہے کہ بے ایمان افراد کے اعمال بے وقعت کیوں ہیں وہ اپنے اعمال سے کچھ حاصل کیوں نہیں کر پاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر توحیدی نگاہ سے دیکھا جائے اور اس کے معیاروں کے مطابق تحقیق کی جائے تو یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چیز کہ جو عمل سے شکل پذیر ہوتی ہے وہ نیت، ہدف اور طرز عمل ہے۔ اگر پر وگرام، ہدف اور مقصد صحیح ہو تو عمل بھی ایسا ہی ہوگا اور اگر کوئی اچھا عمل غلط مقصد اور بے وقعت ہدف کے لئے انجام دیا جائے تو وہ لا یعنی اور بے مفہوم ہو کر رہ جائے گا اور اس کی حیثیت تیز آندھی کے سامنے خاکستر کی سی ہو گی۔ غلط نہ ہو گا کہ اگر اس بحث کو ہم ایک زندہ مثال کے ذریعے واضح کریں۔

اس وقت حقوق انسانی کے نام پر مغربی دنیا میں اور بڑی طاقتوں کی طرف سے بعض کام کئے جاتے ہیں۔ انبیاء بھی حقوق انسانی کے تحفظ کا پر گرام لے کر آئے تھے لیکن دونوں کے ماحصل اور ثمرہ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ جہاں خوار طاقتیں جب حقوق انسانی کا دم بھر تی ہیں تو یقیناً ان کا مقصد انسانی اور اخلاقی نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد اپنے جرائم اور استعماری طو طریقوں پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے کچھ جاسوس کہیں قابو آجائیں تو وہ حقوق انسانی کے نام پر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن جب انہی کے ہاتھوں لاکھوں لاکھوں نامی خاک و خون میں غلطیاں ہوں یا ہمارے اسلامی ممالک میں وہ اپنے جرائم اور قباحتوں میں مصروف ہوں تو حقوق انسانی کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ انہوں نے تو حقوق انسانی جھوٹے اور ظالم حکمرانوں سے تعاون کی نذر کر رکھے ہیں۔

لیکن ایک سچے پیغمبر یا علی (علیہ السلام) جیسے وصیٰ پیغمبر کے نزدیک حقوق انسانی انسانوں کی حقیقی آزادی کا نام ہے۔ وہ انسانوں کی غلامی کے طوق اور زنجیر توڑنے کی جد جہد کرتے ہیں۔ جب وہ کسی مظلوم انسان کو دیکھتے ہیں تو تڑپ اٹھتے ہیں اور اس کی نجات کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

گویا جہاں خوار طاقتوں کا عمل خاکستر کی مانند ہے جسے تیز آندھی کا سامنا ہے اور انبیاء و اوصیاء کا عمل با برکت زمین کی طرح ہے جس سے طرح طرح کی پاکیزہ نباتات پیدا ہوتی ہیں اور پھل پھول اُگتے ہیں۔ یہیں سے مفسرین کی ایک بحث واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت میں اعمال سے کون سے اعمال مراد ہیں۔ کہنا چاہیے کہ ان کے سارے اعمال ہیں حتیٰ کہ ان کے وہ اعمال بھی جو ظاہراً اچھے لیکن باطناً شرک و بت پرستی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

۳۔ مسئلہ احباط

۳۔ مسئلہ احباط: جیسے ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں حبط اعمال یعنی برے اعمال یا کفر و ایمانی کی وجہ سے اچھے اعمال ختم ہو جانے کا مسئلہ علماء اسلام کے درمیان اختلافی ہے لیکن حق یہ ہے کہ بے ایما نی اور کفر پر اصرار اور ہٹ دھرمی نیز بعض اعمال مثلاً حسد، غیبت اور قتل نفس کی ایسی بری تاثیر ہے جو نیک اعمال اور حسنات کو بر باد کر دیتی ہے۔ زیر نظر آیت بھی حبط اعمال کے امکان پر ایک اور دلیل ہے۔

.....

(جلد ۲ تفسیر نمونہ صفحہ ۶۶ (اردو ترجمہ))

کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لئے بھی جزا ہے؟ مندرجہ بالا مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ اہم سوال

سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ علوم اور ایجاداتو انکشافات کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے سائنسدانوں نے طاقت فرساز حمتیں جھیلی ہیں اور بہ محرومیوں کو بر داشت کیا ہے تاکہ ایجاد اور انکشاف کرسکیں تاکہ اپنے ہم نوع لوگوں کے دوش سے بھاری بوجھ اتار سکیں مثلاً بجلی ایجاد کرنے والے اڈیسون نے اس قیمتی ایجاد کے لئے کیسی جانکاہ زحمتیں جھیلی ہیں۔

اس ایجاد کی برکت سے سر سبز کھیتوں کو ٹیوب ویل سے پانی ملا ہے ، درخت سر سبز ہوئے ہیں اور کھیت آباد ہوئے خلاصہ یہ کہ دنیا کاچہرہ ہی بدل گیا ہے ۔

اسی طرح پاسور ہے کہ جس نے جراثیم کو دریافت کرکے لاکھوں انسانوں کو موت کے خطرے سے نجات دلادی ہے ۔ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایسے سب افراد اس فرض کی بناء پر قعر جنہم میں گراجائیں کہ وہ ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن وہ افراد جنہوں نے عمر بھر انسانوں کی خدمت کا کوئی کام نہیں کیا ان کا مقام بہشت ہو۔ اس کا جواب یہ کہ :

اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط عمل کو دیکھنا کافی نہیں بلکہ عمل کی قدر و قیمت اس کے محرک ، سبب اور مقصد کے ساتھ بنتی ہے ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہسپتال ، سکول یا کوئی اور مفید عمارت تعمیر کرتے ہیں اور اظہار بھی یہ کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اس معاشرے کی انسانی خدمت ہے جس کے وہ مرہون منت ہیں حالانکہ اس پر دے کے پیچھے کوئی اور مطلب چھپا ہوتا ہے ۔ ان کا مقصد مقام و منصب ی امال و ثروت کا حصول ہوتا ہے یا وہ اپنے بچاؤ کے لئے ایسا کرتے ہیں یا وہ عوامل کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مادی مفادات کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں یا پھر وہ دوسروں کی نظر وں سے بچ کر خیانت کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن اس کے بر عکس ممکن ہے کوئی شخص پورے خلوص سے یا سوفی صدانسانی اور روحانی جذبہ سے کوئی چھوٹا سا کام انجام دے ۔

لہذا ضروری ہے کہ ”عظیم لوگوں“ کے عمل اور کردار کے محرک کی بھی تحقیق کی جائے ۔ اگر تحقیق کی جائے تو ان کا عمل یقیناً چند اشکال سے خارج نہیں ہے ۔

الف: کبھی کسی ایجاد کا حقیقی مقصد تخریب ہوتا ہے ( جیسے اٹامک نر جی کی دریافت پہلے پہل ایٹم بم بنانے کے لئے ہوئی ) ۔

پھر اس کے ساتھ نوع انسان کو کچھ فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں کہ جو دریافت یا ایجاد کرنے والوں کو حقیقی مقصد نہیں ہوتا یا پھر اسے ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ اس سے ایجادات کرنے والوں کی ذمہ داری پوری طرح واضح ہوجاتی ہے ۔

ب: کبھی ایجاد و انکشاف کرنے والے کا مقصد مادی فوائد یانام و نمود اور شہرت کا حصول ہوتا ہے ۔ ایسا شخص درحقیقت ایک تاجر کی طرح ہے کہ جو زیادہ آمدنی کے لئے زیادہ نفع بخش چیزیں بناتا ہے ۔ اس کی بنائی ہوئی چیزیں کچھ لوگوں کے لئے مفید ہوتی ہیں اور ملک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے جب کہ اس کا مقصد سوائے آمدنی کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور اگر کسی اور کام میں زیادہ آمدنی ہو تو وہ اسے شروع کردیتا ہے ۔ البتہ ایسی تجارت یاپیدا وار اگر شرعی قوانین کے مطابق ہو تو غلط اور حرام کام نہیں ہوگا لیکن کوئی مقدس عمل بھی شمار نہیں ہوگا ۔

ایسی ایجادیں اور دریافتیں تاریخ میں کم نہیں ہیں کہ جو اس قسم کے طرز فکر کی نشاندہی کرتی ہیں ۔ اگر یہ لوگ دیکھیں کہ ایسے کسی کام کی نسبت دوسرے راستے میں آمدنی زیادہ ہے اگر چہ وہ معاشرے کے لئے مضر ہو ( مثلاً دوا سازی کی صنعت میں ۲۰٪ منافع ہے اور بیروئن سازی میں ۵۰٪ ) تو یہ دوسرے کو ترجیح دیں گے ۔ ایسے لوگ نہ خد اسے کوئی مطالبہ رکھتے ہیں نہ اپنے ہم نوع انسانوں سے ۔ ان کا اجر وہی فائدہ اور شہرت ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جوانہوں نے پالیا ہے ۔

ج: ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کے محرکات اور اسباب یقیناً انسانی نہیں یا اگر وہ اللہ کے معتقد ہیں تو ان کے اہداف اور محرکات الہی ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی سالہا سال تجربہ گاہوں کے گوشے میں غربت و محرومی سے گزار دیتے ہیں ۔ اس امید پر کہ اپنی نوع کی کچھ خدمت کرسکیں اور جہان انسانیت کو کوئی بدیہ اور سوغات پیش کرسکیں ، کسی تکلیف زدہ کے پاؤں کی زنجیر کھول سکیں اور کسی رنجیدہ خاطر کے چہرے پر پریشانی کی پر چھائیاں دور کرسکیں ۔

ایسے افراد اگر ایمان اور الہی محرم رکھتے ہوں تو پھر ان کے بارے میں کوئی بحث نہیں اور اگر وہ ایمان اور الہی محرک نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرم انسانی اور لوگوں کی خدمت ہو تو اس میں شک نہیں کہ انہیں خد اوند۔ عالم کی طرف مناسبت اجر اور جزا ملے گی ۔ ہو سکتا ہے انہیں یہ جزا دنیا میں ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے جہان میں ملے یقیناً خدا وند عالم و عادل انہیں محروم نہیں کرے گا ۔ لیکن کسی طرح اور کس طرز پر ، اس کی تفصیلات ہم پر

واضح نہیں۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ”خدا اس قسم کے نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا“ ( البتہ اگر وہ ایمان قبول نہ کرنے میں جاہل قاصر ہو تو پھر مسئلہ بہت واضح ہے )۔

اس مسئلہ دلیل حکم عقلی کے علاوہ وہ اشارات ہیں جو آیات یا روایات میں آئے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ”ان اللہ یضیع اجر المحسنین“<sup>۱</sup>

کے مفہوم میں ایسے افراد شامل نہ ہوں۔ کیونکہ قرآن میں لفظ ”محسنین“ کا اطلاق صرف ”مومنین“ نہیں ہوا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کے پاس آئے تو انہیں پہچانے بغیر عزیز مصر سمجھتے ہوئے کہنے لگے :

انانراک من المحسنین

ہم تجھے نیکوں کا روم میں سے سمجھتے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ بھی فرمان الہی ہے :

فمن يعمل مثقال ذرة خیراً ومن يعمل مثقال ذرة شراً یرہ

جو شخص بھی ذرہ بھر اچھا کام کرے گا اسے دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ بھر برا کام کرے گا اسے دیکھے گا۔

ایک حدیث میں علی بن یقطین کی وساطت سے امام کاظم علیہ السلام سے مروی ہے :

بنی اسرائیل میں ایک صاحب ایمان تھا۔ اس کا ہمسایہ کافر تھا۔ کافر اپنے صاحب ایمان ہمسائے اچھا سلوک کرتا تھا۔ جب وہ دنیا سے گیا تو خدا نے اس کے لئے ایک گھر بنایا تاکہ جہنم کی آگ کی تپش سے رکاوٹ ہو اور اس سے کہا گیا کہ یہ

اپنے مومن ہمسائے سے تیرے نیک کے سلوک کے سبب سے ہے 2

عبد اللہ بن جدعان زمانہ جاہلیت کے مشہور مشرکین اور قریش کے سرداروں میں سے تھا۔ اس کے بارے میں پیغمبر

اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ سے منقول ہے :

اہل جہنم میں کمترین عذاب ابن جدعان کو ہو گا۔

لوگوں نے پوچھا : یارسول اللہ ! کیوں

آپ نے فرمایا:

انہ کان یطعم الطعام

کیونکہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ 3

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

یمن سے کچھ لوگ رسول اللہ سے بحث و تمحیص کے لئے آپ کی خدمت میں آئے ا۔ ان میں سے ایک شخص تھا جو زیادہ

باتیں کرتا تھا اور آپ سے بڑی سختی اور بٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ آنحضرت کو اتنا برا لگا کہ ناپسندیدگی کے

آثار آپ کے چہرہ مبارک پر پوری طرح ظاہر ہوئے۔ اس وقت جبرائیل آئے اور یہ پیام الہی آپ تک پہنچا یا کہ خدا فرماتا

ہے : یہ شخص سخی ہے۔ یہ بات سنتے ہیں رسول اللہ کا غصہ ختم ہو گیا۔ اس کی طرف رخ کر کے آپ نے فرمایا کہ

پروردگار نے مجھے اس قسم کا پیغام دیا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوت تو میں تجھ پر اس قسم کی سختی کرتا کہ تو

دوسروں کے لئے عبرت بن جاتا۔ اس شخص نے پوچھا : کیا آپ کے پروردگار کو سخاوت پسند ہے؟ فرمایا : ہاں۔ تو اس

نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے رسول اور فرستادہ ہیں اور اسی خدا کی

قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے آج تک میں نے کسی شخص کو اپنے ہاں سے محروم نہیں پلٹا یا۔ 4

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بعض آیات اور بہت سے روایات سے معلم ہوتا ہے کہ ایمان یا یہاں تک کہ ولایت قبول

اعمال یا جنت میں داخلے کی شرط ہے لہذا اگر بے ایمان افراد سے بہترین اعمال سرزد ہوں تو وہ بارگاہ الہی میں مقبول

نہیں ہوں گے۔

لیکن اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ ”قبولیت اعمال“ کا ایک مفہوم ہے اور مناسب اجر ملنا دوسرا مسئلہ ہے لہذا

علماء اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ مثلاً حضور قلب کے بغیر یا بعض گناہوں مثلاً غیبت سے نماز مقبول۔ بارگاہ خدا نہیں

ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسی نماز شرعاً صحیح ہے، فرمان الہی کی اطاعت ہے اور اسے ذمہ داری ادا ہوجاتی ہے اور

مسلم ہے کہ فرمان الہی کی اطاعت اجر و جزا کے بغیر نہیں ہوگی۔

لہذا عمل کی قبولیت دراصل عمل کا عالی مرتبہ ہوتا ہے۔ زیر بحث مسئلے میں بھی ہم یہی بات کہتے ہیں کہ اگر انسانوں

اور عوام کی خدمات ایمان کے ساتھ ہوں تو ان کا مذہب عالی ہوگا لیکن ایسا نہ ہو تو بھی بالکل بے معنی اور بغیر اجر کے

نہیں ہوں گی۔ جنت میں داخلے کے بارے میں بھی یہی جواب دیں گے کہ عمل کا اجر ضروری نہیں کہ جنت میں داخلے پر

منحصر ہو۔ (بحث کا نچور اور تفصیلی بحث مناسب ہے کہ اس مسئلے کی فقہی مباحث میں ہو)۔

- ۱۔ یوسف - ۹۰ اور بعض دیگر سورتیں -
- ۲۔ بحار الانوار جلد ص ۳۷۷ چاپ کمپانی۔
- ۳۔ بحار الانوار جلد ص ۳۷۷ چاپ کمپانی۔
- ۴۔ سفینة البحار جلد ۲ ص ۶۰۷۔

۴۔ کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لئے بھی جزا ہے ؟

۴۔ کیا ایجادات و انکشافات کرنے والوں کے لئے بھی جزا ہے ؟ مندرجہ بالا مباحث کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ علوم اور ایجاداتو انکشافات کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے سائنسدانوں نے طاقت فرساز حمتیں جھیلی ہیں اور بہ محرومیوں کو بر داشت کیا ہے تاکہ ایجاد اور انکشاف کرسکیں تاکہ اپنے ہم نوع لوگوں کے دوش سے بھاری بوجھ اتار سکیں مثلاً بجلی ایجاد کرنے والے اڈیسون نے اس قیمتی ایجاد کے لئے کیسی جانکاه زحمتیں جھیلی ہیں۔

اس ایجاد کی برکت سے سر سبز کھیتوں کو ٹیوب ویل سے پانی ملا ہے ، درخت سر سبز ہوئے ہیں اور کھیت آباد ہوئے خلاصہ یہ کہ دنیا کاجپرہ بی بدل گیا ہے ۔

اسی طرح پاسور ہے کہ جس نے جراثیم کو دریافت کرکے لاکھوں انسانوں کو موت کے خطرے سے نجات دلادی ہے ۔ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایسے سب افراد اس فرض کی بناء پر قعر جہنم میں گراجائیں کہ وہ ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن وہ افراد جنہوں نے عمر بھر انسانوں کی خدمت کا کوئی کام نہیں کیا ان کا مقام بہشت ہو۔ اس کا جواب یہ کہ :

اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط اسلام کے معاشرتی اصولوں کے لحاظ سے فقط عمل کو دیکھنا کافی نہیں بلکہ عمل کی قدر و قیمت اس کے محرک ، سبب اور مقصد کے ساتھ بنتی ہے ۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ ہسپتال ، سکول یا کوئی اور مفید عمارت تعمیر کرتے ہیں اور اظہار بھی یہ کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اس معاشرے کی انسانی خدمت ہے جس کے وہ مرہون منت ہیں حالانکہ اس پر دے کے پیچھے کوئی اور مطلب چھپا ہوتا ہے ۔ ان کا مقصد مقام و منصب ی امال و ثروت کا حصول ہوتا ہے یا وہ اپنے بچاؤ کے لئے ایسا کرتے ہیں یا وہ عوامل کی توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مادی مفادات کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں یا پھر وہ دوسروں کی نظر وں سے بچ کر خیانت کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن اس کے بر عکس ممکن ہے کوئی شخص پورے خلوص سے یا سوفی صدائسانی اور روحانی جذبہ سے کوئی چھوٹا سا کام انجام دے ۔

لہذا ضروری ہے کہ ”عظیم لوگوں“ کے عمل اور کردار کے محرک کی بھی تحقیق کی جائے ۔ اگر تحقیق کی جائے تو ان کا عمل یقیناً چند اشکال سے خارج نہیں ہے ۔

الف: کبھی کسی ایجاد کا حقیقی مقصد تخریب ہوتا ہے ( جیسے اٹامک نر جی کی دریافت پہلے پہل ایٹم بم بنانے کے لئے ہوئی ) ۔

پھر اس کے ساتھ نوع انسان کو کچھ فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں کہ جو دریافت یا ایجاد کرنے والوں کو حقیقی مقصد نہیں ہوتا یا پھر اسے ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ اس سے ایجادات کرنے والوں کی ذمہ داری پوری طرح واضح ہوجاتی ہے ۔

ب: کبھی ایجاد و انکشاف کرنے والے کا مقصد مادی فوائد پانام و نمود اور شہرت کا حصول ہوتا ہے ۔ ایسا شخص درحقیقت ایک تاجر کی طرح ہے کہ جو زیادہ آمدنی کے لئے زیادہ نفع بخش چیزیں بناتا ہے ۔ اس کی بنائی ہوئی چیزیں کچھ لوگوں کے لئے مفید ہوتی ہیں اور ملک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے جب کہ اس کا مقصد سوائے آمدنی کے کچھ بھی نہیں ہوتا اور اگر کسی اور کام میں زیادہ آمدنی ہو تو وہ اسے شروع کردیتا ہے ۔ البتہ ایسی تجارت یا پیداوار اگر شرعی قوانین کے مطابق ہو تو غلط اور حرام کام نہیں ہوگا لیکن کوئی مقدس عمل بھی شمار نہیں ہوگا ۔

ایسی ایجادیں اور دریافتیں تاریخ میں کم نہیں ہیں کہ جو اس قسم کے طرز فکر کی نشاندہی کرتی ہیں ۔ اگر یہ لوگ دیکھیں کہ ایسے کسی کام کی نسبت دوسرے راستے میں آمدنی زیادہ ہے اگر چہ وہ معاشرے کے لئے مضر ہو ( مثلاً دوا سازی کی صنعت میں ۲۰٪ منافع ہے اور بیروئن سازی میں ۵۰٪) تو یہ دوسرے کو ترجیح دیں گے ۔

ایسے لوگ نہ خد اسے کوئی مطالبہ رکھتے ہیں نہ اپنے ہم نوع انسانوں سے - ان کا اجر وہی فائدہ اور شہرت ہے جو وہ چاہتے ہیں اور جو انہوں نے پالیا ہے -

ج: ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کے محرکات اور اسباب یقیناً انسانی نہیں یا اگر وہ اللہ کے معتقد ہیں تو ان کے اہداف اور محرکات الہی ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی سالہا سال تجربہ گاہوں کے گوشے میں غربت و محرومی سے گزار دیتے ہیں - اس امید پر کہ اپنی نوع کی کچھ خدمت کرسکیں اور جہان۔ انسانیت کو کوئی ہدیہ اور سوغات پیش کرسکیں ، کسی تکلیف زدہ کے پاؤں کی زنجیر کھول سکیں اور کسی رنجیدہ خاطر کے چہرے پر پریشانی کی پر چھائیاں دور کرسکیں -

ایسے افراد اگر ایمان اور الہی محرم رکھتے ہوں تو پھر ان کے بارے میں کوئی بحث نہیں اور اگر وہ ایمان اور الہی محرک نہ رکھتے ہوں لیکن ان کا محرم انسانی اور لوگوں کی خدمت ہو تو اس میں شک نہیں کہ انہیں خد اوند۔ عالم کی طرف مناسبت اجر اور جزا ملے گی - ہو سکتا ہے کہ انہیں یہ جزا دنیا میں ملے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے جہان میں ملے یقیناً خدا وند عالم و عادل انہیں محروم نہیں کرے گا - لیکن کسی طرح اور کس طرز پر ، اس کی تفصیلات ہم پر واضح نہیں - بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ”خداسے قسم کے نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا“ ( البتہ اگر وہ ایمان قبول نہ کرنے میں جاہل قاصر ہو تو پھر مسئلہ بہت واضح ہے ) -

اس مسئلہ دلیل حکم عقلی کے علاوہ وہ اشارات ہیں جو آیات یا روایات میں آئے ہیں - ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ ” ان اللہ یضیع اجر المحسنین “ ۱

کے مفہوم میں ایسے افراد شامل نہ ہوں - کیونکہ قرآن میں لفظ ”محسنین“ کا اطلاق صرف ”مومنین“ نہیں ہوا - اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب ان کے پاس آئے تو انہیں پہچانے بغیر عزیز مصر سمجھتے ہوئے کہنے لگے :

انانراک من المحسنین

ہم تجھے نیکوں کاروں میں سے سمجھتے ہیں -

اس سے قطع نظر یہ بھی فرمان الہی ہے :

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ

جو شخص بھی ذرہ بھر اچھا کام کرے گا اسے دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ بھر برا کام کرے گا اسے دیکھے گا -

ایک حدیث میں علی بن یقطین کی وساطت سے امام کاظم علیہ السلام سے مروی ہے :

بنی اسرائیل میں ایک صاحب ایمان تھا - اس کا ہمسایہ کافر تھا - کافر اپنے صاحب ایمان ہمسائے اچھا سلوک کرتا تھا - جب وہ دنیا سے گیا تو خدا نے اس کے لئے ایک گھر بنایا تاکہ جہنم کی آگ کی تپش سے رکاوٹ ہو اور اس سے کہا گیا کہ یہ اپنے مومن ہمسائے سے تیرے نیک کے سلوک کے سبب سے ہے 2

عبد اللہ بن جدعان زمانہ جاہلیت کے مشہور مشرکین اور قریش کے سرداروں میں سے تھا - اس کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ سے منقول ہے :

اہل جہنم میں کمترین عذاب ابن۔ جدعان کو ہو گا -

لوگوں نے پوچھا : یا رسول اللہ ! کیوں آپ نے فرمایا:

انہ کان یطعم الطعام

کیونکہ وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا تھا - 3

ایک اور حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے :

یمن سے کچھ لوگ رسول اللہ سے بحث و تمحیص کے لئے آپ کی خدمت میں آئے ا - ان میں سے ایک شخص تھا جو زیادہ باتیں کرتا تھا اور آپ سے بڑی سختی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا تھا - آنحضرت کو اتنا برا لگا کہ ناپسندیدگی کے آثار آپ کے چہرہ مبارک پر پوری طرح ظاہر ہوئے - اس وقت جبرائیل آئے اور یہ پیام الہی آپ تک پہنچا یا کہ خدا فرماتا ہے : یہ شخص سخی ہے - یہ بات سنتے ہیں رسول اللہ کا غصہ ختم ہو گیا - اس کی طرف رخ کر کے آپ نے فرمایا کہ پروردگار نے مجھے اس قسم کا پیغام دیا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تجھ پر اس قسم کی سختی کرتا کہ تو دوسروں کے لئے عبرت بن جاتا - اس شخص نے پوچھا : کیا آپ کے پروردگار کو سخاوت پسند ہے ؟ فرمایا : ہاں - تو اس نے عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے رسول اور فرستادہ ہیں اور اسی خدا کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے آج تک میں نے کسی شخص کو اپنے ہاں سے محروم نہیں پلٹا یا - ۴

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بعض آیات اور بہت سے روایات سے معلم ہوتا ہے کہ ایمان یا یہاں تک کہ ولایت قبول۔ اعمال یا جنت میں داخلے کی شرط ہے لہذا اگر بے ایمان افراد سے بہترین اعمال سرزد ہوں تو وہ بارگاہ الہی میں مقبول نہیں ہوں گے۔

لیکن اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ ”قبولیت اعمال“ کا ایک مفہوم ہے اور مناسب اجر ملنا دوسرا مسئلہ ہے لہذا علماء اسلام کے درمیان مشہور ہے کہ مثلاً حضور قلب کے بغیر یا بعض گناہوں مثلاً غیبت سے نماز مقبول۔ بارگاہ خدا نہیں ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسی نماز شرعاً صحیح ہے، فرمان الہی کی اطاعت ہے اور اسے ذمہ داری ادا ہوجاتی ہے اور مسلم ہے کہ فرمان الہی کی اطاعت اجر و جزا کے بغیر نہیں ہوگی۔

لہذا عمل کی قبولیت دراصل عمل کا عالی مرتبہ ہوتا ہے۔ زیر بحث مسئلے میں بھی ہم یہی بات کہتے ہیں کہ اگر انسانوں اور عوام کی خدمات ایمان کے ساتھ ہوں تو ان کا مدہوم عالی ہوگا لیکن ایسا نہ ہو تو بھی بالکل بے معنی اور بغیر اجر کے نہیں ہوں گی۔ جنت میں داخلے کے بارے میں بھی یہی جواب دیں گے کہ عمل کا اجر ضروری نہیں کہ جنت میں داخلے پر منحصر ہو۔ (بحث کا نچور اور تفصیلی بحث مناسب ہے کہ اس مسئلے کی فقہی مباحث میں ہو)۔

.....

- ۱۔ یوسف - ۹۰ اور بعض دیگر سورتیں۔
- ۲۔ بحار الانوار جلد ص ۳۷۷ چاپ کمپانی۔
- ۳۔ بحار الانوار جلد ص ۳۷۷ چاپ کمپانی۔
- ۴۔ سفینة البحار جلد ۲ ص ۶۰۷۔

#### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 19-20

- ۱۹۔ اَلَمْ تَرَى اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنْ يَشَا يُدْهِكُم وَاَيَّاتِ بِخَلْقِ جَدِيْدٍ۔
- ۲۰۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلٰى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

ترجمہ

۱۹۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔

۲۰۔ اور یہ کام خدا کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔

تفسیر

خلقت حق کی اساس پر ہے

گزشتہ آیت میں باطل ک انکر ہے۔ وہ باطل کہ خاکستر کی طرح ہے۔ وہ خاکستر کہ جو پراگندہ ہے اور آندھی سے ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ زیر نظر پہلی آیت میں حق کے بارے میں گفتگو ہے۔ یہ حق کے استقرار سے متعلق ہے۔

روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے دنیا کے تمام طالبان حق کے لئے نومنے کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے ( اَلَمْ تَرَى اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ)۔

”حق“ جیسا کہ مفردات میں راغب نے کہا ہے دراصل ”مطابقت“ اور ہم آہنگی“ کے معنی میں ہے لیکن اس کے استعمال کے مواقع مختلف ہیں۔

بعض اوقات حق ایسے کام کو کہا جاتا ہے جو حکمت کے موافق اور نظم و نسق کے مطابق کیا گیا ہو جیسا کہ قرآن میں ہے

:

هو الذى جعل الشمس ضياء والقمر نور ماخلق ذلك الا بالحق

وہ وہی ہے کہ جس نے خورشید کو روشنی اور چاند کو نور افشانی کا ذریعہ قرار دیا ہے اس نے یہ کام حکمت اور حساب و کتاب کے بغیر انجام نہیں دیا۔

(یونس - ۵)

کبھی اس ذات کو حق کہا جاتا ہے جو اس قسم کا کام انجام دے۔ جیسے اللہ کے لئے اسی لفظ کا اطلاق ہوا ہے :

فَذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ

تمہارا یہ خدا تمہارا پروردگار ہے۔ (یونس - ۳۲)

کبھی ایسے اعتقاد کو حق کہا جاتا ہے جو حقیقت کے مطابق ہو۔ مثلاً

فهدى الله الذى آمنوا لما اختلفوا فيه من الحق

جن اعتقاد میں اختلاف کرتے ہیں خدا نے ایمان والوں کو ان میں حق کی ہدایت کی ہے۔ (بقرہ - ۲۱۳)

کبھی ایسی گفتگو اور عمل کو حق کہا جاتا ہے کہ جو ضروری مقدار کے مطابق ہو اور اس وقت انجام دئے جب ضروری ہو۔ مثلاً

حق القول منى لاملئن جهنم

مجھ سے یہ قول حق صادر ہوا ہے کہ میں جہنم کو (گنہگاروں سے) بھر دوں گا۔ (سجدہ - ۱۳)

بہر حال ”حق“ کے مقابل باطل ”ضلال“۔ ”لعب“، بیہودہ اور اس قسم کے دیگر کام ہیں لیکن زیر بحث آیت میں بلاشبہ اس پہلے معنی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی عالم آفرینش کے عمارت اور آسمان و زمین سب نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی خلقت میں نظم و نسق، حساب و کتاب اور حکمت و ہدف ہے۔ خدا کو انہیں خلق کرنے کی احتیاج تھی نہ اسے تنہائی سے وحشت ہو تی تھی اور نہ ان سے وہ اپنی ذات کی کسی کمی کو دور کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے بلکہ یہ وسیع و عریض جہان مخلوقات کی پرورش اور انہیں زیادہ سے زیادہ تکامل و ارتقاء بخشنے کی منزل ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : اس بات کی دلیل ہے کہ اسے تمہاری اور تمہارے ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے ، یہ ہے کہ ”اگر وہ ارادے کرے تو تمہیں لے جائے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق لے آئے“ ایسی مخلوق کہ جو ساری کی ساری ایمان رکھتی ہو اور تمہارے غلط کاموں میں سے کسی کو انجام نہ دے (إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ)۔ اور یہ کام خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہے (وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ)۔

اس گفتگو کی شاہد سورہ نساء کی یہ آیت ہے :

فان تكفروا فان لله مافى السموات والارض و كان الله غنياً حميداً ان يشاء يذهبكم ايها الناس و يأت باخرين و كان الله على ذلك قديراً۔

اگر تم کافر ہو جاؤ اور اس سے خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہے اور خدا بے نیاز اور لائق حمد ہے اے لوگو! وہ جب چاہے تمہیں لے جائے اور دوسرا گروہ لے آئے اور یہ کام خدا کے لئے آسان ہے۔ (نساء ۱۳۱ تا ۱۳۳)

مذکورہ بالا آیت کے متعلق یہ تفسیر ابن عباس سے بھی نقل ہوئی ہے۔

ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا مسئلہ معاد کی طرف اشارہ ہے یعنی خدا کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں کہ سب انسانوں کو لے جائے اور دوسری مخلوق پیدا کرنے تو کیا اس قدرت کے باوجود مسئلہ معاد دوسرے جہان کی طرف تمہاری بازگشت میں تمہیں شک ہو سکتا ہے؟

سورہ ابراہیم / آیہ 21-23

۲۱۔ وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَمَا نَحْنُ بِمُؤْمِنِينَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللَّهُ لَهَدَيْنَاكُمْ سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجْرٌ أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّجِيبٍ۔

۲۲۔ وَقَالَ الشُّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَّ الْحَقُّ وَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلْمُزُونِي وَلَوْ مَوَا أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِي مِنْ قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

۲۳۔ وَأَدْخِلِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيُّهُمْ فِيهَا سَلَامٌ۔

ترجمہ

۲۱۔ اور (قیامت کے روز) وہ سب خدا کے سامنے ظاہر ہو نگیں تو اس وقت ضعفاء (نادان پیرو کار) متکبرین سے کہیں گے: ہم تمہارے پیرو کار تھے۔ تو کیا (اب جب تمہاری پیروی کی وجہ سے ہم عذابِ خدا مینگرفتار ہوئے ہیں) تم تیار ہو کہ عذابِ الہی کاکچھ حصہ قبول کرو اور اہم سے اسکا بوجھ اٹھالو۔ تو وہ کہیں گے کہ اگر خدا نے (عذاب سے رہائی کی طرف) ہماری ہدایت کی ہوتی تو ہم بھی تمہیں ہدایت کرتے (معاملہ اس سے آگے نکل گیا ہے) چاہے ہم بے قرار ہوں یا صبر کریں، ہمارے لئے کوئی فرق نجات کی راہ موجود نہیں ہے۔

۲۲۔ اور جس وقت کام تمام ہو گیا تو شیطان کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا اور میں نے تم سے (باطل) وعدہ کیا اور خلاف ورزی کی۔ میں تم پر کوئی تسلط نہیں رکھتا تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے قبول کر لی۔ لہذا مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ کو سرزنش نہ کرو، میں تمہارا فریاد رس ہونہ تم میرے فریاد رس ہو۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا (اور میری اطاعت کو اطاعت خدا کے ہم پلہ قرار دیا) اور یہ تم پہلے ہی سے کرتے تھے، میں اس سے بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ یقیناً ظالموں کے لئے درد ناک عذاب ہے۔

۲۳۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے وہ باغات بہشت میں داخل ہونگے۔ ایسے باغات کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہونگی۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان میں رہیں گے اور وہاں ان کا تحبہ سلام ہو گا۔

تفسیر

شیطان اور اس کے پیرو کاروں کی صریح گفتگو

گزشتہ چند آیات میں ہٹ دھرم اور بے ایمان منحرفین کے لئے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زیر بحث آیات اسی مفہوم کا تسلسل ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: روز قیامت تمام جابر، ظالم اور کافر بارگاہِ خداوندی میں پیش ہوں گے چاہے وہ تابع ہوں یا متبوع اور پیرو ہوں یا پیشوا (وَبَرُّوا لِلَّهِ جَمِيعًا)۔

اس وقت ضعفاء یعنی نادان پیرو کار کہ جو اندھی تقلید کی وجہ سے اپنے آپ داویٰ ضلالت میں سرگردان کر چکے تھے مستکبرین سے کہ جو ان کی گمراہی کے شامل تھے، کہیں گے: ہم تمہارے پیرو تھے۔ اب جب کہ ہم تمہاری رہبری کے باعث ان کے سب عذابوں اور بلاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں، کیا ممکن ہے کہ تم بھی ان عذابوں کا کچھ حصہ قبول کر لو تاکہ ہمیں تخفیف مل جائے (فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَاَهْلُ اَنْتُمْ مُعْتَدُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ)۔ لیکن وہ کہیں گے: اس کیفرِ کردار اور عذاب سے اگر خدا ہماری ہدایت نجات کی طرف کتاتو ہم بھی تمہاری راہنمائی کرتے (قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللّٰهُ لَهَدَيْنَاكُمْ)۔

لیکن افسوس کہ معاملہ اس سے آگے نکل چکا ہے ”چاہے ہم بے قرار ہوں اور جزع و فزع کریں چاہے صبر کریں ہمارے کوئی راہ، نجات نہیں ہے“ (سَوَاءٌ عَلَيْنَا اَجْرُ عَنَّا اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ)۔

چند اہم نکات

۱۔ ایک اشکال کی وضاحت:

۱۔ ایک اشکال کی وضاحت: اس آیت کے سلسلے میں جو پہلا سوال سامنے آتا ہے یہ ہے کہ کیا لوگ اس جہان میں علم، خدا کے سامنے ظاہر نہیں ہیں کہ جو مذکورہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں سب کے سب بارگاہِ خدامین ظاہر ہوں گے؟

اس سوال کے جواب میں بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ وہ خود اور ان کے سب اعمال بارگاہِ خدا میں ظاہر ہیں لیکن قیامت میں یہ ظہور سب محسوس کریں گے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں مراد قبروں سے نکلنا اور حساب و کتاب کے لئے عدلِ الہی کی عدالت کے سامنے پیش ہونا ہے۔

یہ دونوں تفسیریں خوب ہیں اور کوئی مانع نہیں کہ دونوں ہی آیت کے مفہوم میں داخل ہوں۔

۲۔ ”لو ہدانا اللہ لہدیناکم“ کا مفہوم

۲۔ ”لو ہدانا اللہ لہدیناکم“ کا مفہوم: بہت سے مفسرین کا نظر یہ ہے کہ اس سے مراد اس جہان میں عذابِ الہی سے نجات کے طریقے کی ہدایت ہے کیونکہ یہ بات مستکبرین اپنے پیروکاروں کے جواب میں کہیں گے کہ جب پیرو ان سے عذاب کا کچھ حصہ قبول کرنے کا تقاضا کریں گے سوال و جواب کا تقاضا ہے کہ مراد عذاب سے رہائی کے طریقے کی ہدایت

ہو۔

اتفاق سے یہی تعبیر (ہدایت) نعمات بہشت تک پہنچنے کے بارے میں بھی نظر آتی ہے۔ اہل جنت کی زبانی ہے :  
وقالوا الحمد لله الذي هدانا لهذا وما كنا لنهتدي لولا ان هدانا الله  
وہ کہیں گے : شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں ان نعمتوں کی طرف ہدایت کی ہے اور اگر اس کی توفیق و ہدایت نہ ہوتی  
تو ہمیں ان کی راہ نہ ملتی۔ (اعراف.۴۳)

بہ احتمال بھی ہے کہ رہبران ضلالت سے جب ان کے پیرو کار تقاضا کریں گے تو اپنے تئیں گناہ سے بری کرنے کے لئے  
گمراہی کے تمام علمبرداروں کی طرح کہ جو اپنی خراب کاری دوسروں کے سر تھوپ دیتے ہیں ، وہ بڑی ڈھٹائی سے  
کہیں گے : ہم کیا کریں اگر خدا ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت کرنا تو ہم بھی تمہیں ہدایت کرتے یعنی ہم تو مجبور تھے اور  
ہمارا اپنا تو کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔

یہی شیطان کی منطق ہے کہ جس نے اپنے آپ کو بری قرار دینے کے لئے خدائے عادل کی طرف جبر کی نسبت دیتے  
ہوئے کہا:

فبما اغويين لاقعدن لهم صراطك المستقيم

اب جب کہ تونے مجھے گمراہ کیا ہے تو میں بھی تیرے سیدھے راستے میں بیٹھا ان کی تاک میں رہوں گا ( اور انہیں  
منحرف کروں گا) (اعراف. ۱۶)۔

لیکن توجہ رہے کہ مستکبریں چاہیں نہ اوجاہیں صریح آیات قرآن اور واضح روایات کی رو سے اپنے پیرو کاروں کے گناہ  
کی ذمہ داری کو بوجہ بہر حال انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا نا ہوگا کیونکہ وہ انحراف کی بانی اور گمراہی کے عامل تھے البتہ  
پیر و کاروں کی ذمہ داری اور عذاب و سزا میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔

۳۔ اندھی تقلید کی مذمت

۳۔ اندھی تقلید کی مذمت : مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ :

اولا - وہ لوگ جو آنکھ کان بند کر کے اس کے اور اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں کہ گویا ہر شخص کے ہاتھ اپنی باگ دوڑ  
تھمادیتے ہیں وہ بے وقعت اور بے حیثیت لوگ ہیں قرآن ان کے لئے ”ضعفاء“ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔  
ثانیا - ان کا اور ان کے پیشواؤں کا انجام ایک ہی ہے اور وہ بے چارے سخت ترین حالات میں بھی اپنے گمراہ رہبروں  
کاتعاون حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے رہبروں کی سزا اور عذاب میں ذرہ بھر تخفیف نہیں کروا سکیں  
بلکہ شاید تمسخر سے انہیں جواب دینگے کہ بے کار و اویلا کرو کیونکہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۴۔ ”برزو“ اور ”محیص“ کا مفہوم

۴۔ ”برزو“ اور ”محیص“ کا مفہوم : ”برزو“ در اصل ”بروز“ کے مادہ سے ظاہر ہونے اور پردے سے باہر آنے کے معنی  
میں ہے۔ نیز اس کا معنی میدان جنگ میں صف سے باہر نکل کر حریف کے مقابلے میں آکھڑے ہونا بھی ہے۔ اصطلاح یہ  
لفظ مبارزہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

”محیص“ ”محص“ کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے عیب یا تکلیف سے نجات پانا۔

اس کے بعد جابروں ، گنہگاروں اور شیطان کے پیروکاروں کی روز قیامت روحانی اور نفسیاتی عذا اور سزا کا منظر پیش  
کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : اور جب صالح اور غیر صالح بندوں کا حساب کتاب ختم ہو جائے گا اور رہبر ایک اپنے قطعی  
انجام کا پہنچ جائے گا تو شیطان اپنے پیرو کاروں سے کہے گا کہ خدا نے تم سے حق وعدہ کیا تھا اور میں نے بی تم سے  
وعدہ کیا تھا ( جیسا کہ تم خود جانتے ہو وہ فضول اور بے قیمت وعدہ تھا ) پھر میں نے اپنے وعدے کے خلاف کیا

( وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَّ الْحَقَّ وَوَعَدْتُمْ فَأَخْلَفْتُمْ )۔

گویا اس طرح شیطان بھی دیگر راہ ضلالت کے بہر مستکبرین کا ہم آواز ہوتا ہے اور اپنے ان بد بخت پیرو کاروں پر ملامت  
و سرزنش کے تیر چلاتا ہے پھر مزید کہتا ہے : میں تم پر کوئی جبری طور پر مسلط نہ تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ میں  
نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اپنی مرضی سے اسے قبول کیا ( وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي )  
۔ ”لہذا مجھے سرزنش نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو“ کہ تم نے میری شیطننت آمیز اور ظاہر الفساد دعوت کو کیوں  
قبول کیا ( فَلَا تُلْمُونِي وَلَوْلَا أَنفُسَكُمْ ) تم نے خود یہ کام کیا ہے لہذا لعنت تم پر ہو۔

بہر حال ”پرو وردگار کے قطعی حکم اور عذاب کے سامنے نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی

کرسکتے ہو“ (مَا أَنَا بِمُصْرِحِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِحِيَّ ) میں اعلان کرتا ہوں کہ تمہاری طرف سے مجھے شریک قرار دینے اور میری اطاعت کو اطاعتِ الہی کے ہم پلہ قرار دینے سے بیزار ہوں اور میں اس کا انکار کرتا ہوں (اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَا اُشْرَكْتُمُوْنِیْ مِنْ قَبْلُ) ۔

اب میں سمجھا ہوں کہ ”اسی اطاعت میں شرک کرنے نے“ مجھے بھی بد بخت کیا ہے اور تمہیں بھی ، وہی بد بختی اور بے چارگی کہ جس کی تلافی کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے ، جان لو کہ ”ظالموں کے لئے یقیناً دردناک عذاب ہے“ ( اِنَّ الظَّالِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ) ۔

چند اہم نکات

قرآنی آثار تفسیر نمونہ جلد 10۱- شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب

۱۔ شیطان کا اپنے پیروکاروں کو سخت جواب: ”شیطان“ کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے اور اسمیں جنوں اور انسانوں میں سے تمام طاغوطی اور وسوسہ گر شامل ہیں لیکن اس آیت اور گزشتہ آیت میں جو قرائن موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یقیناً مراد شخصی طور پر ابلیس ہے کہ جو تمام شیطانوں کا گرو شمار ہوتا ہے ۔ اسی لئے تمام مفسرین نے اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے ۔ 2

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ شیطانی وسوسے انسان کے اختیار و ارادہ کو ہرگز سلب نہیں کرتے ۔ بلکہ ان کی حیثیت ایک دعوت دینے والے سے زیادہ نہیں اور یہ انسان ہے جو اپنے ارادے سے شیطان کی دعوت قبول کرتا ہے ۔ البتہ ممکن ہے شیطانی کاموں کے لئے طبیعت ہموار ہو جائے اور انسانی مقاصد کے خلاف مسلسل کام کرنے سے انسان ایسے مقام تک جا پہنچے جس سے وسوسوں کے مقابل ایک طرح کی سلب اختیار کی حالت پیدا ہو جائے جیسے ہم بعض منشیات کے عادی لوگوں کو دیکھتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کا اصل سبب اختیاری ہے لہذا نیچہ کچھ ہو اختیاری ہی شمار ہو گا ۔

سورہ نحل کی آیہ ۱۰۰ میں ہے :

انما سلطانه على الذين يتولونه و الذين هم مشركون

شیطان کا تسلط صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اپنے لئے اس کی سر پرستی قبول کر لی ہے اور جنہوں نے اطاعت میں اسے خدا کا شریک قرار دیا ہے ۔

ضمناً شیطان ان لوگوں کو دندان شکن جواب دیتا ہے جو اپنے گناہ اس کی گردن پر ڈال دیتے ہیں ، اپنے انحرافات کا عامل اسے شمار کرتے ہیں اور اس پر لعنت بھیجتے ہیں ۔ شیطان بعض گنہگاروں کی اس عامیانہ منطق سے برأت کا اظہار کرتا ہے ۔ دراصل انسان پر حقیقی تسلط اس کے ارادے اور عمل کا ہے نہ کہ کسی اور چیز کا ۔

۲۔ روز حشر شیطان کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ

۲۔ روز حشر شیطان کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ : اس عظیم محضر میں شیطان کس طرح اپنے تمام پیروکاروں سے رابطہ قائم کرسکے گا اور کس طرح انہیں ملامت کرے گا ۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یقیناً خدا سے یہ طاقت دے گا ۔ دراصل شیطان کے پیروکاروں کے لئے یہ ایک طرح کا روحانی اور نفسیاتی عذاب ہے ۔ یہ اس جہان میں اس راستے پر چلنے والوں کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے کہ وہ ابھی سے اپنا اور اپنے رہبر کا انجام دیکھ لیں ۔ بہر حال خدا کسی طرح سے شیطان اور اس کے پیروں کے درمیان یہ ارتباط فراہم کرے گا ۔

۳۔ گمراہی کے دیگر پیشواؤں کا طرز عمل

۳۔ گمراہی کے دیگر پیشواؤں کا طرز عمل : یہ امر جاذب نظر ہے کہ روز قیامت ایسی ملاقات صرف شیطان اور اس کے پیروکاروں کے درمیان نہ ہوگی بلکہ ضلالت و گمراہی کے تمام پیشواؤں جہاں میں ایسا ہی کریں گے ۔ وہ اپنے پیروکاروں کا ہاتھ ( خود ان کی مرضی سے ) پکڑیں گے ۔ انہیں بلاؤں اور بلاؤں اور بدبختیوں کی موجوں کی طرف کھینچ لے جائیں گے اور جب وہ دیکھیں گے کہ حالات برے ہیں تو انہیں چھوڑ کر چلتے بنیں گے ۔ یہاں تک کہ ان سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور انہیں ملامت کریں گے ۔ بزبان اصطلاح انہیں دنیا و آخرت کے خسارے میں گرفتار کریں گے ۔

۴۔ ”صرخ“ کا مطلب

۴۔ ”صرخ“ کا مطلب: ”صرخ“ اصراخ کے مادہ سے اصل میں ”صرخ“ مدد کے لئے پکارنے اور فریاد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس بناء پر ”صرخ“ فریاد رس کے معنی میں ہے اور ”مستصرخ“ اس شخص کے معنی میں ہے جو فردرسی چاہے۔

۵۔ شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد

۵۔ شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد: شیطان کو شریک قرار دینے سے مراد شرکِ اطاعت ہے نہ کہ شرکِ عبادت۔  
۶۔ ”ان الظالمین لهم عذاب الیم“ کس کا جملہ ہے: یہ جملہ شیطان کی باتوں کا آخری حصہ ہے یا پروردگار کی طرف سے مستقل جملہ ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ لیکن زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے مستقل جملہ ہے کہ جو شیطان کی اپنے پیروکاروں سے گفتگو کے بعد ایک اصلاحی و تربیتی درس کے طور پر آیا ہے۔  
زیر بحث آخری آیت میں سرکش و بے ایمان جابر افراد کی حالت اور ان کا دردناک انجام بیان کرنے کے بعد مومنین کی حالت اور ان کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جو ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دئے وہ باغاتِ بہشت میں داخل ہو گئے، وہ باغات کے جن کے درختوں کے نیچے پانی نہریں جاری ہیں (وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ)۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے (خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ)۔

”تحیت“ دراصل ”حیات“ کے مادہ سے لیا گیا ہے بعد از ان یہ لفظ افراد کی سلامتی اور حیات کی دعا کے لئے استعمال ہونے لگا ہر قسم کی سلام و دعا کہ جو ابتدائے ملاقات میں کہی جاتی ہے، اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں ”تحیت“ وہ خوش آمدید اور درود و سلام جو اللہ تعالیٰ نے صاحب ایمان پر بھیجا ہے اور انہیں اپنی اپنی نعمتِ سلامتی کا ہم آغوش قرار دیتا ہے۔

سلامتی ہر قسم کی ناراحتی اور درد و غم سے سلامتی

سلامتی ہر قسم کی جنگ و نزع سے سلامتی

اس مفہوم کی بناء پر ”تحیتہم“ کی اضافت کی طرف ہے اور اس کا فاعل خدا تعالیٰ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں مراد وہ تحیہ و سلام ہے جو مومنین ایک دوسرے سے کہیں گے یا فرشتے ان سے کہیں گے۔ بہر حال لفظ ”سلام“ جو بطور مطلق آیا ہے، اس کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ جو ہر قسم کی سلامتی پر محیط ہے اور ہر قسم کی ناراحتی اور تکلیف سے سلامتی پر مشتمل ہے چاہے روحانی ہو یا جسمانی۔ 3۔

.....

3۔ سلام و تحیت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد چہارم، سورہ نساء آیت ۸۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کرچکے ہیں (ص ۵۴ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کیجئے گا)۔

تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 24-27

۲۴۔ أَلَمْ تَرَى كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ -

۲۵۔ تُوْتِي أَكْلَهَا كُلَّ حَبِيٍّ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ -

۲۶۔ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ -

۲۷۔ يُنَبِّئُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْأَجْرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ.

ترجمہ

۲۴۔ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے کلمہ طیبہ (اور گفتار پاکیزہ) کو پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے کہ جس کی جڑ (زمین میں) ثابت ہے اور جس کی شاخ آسمان میں ہے۔

۲۵۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہر وقت اپنے پہلے دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۲۶۔ اور (اسی طرح) کلمہ خبیثہ کو ناپاک درخت سے تشبیہ دی ہے کہ زمین سے اکھڑ چکا ہے اور اس کے لئے قرار و ثبات نہیں ہے۔

۲۷۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اللہ ان کی گفتار اور اعتقاد کے ثبات کی وجہ سے ثابت قدم رکھے گا، اس جہان میں بھی اور آخرت میں بھی۔ نیز اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے (اور ان سے اپنا لطف و کرم چھین لیتا ہے) اور خدا جو کام چاہے (اور قرین مصلحت سمجھے) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

”شجرہ طیبہ“ اور ”شجرہ خبیثہ“

یہاں حق و باطل، ایمان و کفر اور طیب و خبیث کو ایک نہایت عمیق اور پر معنی مثال کے ذریعے مجسم کر کے بیان کیا گیا ہے۔ یہ آیات اس سلسلے کی گزشتہ آیات کی بحث کو مکمل کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تو نے دیکھا نہیں کہ خدا نے کس طرح پاکیزہ کلام کے لئے مثال دی ہے اور اسے طیب و پاکیزہ درخت سے تشبیہ دی ہے (أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ)۔

پھر اس شجرہ طیبہ یعنی پاکیزہ و با برکت درخت کی خصوصیات بیان کی گئی ہے اور مختصر عبارت میں اس کے تمام پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم قرآن میں موجود اس شجرہ کی خصوصیات کا مطالعہ کریں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ”کلمہ طیبہ“ سے مراد کیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس کو کلمہ توحید اور جملہ ”لا الہ الا اللہ“ سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض دوسرے اسے اوامر و فرمیں الہی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں بعض اسے ایمان سمجھتے ہیں کہ جو لا الہ الا اللہ کا معنی و مفہوم ہے۔ بعض دوسروں سے اس کی ”مؤمن“ سے تفسیر کی ہے اور بعض نے اس کا مفہوم اصلاحی و تربیتی روش اور لائحہ عمل بیان کیا ہے۔ ۱۔

لیکن ”کلمہ طیبہ“ کے مفہوم و معنی کی وسعت کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں یہ تمام تفاسیر شامل ہیں کیونکہ لفظ ”کلمہ“ کے وسیع معنی میں تمام موجودات شامل ہیں۔ اسی بناء پر مخلوقات کو ”کلمہ اللہ“ کہا جاتا ہے۔ ۲۔ نیز ”طیب“ ہر قسم کی پاک و پاکیزہ چیز کو کہتے ہیں۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ اس مثال کے مفہوم میں ہر پاک سنت، حکم، پروگرام، روش، عمل، انسان شامل ہے۔ مختصر یہ کہ ہر پاک و با برکت موجود کلمہ طیبہ ہے اور یہ سب ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہیں کہ جس کی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ وہ موجودہ کہ جو نشو و نما کا حامل ہے نہ کہ بے روح، جامد اور بے حرکت ہے۔ بڑھنے اور پھلنے پھولنے والا ہے۔ دوسروں کی اور اپنی پرورش و اصلاح کرنے والا ہے۔ لفظ ”شجرہ“ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

۲۔ یہ درخت پاک و طیب ہے لیکن کس لحاظ سے، اس سلسلے میں کسی خاص پہلو کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ لہذا اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ہر پہلو سے پاکیزہ ہے۔ اس کا پہل پاکیزہ ہے، اس کے شگوفے اور پھول پاکیزہ ہیں، اس کا سایہ پاکیزہ ہے اور اسے خارج ہونے والی گیس پاکیزہ ہے۔

۳۔ یہ درخت ایک منظم نظام کا حامل ہے۔ اس کی جڑ اور اس کی شاخوں میں سے ہر ایک اپنی ذمہ داری ہے۔ اصولی طور پر اس میں جڑ اور شاخ کا وجود اس میں موجود منظم نظام کی دلیل ہے۔

۴۔ اس کی جڑ اور ریشہ ثابت و مستحکم ہے۔ اس طرح سے کہ طوفان اور تند و تیز آندھیاں اسے اس کی جگہ اکھاڑ نہیں سکتیں۔ اس میں ایسی توانائی ہے کہ اس کی شاخیں سورج کی کرنوں کے نیچے اور آزاد ہوا میں محفوظ ہیں کیونکہ جو شاخ جتنی اونچی ہو اسے اتنی ہی قوی تر جڑ کی ضرورت ہے (أَصْلُهَا ثَابِتٌ)۔

۵۔ اس شجرہ کی شاخیں کسی پست اور محدود ماحول میں نہیں ہیں بلکہ وہ آسمان کی بلندیوں میں ہیں۔ یہ شاخیں ہوا کا سینہ

چیز کی بلندی پر جا پہنچیں ہیں۔ جیسا ہاں ”اس کی شاخیں آسمان میں ہیں“ (وَقَرَّعَهَا فِي السَّمَاءِ)۔ واضح ہے کہ شاخیں جس قدر بلند ہوں گی، زمین کے گرد و غبار سے اتنی ہی دور ہوں گی اور ان کے پھل اتنے ہی زیادہ پاکیزہ ہوں گے اور ایسی شاخیں سورج کی کرنوں اور پاکیزہ ہوا سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گی اور ان کا اثر طیب پھلوں پر بہتر بہتر ہو گا۔ 3

۶۔ یہ شجرہ طیبہ پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ یہ ان درختوں کی مانند نہیں کہ جو بے ثمر ہوتے ہیں ”یہ درخت اپنا پھل دیتا ہے“ (تُوْنِي اُكْلَهَا)۔

۷۔ اور ایسا درخت ہے جو ایک دو فصلوں میں پھل نہیں دیتا بلکہ ہر موسم میں اس پر پھل لدا ہوتے ہیں تو جب بھی اس کی جانب ہاتھ بڑھائے محروم نہیں لوٹے گا (كُلَّ حِينٍ)۔

۸۔ اس کا یہ پھل کسی پروگرام کے بغیر نہیں بلکہ قوانین فطرت کے مطابق سنتِ الہی کے تحت اور ”اپنے پروردگار کے اذن سے“ ہے اور سب کے لئے عام ہے (يَاذَن رَّبَّهَا)۔

اس ”شجرہ طیبہ“ کی یہ خصوصیات آپ کے سامنے ہیں اب غور کیجئے کہ یہ ہر کات کس درخت کو حاصل ہیں۔ یقیناً یہ خوبیاں اور ربر کتیں کلمہ توحید اور اس کے معنی میں موجود ہیں، ایک موحد اور صاحب معرفت انسان کو حاصل ہیں اور ایک اصلاحی اور پاکیزہ لائحہ عمل میں موجود ہیں اور یہ سب مفہیم محکم و ثابت جڑوں کے حامل ہیں، سب میں ایسی فراوان شاخیں ہیں جو آسمان سے باتیں کرنے والی ہیں اور مادی آلوگیوں اور رکتافتوں سے دور ہیں۔ سب ثمر آور، نور افشاں اور فیض بخش ہیں۔

جو شخص جو وقت بھی ان کے پاس آئے اور ہاتھ ان کے شاخسار وجود کی طرف پھیلائے ان کے لذیذو معطر اور قوت بخش پھلوں سے اپنا دامن مراد بھر لے گا۔ حوادث کی تیز آندھیاں اور سخت طوفان انہیں ان کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتے اور ان کا افق فکر چھوٹی سی دنیا میں محدود نہیں ہے وہ زمان و مکان کے حجاب چاک کر کے ابدیت کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔

ان کا پروگرام ہوا و ہوس کے تابع نہیں بلکہ سب کے سب اذن پروردگار سے اس کے فرمان کے مطابق آگے بڑھے اور حرکت کرتے ہیں اور یہی ان کے ثمر بخش ہونے کا سرچشمہ ہے۔

پروردگار کے ان کلمات طیبہ عظیم و باایمان جوانمردوں کی زندگی برکت کا باعث ہے اور ان کی موت ہے اور ان کی موت حرکت کا سبب ہے، ان کے آثار، ان کے کلمات، ان کی باتیں، ان کے شاگرد، ان کی کتابیں، ان کی پرافتخار تاریخ حتیٰ کہ ان کی خاموش قبریں سب کی سب الہام بخش، سرچشمہ ہدایت، انسان ساز اور تربیت کنندہ ہیں۔ جی ہاں! خدا اس طرح سے لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے کہ شاید وہ سمجھ جائیں ”(وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ)۔

یہاں مفسرین کے درمیان ایک سوال پیدا ہوا اور وہ یہ ہے کہ کوئی درخت مذکورہ بالا صفات کا وجود خارجی رکھتا ہے کہ جس سے کلمہ طیبہ کو تشبیہ دی گئی ہے ایسا درخت موجود ہے اور وہ کھجور کا درخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مجبوراً ”کل حین“ کی تفسیر ”چھ ماہ، بیان کی ہے۔

لیکن کسی وجہ سے بھی ضروری نہیں کہ ہم اس قسم کے وجود پر اصرار کریں بلکہ مختلف زبانوں میں ایسی بہت تشبیہیں موجود ہیں جو بالکل وجودِ حاجی نہیں رکھیں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ قرآن ایسے آفتاب کی مانند ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آفتاب ہمیشہ غروب کرتا ہے) یا کہا جاتا ہے کہ میرا ہجر ایسی رات کی طرح ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتی (حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شب ختم ہو جاتی ہے)۔ بہر حال تشبیہ کا مقصد چونکہ حقائق کو مجسم کرنا ہے اور عقلی مسائل کو محسوس کے قالب میں ڈھالنا ہے لہذا ایسی تشبیہات میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ پوری طرح دلنشین، مؤثر اور جاذب ہیں۔

اس کے باوجود دنیا میں ایسے درخت موجود ہیں جن کی شاخوں پر سے سارا سال پھل ختم نہیں ہوتے یہاں تک کہ ہم نے خود گرم علاقوں میں بعض ایسے درخت دیکھے ہیں کہ ان پر پھل بھی موجود تھا اور تازہ پھول بھی آگے ہوئے تھے اور نئے پھل کے آثار بھی موجود تھے جب کہ موسم سردیوں کا تھا۔

مسائل سمجھنے اور افہام و تفہیم کا بہترین طریقہ چونکہ موازنہ کرنا ہے لہذا شجرہ طیبہ کے ذکر کے بعد بلا فاصلہ اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: رہی مثال کلمہ خبیثہ کی، تو وہ خبیث، ناپاک اور بے ریشہ درخت کی مانند ہے کہ جو زمین سے اکھڑ چکا ہے اور طوفان آتے ہیں تو روزانہ کسی اور کونے میں جاگرتا ہے اور اسے قرار و ثبات میسر نہیں (وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ)۔

”کلمہ خبیثہ“ وہی کفر و شرک کا کلمہ ہے، گھٹیا، قبیح اور ربری گفتار ہے، گمراہ کن اور غلط پروگرام ہے اور ناپاک و

آلودہ انسان ہیں خلاصہ یہ کہ ہر خبیث اور ناپاک چیز کلمہ خبیثہ ہے ۔

واضح ہے کہ ہر ناکارہ اور رقییح و منحوس درخت کہ جس کی جڑیں اکھڑ گئی ہوں اس میں نہ نشو و نما ہوگی ، نہ ترقی و تکامل ، نہ پھل پھول ، نہ سایہ و منظر اور نہ ثبات و قرار وہ تو ایک لکڑی جو سوائے جلانے اور آگ لگانے کے کسی کام کی نہیں بلکہ راستے کی رکاوٹ ہے ۔ ایسا درخت کبھی گزند پہنچاتا اور مجروح کرتا ہے ی الگوں کے لئے تکلیف و آزار کا باعث بنتا ہے ۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ شجرہ طیہ کی تعریف میں قرآن تفصیل سے بات کرتا ہے لیکن جب شجرہ خبیثہ کے ذکر کا موقع آتا ہے ۔ تو ایک مختصر سا جملہ کہہ کر گزر جاتا ہے ۔ صرف اتنا کہتا ہے ۔

اجتث من فوق الارض مالها من قرار

یہ زمین سے اکھڑا ہوا ہے اور اسے ثبات و قرار نہیں ہے ۔

کیونکہ جس وقت یہ ثابت ہو گیا کہ یہ درخت جڑ کے بغیر ہے تو پھر شاخ و برگ اور پھل پھول کے ذکر کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی ۔ علاوہ اس میں یہ ایک طرح کی لطافت بیان ہے کہ انسان محبوب کا ذکر کوتاہی سے تو اس کی تمام خصوصیات بیان کرتا ہے لیکن جب ”مبغوض“ کے ذکر کا موقع آتا ہے تو بس ایک نفرت انگیز جملہ کہہ کے آگے بڑھ جاتا ہے ۔

یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مفسرین اس درخت کے متعلق کہ جو مشبہ بہ کے طور پر آیا ہے کے بارے میں سوال اٹھا تے ہیں کہ یہ کونسا درخت ہے ۔

بعض نے اسے ”حنظل“ سمجھا ہے کہ جس کا پھل بہت تلخ اور برا ہوتا ہے

بعض نے اسے ”کشوت“ (بروزن ”سقوط“) کہا ہے ۔ یہ ایک پیچیدہ سا پودا ہے ، جو بیابانوں میں خاردار بوٹوں سے لپٹ کر اوپر چلا جاتا ہے ۔ نہ اس کی جڑ ہوتی ہے نہ پتے ( توجہ رہے کہ ”شجر“ لغت میں درخت کو بھی کہا جاتا ہے اور پودے کو بھی ) ۔

لیکن جیسا کہ ہم نے ”شجرہ طیہ“ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر تشبیہ میں ”مشبہ بہ“ ان تمام صفات کے ساتھ وجود خارجی رکھتا ہو بلکہ یہاں مقصد کلمہ شرک ، انحرافی طرز عمل اور خبیث لوگوں کی حقیقی چہرہ کو مجسم طور پر پیش کرنا ہے اور بتانا ہے کہ وہ ان درختوں کی طرح ہیں جن کی ہر چیز خبیث اور ناپاک ہے اور ان کا ثمر سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ راستے میں مزاحم ہوتے ہیں اور درد سر کا باعث بنتے ہیں ۔ علاوہ ازیں ایسے ناپاک درخت کم نہیں کہ جو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گئے ہوں اور بیابان میں طوفان اور تیز آندھی کی زد پر ہوں ۔

مذکورہ بالا آیت میں دو ناطق مثالوں کے ذریعے ایمان و کفر ، مومن و کافر اور کلی طور پر ہر ناپاک وجود کو مجسم شکل میں ذکر کیا گیا ہے لہذا آخری زیر نظر آیت میں نتیجہ کار اور ان کا انجام آخر ذکر کیا گیا ہے ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے : ایمان لانے والوں کو خدا ان کی ثابت و پائدار گفتار و اعتقاد کے سبب ثابت قدم رکھتا ہے ، اس جہاں میں بھی اور اس جہاں میں بھی (يُنَبِّئُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ) ۔

کیونکہ ان کا ایمان سطحی اور متزلزل نہیں ہوتا نہ ان کی شخصیت کھوکھلی اور متلون ہوتی ہے بلکہ وہ ایک شجرہ طیہ ہیں کہ جس کی جڑیں ثابت و پائند ہیں اور جس کی شاخیں آسمان کی طرح بلند ہیں اور چونکہ کوئی شخص لطف خدا سے بے نیاز نہیں ، دوسرے لفظوں میں ہر نعمت بالآخر اس کی ذات پاک کی طرف لوٹتی ہے لہذا یہ سچے ثابت قدم مومنین لطف خدا کے بھروسہ ہر حادثے کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح استقامت دکھاتے ہیں ۔ لغزش کہ جس سے زندگی میں بچا نہیں جاسکتا ان کے راستے میں آتی ہے تو خدا ن کی حفاظت کرتا ہے ۔ شیاطین ہر طرف سے انہیں وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس دنیا کی زرق برق چیزوں کے ذریعے انہیں پھسلانے کی سعی کرتے ہیں مگر ان کا خدا انہیں محفوظ رکھتا ہے ۔ جہنمی طاقتیں اور سنگدل ظالم انہیں طرح طرح کی دھمکیوں کے ذریعے جھکانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں اثبات قدم عطا کرتا ہے کیونکہ ان کی جڑ اور بنیاد ثابت و مستحکم ہوتی ہے ۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ یہ خدائی حفاظت و ثبات ان کی ساری زندگی پر محیط ہے ۔ اس جہاں کی زندگی پر بھی اور اس جہاں کی زندگی پر بھی ۔ یہاں وہ ایمان و پاکیزگی پر باقی رہتے ہیں اور ان کا دامن آلودگیوں کے عار و ننگ سے پاک ہوتا ہے اور وہاں وہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے ۔

پھر ان کے مقابل افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے : اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اور خدا جو کچھ چاہتا ہے انجام دیتا ہے (وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ) ۔

ہم نے بار بار کہا ہے کہ جہاں جہاں بھی ہدایت و ضلالت کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے اس کے لئے پہلے انسان خود قدم اٹھاتا ہے ۔ خدا کا کام تو تاثیر پیدا کرتا ہے جو اس نے ہر عمل میں کی ہے نیز خدا کاکام نعمتیں عطا کرنا اور انہیں

سلب کرتا ہے اور ایسا وہ اہلیت اور عدم اہلیت کی بناء پر کرتا ہے (غور کیجئے گا)۔  
 ”یضل الله“ کے بعد ”ظالمین“ کی تعبیر اس امر کے لئے بہترین قرینہ ہے یعنی جب تک کوئی شخص ظلم و ستم سے  
 آلودہ نہ ہو اس سے نعمت ہدایت سلب نہیں ہو گی لیکن جب کوئی ظلم و ستم سے آلودہ ہو جاتا تو گناہ کی تاریکی اس کے  
 وجود پر چھا جاتی ہے اور ہدایت الہی کا نور اس کے دل سے نکل جاتا ہے اور یہ بالکل ارادہ و اختیار کی آزادی ہے۔ ایسا  
 شخص اگر فوری طور پر اپنی سمت درست کر لے تو نجات کا راستہ اس کے سامنے کھلا ہوا ہے لیکن گناہ میں مستحکم ہو  
 جانے کے بعد پلٹنا بہت ہی مشکل ہے۔

۱. مجمع البیان، قرطبی، فی ظلال اور تفسیر کبیر از فخر رازی کی طرف رجوع کریں۔
۲. لفظ ”کلمہ“ اور اس کے مفہوم کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۵ میں سورہ انعام کی آیہ ۱۱۵ کے ذیل میں ہم بحث کر چکے ہیں (دیکھنے ص ۳۳۱ اردو ترجمہ)۔
۳. ایسی تاثیر خصوصاً ایک درخت کے پھلوں پر خوب واضح ہے۔ وہ کہ جو درخت کی اوپری شاخوں پر لگنے والے پھلوں کی نسبت بہتر اور خوب پکے ہوئے ہوتے ہیں اور زیادہ عمدہ ہوتے ہیں۔
۴. تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۴۰ و ۵۴۱۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا آخرت سے مراد قبر ہے؟

۱۔ کیا آخرت سے مراد قبر ہے؟ بہت سی روایات میں ہے کہ جب انسان قبر میں پہنچتا ہے اور فرشتے اس سے اس کی حقیقت کے متعلق سوال کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے ایمان کے راستے پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اس کا یہی معنی ہے:

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ

ان میں سے بعض روایات میں صراحت کے ساتھ لفظ ”قبر“ آیا ہے۔ 1

جبکہ بعض دوسری روایات میں ہے کہ شیطان موت کے وقت صاحب ایمان کے پاس آتا ہے اور کبھی داہنی طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے اور کبھی بائیں طرف سے اسے گمراہ کرنے کے لئے وسوسہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن خدا اسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ مومن کو گمراہ کرے ”یثبت اللہ الذین آمنوا کما یبھی مفہوم ہے۔

امام صادق علیہ السلام کی اس روایت کا بھی یہ مفہوم ہے:

ان الشیطان لیا تی الرجل من اولیاء ناعند موتہ عن یمینہ و عن شمالہ لیضلہ عما هو علیہ فیأبی اللہ عزو جل لہ ذلک قول اللہ عزو جل یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة۔ 2

مفسر عظیم طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دار۔ آخر نہ لغزش کی جگہ ہے اور نہ عمل کی بلکہ صرف نتائج اعمال کا سامنا کرنے کا مقام ہے لیکن وہ لمحہ کہ جب موت آپہنچے اور حتی کہ عالم برزخ (وہ جہان کہ جو اس عالم اور آخرت کے درمیان ہے) میں تھوڑا بہت لغزش کا امکان ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں لطف الہی انسان کی مدد کو آپہنچتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسے ثابت قدم رکھتا ہے۔

1. تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۵۴۰ و ۵۴۱۔

2. نور الثقلین، جلد ۲ ص ۵۳۵۔

۲۔ ثبات و استقامت کا اثر

۲۔ ثبات و استقامت کا اثر: شجرہ طیہ اور شجرہ خبیثہ کی تمام صفات مینسے کہ جو مندرجہ بالا آیات میں ذکر ہوئی ہیں سب سے زیادہ ثبات و عدم ثبات کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ شجرہ طیہ کے ثمر کے طور پر آخری زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا صاحب ایمان افراد کو اپنے ثابت قدم و مستحکم عقیدے کی بناء پر دنیا و آخرت میں ثابت قدم

رکھتا ہے۔ اس سے ثبات اور اس کی تاثیر کے مسئلے کی انتہائی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔  
عظیم لوگوں کی کامیابی کے عوامل کے بارے میں بہت گفتگو ہوتی ہے لیکن ان تمام میں سے استقامت و پامردی کا درجہ پہلا ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھ بوجھ اور استعداد کے لحاظ سے درمیانے درجے کے ہوتے ہیں یا عمل میں پیش قدمی کے لحاظ سے اوسط درجے کے ہوتے ہیں لیکن انہیں زندگی میں بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں ان کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کی کامیابیوں کی وجہ سے ثبات و استقامت کو ختم کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ اصولی طور پر حقیقی مومنین کو زندگی کے سخت حوادث اور طوفان کے مقابلے میں ان کے ثبات و استقامت کے حوالے سے پہچاننا چاہیے۔

۳۔ روایات اسلامی میں شجرہ طیہ اور شجرہ خبیثہ  
۳۔ روایات اسلامی میں شجرہ یبہ اور شجرہ خبیثہ : جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ”طیہ“ اور خبیثہ “ کہ جنہیں دو درختوں سے تشبیہ دی گئی ہے ایک وسیع مفہوم رکھتے ہیں اور یہ ہر طرح کے شخص، پروگرام، مکتب، فکر و نظر، سوچ بچار اور گفتار و عمل پر محیط ہے لیکن بعض اسلامی روایات میں اس کی خاص حوالوں سے تفسیر کی گئی ہے۔ واضح ہے کہ مفہوم آیت ان میں منحصر نہیں ہے۔  
ان میں سے ایک روایت امام صادق علیہ السلام مروی ہے آپ ”اصلها ثابت و فرعها فی السماء“ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

رسول اللہ اصلها و امیر المومنین فرعها ،  
و الائمه من ذریعتہما اغسانها ، و علم الائمه ثمرها ، و شیعہ المومنون ورقہا، هل فیہا فضل؟  
قال : قلت لا والله ،

قال و اللہ ان المومن لیولد فتورق ورقۃ فیہا و ان المؤمن لیموت فتسقطو ورقۃ منہا ۔  
رسول اللہ اس درخت کی جڑ ہیں۔ امیر المومنین علی (علیہ السلام) اس کا تنا ہیں اور وہ امام جو ان دونوں کی ذریت میں سے ہیں اس کی ٹہنیاں ہیں اور ائمہ کا علم اس درخت کا پھل ہے اور ان کے صاحب ایمان شیعہ اس کے پتے ہیں۔ پھر امام نے فرمایا کیا کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے؟  
راوی کہتا ہے : میں نے کہا نہیں، خدا کی قسم۔

فرمایا: و اللہ جس وقت ایک صاحب ایمان پیدا ہوتا ہے تو اس درخت پر ایک پتے کا اضافہ ہو جاتا ہے اور جس وقت کوئی حقیقی مومن مرجاتا ہے اور جس وقت کوئی حقیقی مومن مر جاتا ہے تو اس درخت کا ایک پتہ گر جاتا ہے۔ 3  
ایک روایت میں یہی مضمون امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ اس میں ہے :  
راوی نے سوال کیا : ”توتی اکلها کل حین باذن ربہا“ کا کیا مفہوم ہے۔

امام (علیہ السلام) نے فرمایا: ائمہ کے علم کی طرف اشارہ ہے کہ جو ہر سال اور ہر علاقے میں تم تک پہنچتا ہے۔ 4  
ایک اور روایت میں ہے :

”شجرہ طیہ“ رسول اللہ، علی، حسن اور حسین اور ان کے فرزند ان گرامی ہیں اور ”شجرہ خبیثہ“ بنی امیہ ہیں۔ 5  
نیز بعض روایات میں یہ بھی شرط ہے کہ ”شجرہ طیہ“ کھجور کا درخت ہے اور ”شجرہ خبیثہ“ حنظل (نمہ) کا درخت ہے۔ 6

بہر حال ان تفاسیر میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے۔ جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اور جو کچھ ہم نے آہ کے عمومی معنی میں ذکر کیا ہے اس میں ہم آپس میں موجود ہے کیونکہ یہ تو اس عمومی مفہوم کے مصادیق میں سے ہیں۔

.....

3. نور الثقلین ، جلد ۲ ص ۵۳۵۔ و ص ۵۳۸۔

4. نور الثقلین ، جلد ۲ ص ۵۳۵۔ و ص ۵۳۸۔

5. المیزان ، زیر بحث آیت کے ذیل میں ، بحوالہ تفسیر در منثور ۔

۲۸۔ اَلَمْ تَرَى اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحْلَوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۔

۲۹۔ جَهَنَّمَ يَصْلُوْنَهَا وَّيُسُّ الْقَرَارُ ۔

۳۰۔ وَّجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهِ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۔

ترجمہ

۲۸۔ کیا تو نے ( انہیں ) نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کی نعمت کو نا شکری میں بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے کی طرف کھینچ لے گئے ۔

۲۹۔ ( دار البوار وہی ) جہنم ہے کہ جس کی آگ میں وہ داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے ۔

۳۰۔ انہوں نے خدا کے ہمسر قرار دئیے تاکہ ( لوگوں کو ) اس کی راہ سے ( منحرف اور ) گمراہ کریں ۔ ان سے کہہ دو ( کہ چند دن دنیا کی زندگی ( اور اس کی لذتوں سے ) فائدہ اٹھا لو مگر بالآخر تمہیں ( جہنم کی ) آگ کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔

تفسیر

کفرانِ نعمت کا انجام

ان آیات میں روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف سے ہے ۔ دراصل ان میں شجرہ خبیثہ کے ایک موقع کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔

پہلے فرمایا گیا ہے : کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے نعمتِ الہی میں تبدیل کر دیا ہے ( اَلَمْ تَرَى اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا ) ۔

اور بالآخر انہوں نے اپنی قوم کو دار البوار اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا ( وَاَحْلَوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ) ۔

یہ وہی شجرہ خبیثہ کی جڑیں اور کفر و انحراف کے رہبر ہیں جن کے دامن میں نعمتیں تھیں مثلاً وجود ، پیغمبر کی سی نعمت کہ جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہ تھی ۔ چاہے تو یہ تھا کہ وہ ان سے استفادہ کرتے اور شب بھر میں سوسال کی مسافت طے کر لیتے لیکن اندھے تعصب ، ہٹ دھرمی ، خود غرضی اور خود پسندی کے سبب وہ اس عظیم ترین نعمت سے استفادہ نہ کر سکے ۔ وہ نہ فقط خود کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوئے بلکہ اپنی قوم کو بھی وسوسہ میں مبتلا کیا اور ہلاکت و بد بختی کی انہیں سوغات دی ۔

بزرگ مفسرین نے منابعِ اسلامی میں آنے والی روایات کے پیش نظر کبھی اس نعمت کو وجود پیغمبر کہا ہے ، کبھی ائمہ اہل بیت ( علیہ السلام ) اور کفرانِ نعمت کرنے والے کبھی بنو امیہ قرار دئیے ہیں کبھی بنی مغیرہ اور کبھی زمانہ پیغمبر کے سب کفار لیکن آیت کا مفہوم یقیناً وسیع ہے اور یہ کسی معین گروہ کے لئے مختص نہیں ہے اور اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی کسی نعمت کا کفران کریں ۔

ضمناً مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ خدائی نعمتوں خصوصاً عظیم ہادیوں اور رہبری کی نعمت کہ جو اہم ترین نعمتوں میں سے ہے ، سے استفادہ کرنا خود انسان کے فائدے میں ہے ۔ اب ان نعمتوں کا کفران اور آخری رہبری سے منہ پھیرنا سوائے ہلاکت اور دار البوار میں گرنے کے اور کچھ نہیں ہے ۔

اس کے بعد قرآن ”دار البوار“ کی تفسیر کرتا ہے : یہ جہنم ہے کہ وہ جس کے جلاڈالنے والے شعلوں میں جاگریں گے اور یہ بدترین ٹھکانا ہے ( جَهَنَّمَ يَصْلُوْنَهَا وَّيُسُّ الْقَرَارُ ) ۔ ۱۔

اگلی آیت میں کفرانِ نعمت کی ایک بدترین قسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ، کہ جس کے وہ مرتکب ہوتے تھے ۔ ارشاد ہوتا ہے : انہوں نے خدا کے لیے شریک قرار دیئے تاکہ اس طریقے سے لوگوں کو اس کی راہ سے گمراہ کریں ( وجعلوا للہ انداً لیسئلوا عن سبیلہ )

شرک و کفر اختیار کر کے اور لوگوں کو دین و طریق حق سے منحرف کر کے وہ لوگوں پر چند روزہ مادی اقتدار کوئی حاصل کرتے ہیں۔

اے رسول! ان سے کہو: اس ناپائیدار اور بے وقعت مادی زندگی سے فائدہ اٹھا لولیکن یہ جان لو کہ تمہارا انجام کار آگ ہے (وَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتُّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ)۔  
 نہ تمہاری یہ زندگی ہے بلکہ بدبختی ہے اور نہ تمہارا یہ اقتدار کوئی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تباہ کاری مصیبت ہے لیکن اس کے باوجود اپنے انجام کے بدلے تم اس سے فائدہ اٹھا لو۔  
 ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے:

قل تمتع بكفرک قليلاً انك من اصحاب النار  
 کہہ دو: اپنے کفر سے تھوڑا سا فائدہ اٹھالے آخر کار تو اصحابِ نار میں سے ہے۔ (زمر - ۸)

۱۔ ”یصلون“ ”صلی“ مادہ سے آگ جلانے، آگ میں جلنے، آگ میں مبتلا ہونے اور آگ میں جل کر کباب ہونے کے معنی میں ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ نعمت کو کفر میں بدل دیا:

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے نعمتِ الہی کا کفران کیا لیکن زیر بحث آیت میں ہے: انہوں نے نعمتِ خدا کو کفر میں تبدیل کیا اور کفران کیا۔ ہوسکتا ہے یہ خاص تعبیر دو میں ایک وجہ کی بناء پر ہو:  
 الف: مراد ہے ”شکر نعمت“ کو ”کفران“ میں تبدیل کرنا یعنی ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ پروردگار کی نعمتوں پر شکر گزار ہوں لیکن انہوں نے اس شکر کو کفران میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت میں لفظ شکر مقدر ہے اور تقدیر میناس طرح تھا، الذین بدلوا شکر نعمتہ اللہ کفرأ

ب: مراد یہ ہے کہ انہوں نے خود نعمت کو کفر میں تبدیل کر دیا۔ درحقیقت خدائی نعمتیں وسیلہ ہیں۔ ان سے استفادہ کا طریقہ کود انسان کے ارادہ سے وابستہ ہے۔ جیسا کہ ممکن ہے نعمتوں سے ایمان، خوش بختی اور نیکی کی راہ میں فائدہ اٹھایا جائے اسی طرح اہل کفر، ظلم اور برائی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یہ نعمتیں خام مال کی طرح ہیں جن میں سے مختلف قسم کی چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں اگر اصل میں یہ خیر و سعادت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔

۲۔ نعمت سے سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے:

کفرانِ نعمت صرف یہ نہیں کہ انسان خدا کی ناشکری کرے بلکہ نعمت سے ہر طرح کا انحرافی فائدہ حاصل کرنا اور سوئے استفادہ کفرانِ نعمت ہے۔ اصولی طور پر کفرانِ نعمت کی حقیقت یہی ہے۔ ناشکری اور شکر ادا نہ کرنا تو دوسرے مرحلے کی بات ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ نعمت کو اس مقصد کے مطابق صرف نہ کرنا جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے کفرانِ نعمت ہے اور زبانی شکر گزاری ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ ہزار مرتبہ زبان سے ”الحمد للہ“ کہیں لیکن عملی طور پر نعمت سے سوء استفادہ کریں تو کفرانِ نعمت اور رکیا ہے۔

دور حاضر میں نعمت کو کفران میں تبدیل کرنے کے انتہائی واضح نمونے دکھائی دیتے ہیں۔  
 فطرت کی بہت سے قوتیں انسان کی خدا داد بصیرت اور پیش قدمی کی وجہ سے انسان کے ہاتھ لگی ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کرنا اب انسان کی دسترس میں ہے۔

سائنسی انکشاف اور صنعتی ایجادات نے پوری دنیا کا رخ ہی بدل کر دکھ دیا ہے۔ ان انکشافات و ایجادات نے انسان کے کندھوں بہت بھاری بوجھ اتار کر کارخانوں کے پہیوں پر ڈال دیا ہے۔ آج نعماتِ الہی ہر دور سے زیادہ ہیں۔ آج انسان اپنے افکار اور عالم کو پوری دنیا میں پھیلا سکتا ہے۔ ساری دنیا کی خبروں سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ اب چاہیئے تو یہ تھا کہ اس دور میں لوگ ہر زمانے سے زیادہ خوشحال ہوتے، مادی لحاظ سے بھی اور روحانی لحاظ سے بھی۔  
 آج خدا نے ان عظیم نعمتوں کو کفر میں تبدیل کرنے کا راستہ اپنا یا گیا ہے۔ مادے کے عجیب و غریب توانائیوں کو ظلم و طغیان کی راہ میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ انکشافات و ایجادات کو برائی اور تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہر نیا صنعتی شاہکار پہلے تخریبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس کی تعمیری پہلو کی نوبت بعد کی بات ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ عظیم ناشکری ہے جو انبیاء الہی کی اصلاحی اور تربیتی تعلیمات سے دور رہنے کا نتیجہ ہے اور ایسا کرنے والے اپنی قوم کو نعمات الہی کا کفران کر کے اسے دار البوار کی طرف کھینچے لے جا رہے ہیں۔

۳۔ ”انداد“ کا مفہوم :

”انداد“ جمع ہے ”ند“ کی۔ اس کا معنی ہے ”مثل“ لیکن جیسا کہ راغب نے مفردات میں اور زبیدی نے تاج العروس میں (بعض اہل لغت سے) نقل کیا ہے ”ند“ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دوسری چیز سے شابت جو ہری رکھتی ہو لیکن ”مثل“ کا اطلاق ہر قسم کی شابت پر ہوتا ہے۔ لہذا ”ند“ کا استعمال ”مثل“ کی نسبت زیادہ عمیق، رسا اور عمدہ ہے۔ اس معنی کے مطابق زیر نظر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کفر کی کوشش تھی کہ خدا کے کچھ ایسے شریک بنائیں کہ جنہیں جوہر۔ ذہن میں خدا کا شبیہ قرار دیں تاکہ مخلوق کو خدا کی پرستش سے روک سکیں اور اس طرح اپنے منحوس مقاصد پورے کر سکیں۔

بعض اوقات وہ قربانیوں کا کچھ حصہ ان کے لئے قرار دیتے اور کبھی نعمات الہی کا کچھ حصہ (جیسے بعض جانور) بتوں کے لئے مخصوص کر دیتے اور کبھی پرستش و عبادت کے ذریعے انہیں خدا کا ہم پلہ خیال کرتے۔ سب سے بڑھ کر وقیح یہ بات تھی کہ زمانہ جاہلیت میں مراسم حج میں کہ جو دین ابراہیمی کے مطابق تھا اس میں انہوں نے بہت سی خرافات شامل کر دی تھیں یہاں تک کہ ”لیبیک“ کہتے ہوئے یوں کہتے تھے :

لیبیک لاشریک لک ،

الاشریک هولک ،

تملک و ماہلک ،

میں تیری دعوت کو قبول کرتا ہوں ، اے خدا کہ جس کا کوئی شریک نہیں۔

سوائے اس شریک کے کہ جو تیرا شریک ہے۔

اس کا بھی تو مالک ہے اور جس کا وہ مالک ہے اس کا بھی 1۔

.....

1۔ تفسیر فخر الدین رازی ، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 31-34

31- قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا يَبِيعُ فِيهِ وَلَا يَخْلَلُ۔  
 32. اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْفَلَكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْأَنْهَارَ۔  
 33 وَسَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔  
 34. وَأَتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ۔

ترجمہ

31۔ میرے ان بندوں سے کہہ دو کہ جو ایمان لائے ہیں کہ نماز قائم کریں اور ہم نے جو انہیں روزی دی ہے اس میں سے پنہاں و آشکار انفاق کریں ، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس میں خرید و فروخت ہے نہ دوستی ( نہ مال کے ذریعے عذاب خدا سے نجات مل سکے گی اور نہ کسی اور رمادی رشتے سے )۔

32۔ اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمان سے پانی نازل کیا ہے اس کے ذریعے تمہارے رزق

کے طور پر پہل اگائے ہیں اور کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ وہ اس کے حکم سے صفحہ دریا پر چلے اور نہریں بھی تمہارے لئے مسخر کی ہیں۔  
 ۳۳۔ منظم پروگرام کے ماتحت کام کرنے والے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے اور رات اور دن کو (بھی) تمہارے لئے مسخر کیا ہے۔  
 ۳۴۔ اور تم نے جس چیز کا اس سے تقاضا کیا تھا وہ اس نے تمہیں دے دی اور نعمتِ الہی کا شمار کرنے لگو تو ہرگز شمار نہیں کر سکو گے انسان ستمگر اور کفران کرنے والا ہے۔

تفسیر

قرآن کی نگاہ میں انسان کی عظمت

گزشتہ آیات میں مشرکین اور ان لوگوں کے طرز عمل کے بارے میں گفتگو تھی کہ جنہوں نے نعمتِ الہی کاکفران کیا اور آخر کار دار البوار کی طرف کھینچے گئے۔ زیر نظر آیات میں خدا کے سچے بندوں کا ذکر ہے اور اللہ کی بندوں پر نازل ہونے والی غیر متناہی نعمت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور ہم نے جو رزق دیا ہے اس میں سے پنہاں و آشکار خرچ کریں

(قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً)۔ اس کے پہلے کہ وہ دن آجائے کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے کہ اس طرح عذاب سے نجات کے لئے راہ سعادت خرید سکیں اور نہ وہاں کسی کی دوستی کام آئے گی (مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمَ لَا يَبِيعُ فِيهِ وَلَا يَخْلَى)۔

اس کے بعد معرفتِ خدا کے لئے اس کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے ایسی معرفت کہ جس سے دلوں میں اس کا عشق زندہ ہو جائے نیز انسان کو اس کی عظمت اور اس کے لطف کے حوالے سے اس تعظیم پر ابھارا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ مدد اور لطف و رحمت کرنے والے سے انسان کے دل میں لگاؤ اور محبت بیدار ہوتی ہے۔ یہی بات چند ایک آیات میں یہاں اس طرح بیان کی گئی ہے:-

خد اوبی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ)۔ اور اس نے آسمان سے پانی نازل کیا جس کے ذریعے تمہاری روزی کے لئے مختلف ثمرات پیدا ہوتے ہیں (وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ)۔

”اور اس نے تمہارے لئے کشتی کو مسخر کیا“ اس کے ساخت کے مواد کے لحاظ سے بھی کہ جسے طبیعتِ مادہ سے پیدا کیا اور سمندروں پر منظم ہواؤں کی صورت میں اس کی وقتِ محرکہ لحاظ سے بھی (وَسَخَّرَ لَكُمْ الْفُلُكَ)۔ تاکہ یہ کشتیاں اس کے حکم سے سطح سمندر پر چلیں“ اور پانی پر سینہ چیر کر ساحل مقصود کی طرف بڑھیں اور انسانوں اور ان کے وسائل ایک سے دوسری جگہ کی طرف آسانی سے اٹھالے جائیں (لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ)۔ اسی طرح ”نہریں بھی تمہارے لئے مسخر کر دی گئیں“ (وَسَخَّرَ لَكُمْ الْأَنْهَارَ) تاکہ ان کے حیات بخش پانی سے تم اپنی فصلونکی آبیاری کرو اور تم خود اور تمہارے مویشی اس سے سیراب ہوں۔ نیز اکثر اوقات کے لئے سطح آب کو ہموار رکھا گیا ہے تاکہ چھوٹی بڑی کشتیاں اس میں آمد و رفت کر سکیں۔ نیز نہریں مسخر کی گئی ہیں تاکہ تم ان کی مچھلیوں بلکہ یہاں تک کہ ان کی گہرائیوں میں موجود اصداغ سے استفادہ کر سکو۔

نہ صرف زمینی موجودات کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے بلکہ سورج اور چاند کو جو ہمیشہ مصروفِ کار ہیں انہیں تمہارے فرمان کے زیرِ گردش قرار دے دیا ہے (وَسَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ)۔ ۱۔  
 نہ صرف اس جہان کے موجودات کو تمہارے زیرِ فرمان کر دیا گیا ہے بلکہ ان کے عارضی حالات کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے جیسا کہ ”رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کیا گیا ہے“ (سَخَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ)۔ اور تم نے جس چیز کا اس سے تقاضا کیا اور فرد اور معاشرے کی روح اور بدن کے لئے تمہیں جس چیز کی احتیاج ہوئی یا اپنی سعادت کے لئے تمہیں جس چیز کی ضرورت پڑی وہ سب کچھ اس نے تمہارے اختیار میں دے دیا (وَأَتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا)۔

کیونکہ پروردگار کی مادی اور معنوی نعمتوں نے تمہارے وجود اور محیط زندگی کو اس طرح سے گھیر رکھا ہے ان کا شمار ممکن نہیں اور جن خدائی نعمتوں کو تم جانتے ہو وہ ان کے مقابلے میں جنہیں تم نہیں جانتے دریا کے مقابلے میں قطرے کی مانند ہیں لیکن خدا کے اس تمام لطف و رحمت کے باوجود یہ انسان ظالم ہے اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے (اِنَّ الْاِنْسَانَ اَطْلُوْمٌ كَفَّارٌ)۔

انسان کو ایسی نعمتیں عطا کی گئیں ہیں کہ اگر وہ ان سے صحیح استفادہ کرتا تو سارے جہاں کو گلستان بنا دیتا اور ”مدینہ فاضلہ“ کی تشکیل کا خواب پورا ہو جاتا لیکن سوئے استفادہ، ظلم و ستم اور کفرانِ نعمت کے سبب وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اس کی اس زندگی کا افاق تاریک ہو گیا، شہدِ حیات اس کے دہن میں جاں گداز زہر بن چکا ہے اور طاقت فرسا مشکلات نے طوق و زنجیر مشکلات نے طوق و زنجیر کے اسے جکڑ رکھا ہے۔

۱۔ ”دانیین“ ”دوب“ کے مادہ سے ایک عادت کے مطابق یا محکم سنت کے مطابق کام جاری رکھنے کے معنی میں ہے۔ سورج اور چاند چونکہ لاکھوں سال سے ایک معین و مستحکم طریقے سے نور افشانی کرنے، زندہ موجودات کی پرورش کرنے، سمندروں میں مدو جز پیدا کرنے اور کئی دوسری خدمات میں مصروف ہیں لہذا ان کے لئے ”دانیین“ سے بہتر تعبیر کا تصور نہیں ہوسکتا۔

چند اہم نکات

۱۔ خالق اور مخلوق سے رشتہ

۱۔ خالق اور مخلوق سے رشتہ : ان آیات میں ایک مرتبہ پھر سچے مومنین کے لائحہ عمل میں سے ”نماز“ اور انفاق“ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ بتدائی نظر سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام عملی پروگراموں میں سے یہاں صرف دو کاتذکرہ کیوں کیا گیا ہے۔

اس کی علت یہ ہے کہ اسلام کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کا خلاصہ تین میں پیش کیا جا سکتا ہے :

(۱) انسان کا خدا سے رابطہ۔

(۲) انسان کا مخلوق سے رابطہ۔

(۳) انسان کا اپنی ذات سے رابطہ۔

درحقیقت تیسرا حصہ پہلے حصے اور دوسرے حصے کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ دو پروگرام (نماز اور انفاق) دراصل انہی دو حصوں میں سے ایک ایک کی طرف اشارہ ہیں۔

نماز اللہ سے ہر قسم کے رابطے کا مظہر ہے کیونکہ نماز کے دوران یہ رابطہ دوسرے عمل کی نسبت زیادہ واضح ہوتا ہے۔ جب کہ انفاق مخلوق خدا سے رشتے کی طرف اشارہ ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر نعمتِ رزق میں سے

انفاق کا وسیع مفہوم پیش نظر رکھا جائے جس میں ہر طرح کی مادی و روحانی نعمت شامل ہے۔

البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس سورہ کی بحث جاری ہے وہ مکی ہے اور اس کے نزول کے وقت ابھی زکوٰۃ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس انفاق کو زکوٰۃ سے مر بوط نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جس میں نزولِ حکم کے بعد زکوٰۃ بھی شامل ہے۔

۲۔ انفاق، پنہان اور آشکار کیوں؟

۲۔ انفاق پنہان اور آشکار کیوں؟ ہم بار بار قرآنی آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ سچے مومنین پنہانی انفاق اور صدقہ کرتے ہیں اور آشکارا بھی۔ اس طرح سے انفاق کا وسیع معنی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کیفیت کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کیونکہ بعض اوقات مخفی انفاق زیادہ مؤثر اور زیادہ ابرومند دانہ ہوتا ہے اور بعض اوقات آشکار ہو تو دوسروں کی تشویق کا باعث بنتا ہے، اسلامی طرزِ عمل کے لئے نمونہ مہیا کرتا ہے اور شعائرِ دین کی تعظیم و تکریم شمار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ جسے کچھ دیا جا رہا ہو وہ لینے سے ناراحت ہوتا ہے۔

اس وقت جب کہ ہم خونخوار دشمن سے جنگ میں مصروف ہیں (یا کسی مسلمان قوم کو ایسی حالت کا سامنا ہو) تو اہل ایمان ہر روز جنگ زدگان یا مجروحین یا خود جنگجو یان کی امداد کے لئے مختلف قسم کا بہت زیادہ وہ سامان لے کر سرحدوں اور جنگی علاقوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور ان کی خبریں ذرائع ابلاغ سے نشر ہوتی ہیں ایک تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری ملت جنگ کرنے والوں کی پشت پر ہے اور دوسرا ان لوگوں کے لئے باعث تشویق ہوتا ہے جو اس قافلے

سے پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ جتنا جلدی ہو سکے وہ قافلے سے آملیں۔ واضح ہے کہ ایسے مواقع پر اعلانیہ انفاق زیادہ مؤثر ہے۔

ان دونوں میں فرق کے سلسلے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اعلانیہ انفاق واجبات کے ساتھ مربوط ہے کہ جس عام طور پر تظاہر کا پہلو نہیں ہوتا کیونکہ ذمہ داری کی ادائیگی سب پر لازم ہے اور اس میں کوئی پنہاں معاملہ نہیں لیکن مستحب انفاق چونکہ واجب سے زائد چیز ہے لہذا ہو سکتا ہے اس میں تظاہر یا ریا کا معاملہ بہتر ہے کہ اسے مخفی طور پر انجام دیا جائے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تفسیر کلی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ درحقیقت پہلی تفسیر کی ایک شاخ ہے۔

۳۔ اس دن ”بیع“ اور ”خلال“ نہیں ہے

۳۔ اس دن ”بیع“ اور ”خلال“ نہیں ہے : ہم جانتے ہیں کہ روز قیامت کی ماہیت و حقیقت یہ ہے کہ ہم اعمال کے نتائج اور رد عمل کا سامنا کریں گے۔ لہذا کوئی شخص وہاں عذاب سے نجات کے لئے کوئی فدیہ نہیں دے گا۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض روئے زمین کی ساری دولت اس کے قبضے میں ہو اور وہ اسے چرخ کر کے ذرہ بھر اپنے اعمال کی سزا کم کروانا چاہئے تو ممکن نہیں کیونکہ دارالعمل تو یہی دنیا ہے اور یہاں سے اس کا روزنامچہ مکمل ہو کر لپیٹا جاچکا ہے اور وہاں دارالحساب ہے، وہ محاسبہ کا گھر ہے۔ اسی طرح مادی دوسری کا رشتہ جس شخص سے جس صورت میں بھی ہو وہاں نجات بخش نہیں ہو سکتا۔ (توجہ رہے کہ ”خلال“ اور ”دوستی کے معنی میں ہے)۔

آسان لفظوں میں لوگ اس دنیاوی زندگی میں سزا سے بچنے کے لئے عام طور پر پیسے کا سہارا لیتے ہیں یا پارٹی اور دوستی کا ذریعہ استعمال کرتے ہیں یعنی رشوتوں اور رشتوں کے ذریعے سزا سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ سمجھیں کہ وہاں بھی اسی طرح کوئی صورت نکل آئے تو یہ ممکن نہیں۔ یہ ان کی بے خبری اور انتہائی نادانی کی دلیل ہے۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس آیت میں جس طرح کی دوستی کی نفی کی گئی ہے وہ عالم قیامت میں مومنین کی باہمی دوستی کے منافی نہیں ہے کہ جس کے بارے میں بعض آیات میں تصریح کی گئی ہے کیونکہ یہ تو ایمان کے زیر سایہ ایک معنوی دوستی مؤدت ہے۔

باقی رہا مسئلہ شفاعت تو جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ اس کامادی مفہوم نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں وارد ہونے والی صریح آیات کے پیش نظر یہ صرف، منعی اور روحانی رشتوں کے زیر سایہ بعض اعمال خیر کی وجہ سے حاصل ہونے والی اہلیت کے باعث میسر آتی ہے۔ اس کی تفصیل ہم سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۴ کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں۔ 2

.....

2. تفسیر نمونہ جلد اول ص ۱۸۷ اور تفسیر نمونہ جلد دوم ص ۱۵۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۴۔ اے انسان! تمام موجودات تیرے فرمان پر سر تسلیم خم ہیں

۴۔ اے انسان! تمام موجودات تیرے فرمان پر سر تسلیم خم ہیں : ان آیات میں دو بارہ زمین و آسمان کی مختلف موجودات کے انسان کے لئے تسخیر ہونے کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اس گفتگو کے چھ حصے ہیں۔

(۱) کشتیوں کی تسخیر

(۲) نہروں اور دریاؤں کی تسخیر

(۳) سورج کی تسخیر

(۴) چاند کی تسخیر

(۵) رات کی تسخیر

(۶) دن کی تسخیر

ان میں سے بعض کا تعلق آسمان سے ہے اور بعض (رات و دن) کادونوں سے۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر یاد دہانی ضروری ہے کہ انسان قرآن کی نگاہ میں اس قدر باعظمت ہے کہ اللہ کے حکم سے تمام موجودات اس کے لئے مسخر ہیں یعنی یا اس کے اختیار میں ہیں اور ان کے مہار اس کے ہاتھ میں ہے یا ان کی

حرکت انسان کی خدمت کے لئے اور اس انسان کو ہر حالت میں اس قدر عظمت حاصل ہے کہ تمام آفرینش کا یہ ایک بدف عالی بن گیا ہے ۔

سورج اس کے لئے نور افشانی کرتا ہے ، اس کا بستر حیات گرم کرتا ہے ، اس کے لئے طرح طرح کی نباتات اور پودے اُسگاتا ہے ، اس کی زندگی کے ماحول کو ضرر رساں جراثیم سے پاک کرتا ہے ، اسے مسرت و شادمانی کا پیغام دیتا ہے اور اسے راہ حیات کی نشاندہی کرتا ہے ۔

چاند انسان کی تاریک راتوں کا چراغ ہے یہ طبیعی ، فطری اور جاوداں تقویم ہے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والا جوار باٹا انسان کی بہت سی مشکلات حل کرتا ہے ۔

سمندروں اور دریاؤں سے جاری نہروں کا پانی اوپر آجات ہے ۔ یہ بہت سے درختوں کی آبیاری کرتا ہے ۔ خاموش ، ساکن اور رکے ہوئے سمندروں کو حرکت میں لے آتا ہے اور اسے گندا اور متعفن ہونے بچاتا ہے ۔ اور موجوں کے اٹھنے سے دریاؤں اور سمندوں کے زندہ موجودات کے لئے ضروری آکسیجن میسر آجاتی ہے ۔

ہوائیں بحری جہاز اور کشتیاں سمندر کے سینے پر چلاتی ہیں ۔ وسیع ترین شاہراہ انہیں سمندروں میں رواں دواں ہوتے ہیں ۔

دریا اور نہریں انسان کی خدمت گزار ہیں ۔ یہ زراعت کی آبیاری ، جانوروں کی سیرابی اور ماحول زندگی کو تازہ رکھنے کے لئے ہیں یہاں تک کہ خود ان میں انسان کے لئے مچھلیوں کی صورت میں غذائی مواد پل رہا ہوتا ہے ۔ تاریکی شب انسان کو لباس کی طرح ڈھانپ دیتی ہے ، اسے سکون و راحت پہنچاتی ہے اور سورج کی جلانے والی حرارت سے اس طرح بچاتی ہے جیسے سائے میں پنکھے کی ہوا رات انسان کو حیات تازہ بخشتی ہے ۔

اسی طرح دن کی روشنی انسان کو اٹھ کھڑا ہونے اور سعی و کوشش کی دعوت دیتی ہے اور اس کے اندر گرمی اور حرارت پیدا کرتی ہے اور ہر مقام پر جنبش و حرکت انسان کی فرمانبردار ہیں ۔ ان تمام نعمتوں کا بیان اور ان کی وضاحت انسان میں ایک نئی روح پھونکنے کے علاوہ اسے اسکی عظمت سے آگاہ کرتی ہے اور اس میں احساس تشکر ابھارتی ہے ۔ اس گفتگو سے ضمنی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآنی لغت میں تسخیر دوعمانی کے لئے آتا ہے ۔

ایک انسان کے مفادات اور مصالح کے لئے مصروف خدمت ہونے ( جیسے سورج اور چاند کی تسخیر ) اور دوسرا انسانی اختیار ہونے ( مثلاً کشتیوں اور دریاؤں کی تسخیر کے معنی میں آیا ہے ۔ اور یہ جو بعض کا خیال ہے کہ یہ آیات موجودہ زمانے میں تسخیر کے اصطلاحی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں ( جیسے خلائی سفر کے ذریعے تسخیر مابتاب )، یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا ۔ کیونکہ بعض قرآنی آیات میں ہے ،

وسخر لكم السموات و ما فی الارض جمیعاً منہ

جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے ۔ ( جا ئیہ ۔ ۱۳ )

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ وہ تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور تمام چیزیں زمین میں ہیں انسان کے لئے مسخر ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ فضا نوردوں کا تمام آسمانی کرات میں پہنچنا قطعاً محال ہے ۔

قرآن میں بعض دوسری آیات ہیں کہ جو ممکن ہے اس قسم کی تسخیر کی طرف اشارہ ہوں ۔ اس کے بارے میں ہم انشاء اللہ سورہ رحمن کی تفسیر میں بحث کریں گے ۔

( موجودات کے انسان کے سامنے مسخر ہونے کے بارے میں سورہ رعد کی آیت ۲ کے ذیل میں بھی بحث کی جائے گی ) ۔

۵۔ دائین

۵۔ دائین: ہم کہہ چکے ہیں کہ ”دائب“ مادہ ”دوب“ سے ہے اس کا معنی ہے ایک عادت ی محکم سنت کے مطابق کا جاری رکھنا ۔ البتہ سورج زمی کے گرد حرکت نہیں کرتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ

سورج ہمارے گرد گھومتا ہے لیکن ”دائب“ کے معنی جگہ میں حرکت کرنے کا مفہوم نہیں ہے بلکہ کسی کام کو مسلسل جاری رکھنے کا مفہوم اس میں مضمحل ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سورج اور چاند نور افشانی کرتے ہیں اور نشور نما کا ذریعہ

ہیں ۔ کرۂ زمین اور انسانوں کے لئے ان کا یہ پروگرام مسلسل پوری طرح منظم ہے ( اور اس بات کو فراموش نہ کیجئے گا کہ ”دائب“ کا ایک معنی عادت بھی ہے ) ۔ 1

.....

۱۔ البتہ موجودہ زمانے کے بارین سورج کی دوسری قسم کی گردش کے قائل ہیں ۔ مثلاً وہ اپنے مدار کے گرد گھومتا ہے اور جس

نظامِ شمسی سے اس کا تعلق ہے اس کے ساتھ اس کہکشاں کے اندر حرکت کرتا ہے جس میں وہ موجود ہے ۔

۶۔ جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے ؟

۶۔ جو کچھ ہم خدا سے چاہتے ہیں کیا وہ دیتا ہے ؟ زیر بحث آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ :

خدا نے تم پر لطف کیا اور جو کچھ تم نے اس سے طلب کیا اس کا کچھ حصہ تمہیں دیا ۔

( توجہ رہے کہ ” من کل ما سألتموه“ میں ”من“ تبعضیہ ہے ) ۔

یہ اس بناء پر ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان خدا سے کوئی چیز چاہتا ہے کہ جس میں یقینی طور پر اس کا نقصان بلکہ بعض اوقات ہلاکت پنہان ہوتی ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے لیکن عالم ، حکیم اور رحیم خدا ابر گز اس قسم کا تقاضا پورا نہیں کرتا اور اس کی بجائے شاید بہت سے مواقع پر انسان اپنی زبان سے خدا سے کوئی چیز طلب نہیں کرتا لیکن زبان حال سے اور اپنی فطرت سے اس کی تمنا کرتا ہے اور خدا اسے دے دیتا ہے اور کوئی مانع نہیں کہ ”ما سألتموه“ میں زبان حال کا تقاضا بھی شامل ہو اور زبان حال کی آرزو بھی ۔

۷۔ اس کی نعمتیں کیوں قابلِ شمار نہیں

۷۔ اس کی نعمتیں کیوں قابلِ شمار نہیں : یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارا وجود سر تا پا اس کی نعمتوں میں مستغرق ہے ۔ اگر

مختلف طبیعی علوم ، علمِ عمرانیات ، علمِ نفسانیات اور علمِ نباتات وغیرہ کی کتب کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان

نعمتوں کا دامن کسی قدر وسیع ہے ۔ اصولی طور پر ایک عظیم ادیب کے بقول ہر سانس میں دو نعمتیں موجود ہیں اور ہر

نعمت پر شکر واجب ہے ۔

اس سے قطع نظر ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان کے بدن میں اوسطاً دس ملین ارب زندہ خیلے موجود ہیں ان میں سے ہر ایک

ہمارے فعال بدن کا حصہ ہے ۔ یہ عدد اس قدر بڑا ہے کہ اگر ہم ان خلیوں کو گننا چاہیں تو سینکڑوں سال در کار ہیں اور پھر

یہ تو ہم پر خدائی نعمتوں کا صرف ایک حصہ ہے ۔ لہذا اگر ہم واقعاً اس کی نعمتوں کو گننا چاہیں تو یہ ہمارے بس کی بات

نہیں ( و ان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوها ) ۔

انسان کے خون میں دو قسم کے گلوبل ہیں (1) Globules

ہوتے ہیں ۔ سرخ گلوبل کئی ملین ہیں اور اسی طرح سفید گلوبل بھی ۔ سرخ گلوبل بدن کے خلیوں کی سوخت و ساز کے

لئے آکسیجن پہنچاتے ہیں اور سفید گلوبل انسان کی صحت و سلامتی کی حفاظت کرتے ہیں اور جب جراثیم جسم پر حملہ

آور ہوتے ہیں تو یہ اپنا کردار ادا کرتے ہیں ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ بغیر کسی استراحت اور آرام کے ہمیشہ خدمت

انسان کے لئے کمر بستہ رہتے ہیں ۔

.....

۱۔ چھوٹے چھوٹے زندہ موجودات جو خون میں تیرے ہیں اور زندگی کے بارے میں بھاری ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے ۔

۸۔ افسوس کہ انسان ”مظلوم“ اور ”کفار“ ہے

۸۔ افسوس کہ انسان ”مظلوم“ اور ”کفار“ ہے : گزشتہ مباحث سے ہم اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ خدا نے تمام موجودات

کو حکم انسان کے سامنے مسخر کر دیا ہے اور اس قدر نعمتیں اسے عطا کر دی ہیں کہ اب کسی پہلو سے اس کے لئے

کوئی کمی نہیں لیکن یہ انسان نورِ ایمان سے اور تربیت سے دور رہنے کی بناء پر طغیان اور ظلم و ستم کے راستے پر

قدم رکھتا ہے اور کفرانِ نعمت میں مشغول ہوجاتا ہے ۔

خود غرض افراد کی کوش ہوتی ہے کہ خدا کی وسیع و عریض نعمتوں کو اپنے لئے منحصر کر لیں اور زمین کے وسائل

حیات پر اپنا قبضہ جمالیں وہ خود تو تھوڑی سی مقدار کے علاوہ صرف نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود دوسروں کو

ان تک پہنچنے سے محروم رکھتے ہیں ۔

یہ مظالم جو خود غرضی ، استعمار اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اس کی زندگی کے پر

سکون ماحول کو طوفانوں کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ ان کے باعث جنگیں برپا ہوتی ہیں ، خون بہتا ہے اور اموال و نفوس کی

ہلاکت کا سامنا پڑتا ہے ۔

در حقیقت قرآن کہتا ہے : اسے انسان ! تریے دستِ اختیار میں تمام چیزیں اس قدر ہیں جو کافی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تو

”ظلم“ اور ”کفار“ نہ بنے، اپنے حق پر قناعت کرے، دوسروں کے حقوق پر تجاوز نہ کرے اور رکسی کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالے۔

## تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 35-41

- ۳۵۔ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِي وَّ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ -۳۶ رَبِّ اِنَّهُمْ اضْلَلُّنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ وَّ مَنْ عَصٰنِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ -  
 ۳۷۔ رَبَّنَا اِنِّىْ اَسْكَنْتُ مِنْ دُرِّيْتِىْ بُوَادٍ غَيْرِ ذٰى زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰةَ فَاجْعَلْ اَفْنِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوٰى اِلَيْهِمْ وَّ ارْزُقْهُمْ مِّنَ النَّمْرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ -  
 ۳۸۔ رَبَّنَا اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نَخْفٰى وَّ مَا نُعْلِنُ وَّ مَا يَخْفٰى عَلٰى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِى الْاَرْضِ وَّ لَا فِى السَّمٰوٰتِ -  
 ۳۹۔ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ وَهَبَ لِيْ عَلٰى الْكَبِيْرِ اِسْمَاعِيْلَ وَّ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّىْ لَسَمِيْعُ الدُّعٰءِ -  
 ۴۰۔ رَبِّ اجْعَلْنِىْ مُقِيْمَ الصَّلٰةِ وَّ مِنْ دُرِّيْتِىْ رَبَّنَا وَّ تَقَبَّلْ دُعٰءِ -  
 ۴۱۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَّ لِوَالِدَيَّْ وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ۔

ترجمہ

- ۳۵۔ وہ وقت (یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: پروردگارا، اس شہر (مکہ) کو شہر امن قرار دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔  
 ۳۶۔ پروردگارا! انہوں (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ پس جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا اور مہربان ہے۔  
 ۳۷۔ پروردگارا! میں نے اپنی اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب و گیاه زمین میں ٹھہرایا ہے تاکہ نماز قائم کریں تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف موڑ دے اور انہیں ثمرات میں سے رزق دے شاید وہ تیرا شکر بجا لائے۔  
 ۳۸۔ پروردگارا! جو کچھ ہم چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں تو اسے جانتا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی چیز اللہ پر مخفی نہیں ہے۔  
 ۳۹۔ حمد ہے اس اللہ کی جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کئے یقیناً میرا خدا دعا سنتا ہے (اور قبول کرتا ہے)۔  
 ۴۰۔ خدا یا! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی ایسا کر۔ پروردگارا! (ہماری) دعا قبول فرما۔  
 ۴۱۔ پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو اور تمام مومنین کو اس روز بخش دینا جب حساب قائم ہوگا۔

تفسیر

ابراہیم (علیہ السلام) بت شکن کی اصلاحی دعائیں

گذشتہ آیت میں سچے مومنین اور نعمات الہی کا شکر ادا کرنے والوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیت میں راہ خدا میں استقامت دکھانے والے اور اس کے عبد شاکر ابراہیم (علیہ السلام) کی کچھ دعائیں بیان کی گئی ہیں تاکہ گذشتہ تمام بحثوں کی تکمیل ہو جائے اور یہ امر خدائی نعمتوں سے بہترین فائدہ اٹھانے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے نمونہ بن جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے : وہ وقت یاد کرو جب جب ابراہیم (علیہ السلام) نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا : پروردگارا ! اس شہر ( مکہ ) کو سر زمین امن و امان قرار دے ( وَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا ) اور مجھ پر میرے بیٹے پر اپنا لطف و عنایت فرما اور بتوں کی پرستش سے دور رکھ ( وَ اجْنُبْنِي وَ بَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ ) - کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بت پرستی کتنی بڑی مصیبت اور گھروں کو ویران کرنے والی ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس راستے میں برباد ہونے والوں کو دیکھا ہے -

پروردگارا ! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے ( رَبِّ انْهِنُّنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ) - گمراہ بھی کیسی خطرناک کہ جس میں وہ اپنی عقل و خرد تک گنوا بیٹھتے ہیں -

میرے اللہ میں تیری توحید کی دعوت دیتا ہوں اور سب کو تیری طرف پکارتا اور بلاتا ہوں - ” جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے اگر وہ قابل ہدایت اور بخشش ہے تو اس کے بارے میں محبت و احسان فرما کیونکہ تو بخشنے والا مہربان ہے “ ( فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَ مَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ كَافِرٌ بِي ) -

در اصل ان الفاظ میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بارگاہ خداوندی میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر میری اولاد بی راہ توحید سے منحرف ہو جائے اور بت پرستی کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ مجھ سے نہیں ہے اور اگر غیر اس راستے پر گامزن ہو جائیں تو وہ میرے بیٹوں اور بانیوں اور بھائیوں کی مانند ہیں -

حضرت کی یہ مؤدیانہ اور انتہائی محبت آمیز تعبیر اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ یہ نہیں کہتے کہ جو شخص میری نافرمانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے اور اسے اس طرح یا اس طرح سزا دے بلکہ کہتے ہیں :- جو شخص میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا اور مہربان ہے -

پھر اپنی دعا اور درخواست جاری رکھتے ہیں : پروردگارا ! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے گھر کے پاس کہ جو تیرا حرم ہے بے آب و گیہ سر زمین میں ٹھہرایا ہے تاکہ وہ نماز قائم کرے ( رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ )

یہ اس وقت کی بات ہے جب خدا نے انہیں ان کی کنیز باجرہ سے فرزند عطا کیا - جس کا نام انہوں نے اسماعیل رکھا - اس پر ان کی پہلی بیوی سارہ کے دل میں حسد پیدا ہو گیا - وہ باجرہ اور ان کے بیٹے کی موجودگی برداشت نہ کر سکی - اس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے تقاضا کیا کہ اس ماں بیٹے کو کہیں اور لے جائے - حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمان خدا پر یہ بات مان لی اور اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے کر سرزمین مکہ میں چلے آئے - ان دنوں یہ علاقہ بالکل خشک بنجر اور ویران تھا - آپ نے انہیں وہاں ٹھہرایا اور خدا حافظ کہہ کر چلے آئے -

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس گرم اور تپتی ہوئی زمین پر ماں اور بیٹے کو پیاس لگی - باجرہ نے اپنے ننھے سے بچے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی -

دوسری طرف خدا کا ارادہ تھا کہ یہ سرزمین ایک عظیم مرکز عبادت بنے اس موقع پر زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا - تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صحرا نورد قبیلہ ” جرہم “ وہاں سے گزرا - اسے سارے ماجرے کا پتہ چلا - اس نے وہیں پڑاؤ ڈال لیا اور مکہ آہستہ آہستہ ایک آبادی کی شکل اختیار کرنے لگا -

اس کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی دعاء کو اس طرح سے جاری رکھا : اب جبکہ وہ تیرے عظیم گھر کے احترام میں اس جلا ڈالنے والے بیابان میں سکونت پذیر ہو گئے ہیں تو تو کچھ لوگو کا دل ان کی طرف موڑ دے اور ان کی محبت ان کے دلوں میں ڈال دے ( فَاجْعَلْ أَفْنَدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوَى إِلَيْهِمْ ) اور انہیں طرح طرح کی ( مادی و معنوی ) ثمرات سے بہرہ مند کر دے ، شاید وہ تیری نعمتوں کا شکر ادا کرے ( وَ ارزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ) -

ایک موحد اور آگاہ انسان جانتا ہے کہ علم الہی کے مقابلے میں اس کا علم محدود ہے اور اس کے مصالح کو صرف خدا جانتا ہے ، اکثر وہ خدا سے ایسی چیزوں کا تقاضا کرتا ہے جو اس کے لئے قرین مصلحت نہیں ہوتیں اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جن میں اس کی مصلحت ہے لیکن وہ ان کے لئے درخواست نہیں کرتا اور کبھی اس کے دل کی آرزوئیں ہوتی ہیں کہ جن سب کو وہ زبان پر نہیں لا سکتا لہذا مذکورہ دعاؤں اور تقاضوں کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) یوں عرض کرتے ہیں پروردگارا ! تو ان سب چیزوں سے اچھی طرح آگاہ ہے جنہیں ہم چھپاتے ہیں یا آشکار کرتے ہیں ( رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ) اور زمین و آسمان میں کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں ہے ( وَ مَا يُخْفِي عَلَى اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَاءِ ) -

اگر میں اپنے بیٹے اور بیوی کے فراق میں غمگین ہوں تو تو جانتا ہے اور اگر آشکار بھی میری آنکھ سے آنسوں جھلکتے ہیں تو تو انہیں دیکھتا ہے - اور اگر فراق میرے دل پر چھایا ہوا ہے تو بھی تو جانتا ہے اور تیرے حکم کی اطاعت سے میرا دل ساتھ ساتھ مطمئن بھی ہے تو بھی تجھے خیر ہے -

اور اگر وقت جدائی میری بیوی مجھ سے کہتی ہے :  
الی من تکلنی ؟

مجھے کس کے سہارے چھوٹے جاتے ہو ؟  
تو اس سے بھی تو آگاہ ہے ۔

تو ان سب چیزوں سے آگاہ ہے ۔ اس سر زمین اور ان کا مستقبل ایک دوسرے سے مضبوطی سے بندھا ہوا ہے ، یہ سب تیری بارگاہ علم میں روشن ہے ۔

اس کے بعد نعمات پروردگار کے شکر کی طرف اشارہ ہے ۔ ان میں سے اہم ترین یہ تھی کہ پروردگار نے عالم پیری میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو دو ابرو مند بیٹے اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے تھے بارگاہ ایزدی میں عرض کرتے ہیں : حمد و سپاس ہے اس اللہ کے لئے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق بخشے (الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَ إِسْحَاقَ) ۱

جی ہاں ! یقیناً میرا خدا دعاؤں کو سنتا ہے (إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعُ الدُّعَاءِ) ۔

پھر بھی درخواست اور دعا جاری رکھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں پروردگار ! مجھے نماز قائم کرنے والا قرار دے اور اے میرے خدا ! میری اولاد میں سے بھی اسی طرح قرار دے (رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي) پروردگار ! میری دعا قبول کر لے (رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَاءِ) ۔

اور آخری تقاضا ابراہیم (علیہ السلام) نے یہ کیا : پروردگار ! مجھے ، میرے ماں باپ کو سب مومنین کو اس روز بخش دے نا جس دن حساب قائم ہو

(رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ) ۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا مکہ اس وقت شہر تھا ؟

۱۔ کیا مکہ اس وقت شہر تھا ؟ زیر نظر آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) اچانک عرض کرتے ہیں کہ خدا وندا ! میں اپنے بیٹے کو ایک ایسی سر زمین میں چھوڑ رہا ہوں جہاں پانی ہے نہ آبادی اور نہ زراعت۔ یقیناً یہ سر زمین مکہ میں ورود کا آغاز ہے کہ جب پانی تھا نہ آبادی ، نہ مکان تھا نہ مکین ۔ صرف خانہ خدا کے باقی ماندہ آثار تھے جو وہاں دکھائی دیتے تھے اور کچھ خشک اور بے آب و گیاه پہاڑ تھے ۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اس علاقہ کا یہی ایک سفر نہ کیا تھا ۔ اس کے بعد بھی آپ نے اس سر زمین مقدس پر بار بار قدم رکھا جبکہ تدریجاً مکہ شہر کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا ۔ قبیلہ ”جرہم“ وہاں سکونت اختیار کر چکا تھا ۔ چشمہ زمزم پیدا ہونے پر علاقہ ربانث کے قابل ہو چکا تھا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی یہ دعائیں ان کے کسی بعد کے سفر سے تعلق رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کہتے ہیں : خدا وندا ! اس شہر کو جاء امن و امان قرار دے ۔

اور یہ جو وادی ”غیر ذی زرع“ کہا ہے تو یہ یا گزشتہ زمانے کی بات کر رہے ہیں اور اپنے پہلے سفر کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور یا اس طرف اشارہ ہے کہ سر زمین مکہ ایک شہر بن جانے کے بعد بھی نا قابل زراعت ہے لہذا اس کی ضروریات باہر سے آنا چاہئیں کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے یہ علاقہ خشک پہاڑوں پر مشتمل ہے جہاں پانی بہت کم ہے ۔

۲۔ مکہ سر زمین امن

۲۔ مکہ سر زمین امن : یہ بات جاذب نظر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سر زمین میں جو سب سے پہلی دعا کی وہ (امن) کے لئے تھی ۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ امن کی نعمت انسانی زندگی کے لئے ، کسی جگہ قیام کرنے کے لئے اور ہر قسم کی تعمیر آبادی اور ترقی کے لئے پہلی شرط ہے اور ہے بھی ایسا ہی ۔ اگر کسی جگہ امن و امان نہ ہو تو وہ رہنے کے قابل نہیں اگرچہ دنیا کی تمام نعمتیں وہاں موجود ہوں ۔ اصولی طور پر وہ شہر ، آبادی اور ملک کہ جو امن کی نعمت سے محروم ہو گویا وہ تمام نعمتیں کھو بیٹھا ہے ۔

یہاں اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کے امن کے بارے میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام)

کی دعا کو دو طرح سے قبول کیا ہے۔ اسے امنیت تکوینی بھی دی کیونکہ یہ ایسا شہر ہو گیا کہ جس نے پوری تاریخ میں امن کے لئے تباہ کن حوادث بہت کم دیکھے ہیں اور اسے امنیت تکوینی بھی دی۔ یعنی خدّٰا نے حکم دیا ہے کہ تمام انسان بلکہ جانور تک اس زمین میں امن و امان میں رہیں۔ یہاں کے جانوروں کا شکار کرنا ممنوع ہے۔ 2

۱۔ جب حضرت اسماعیل (علیہ السلام) اور حضرت اسحاق (علیہ السلام) پیدا ہوئے اس وقت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی عمر کیا تھی۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) ۹۹ سال کے تھے کہ پہلے فرزند اسماعیل (علیہ السلام) پیدا ہوئے اور ۱۱۲ سال کے تھے جب اسحاق (علیہ السلام) نے آنکھ کھولی۔ بعض نے اس سے کم اور بعض نے زیادہ عمر لکھی ہے تاہم یہ مسلم ہے کہ اس وقت آپ کی عمر اتنی تھی کہ معمولاً اس عمر میں بچے کی پیدائش بہت بعید معلوم ہوتی تھی۔ 2۔ اس وقت جبکہ ہم تفسیر کے اس حصہ کو مرتب کر رہے ہیں امت اسلامی پر ایک نہایت اندوہناک سانحہ گزرا ہے۔ سر زمین حرم پر اطراف خانہ خدا میں سعودی پولیس نے وحشت و درندگی کی انتہا کر دی۔ اس نے ایرانی حاجیوں پر گولی چلائی۔ سیکڑوں عورتیں بچے بوڑھے شہید ہو گئے۔ ایک انتہائی منظم پر امن اور با وقار جلوس پر یہ ظلم صرف اس ”جرم“ ہو گیا کہ وہ عالمی طاغوتی طاقتوں امریکہ، روس اور اسرائیل کے خلاف اظہار نفرت کر رہے تھے یہ واقعہ ان دنوں میں ہوا جب خلیج فارس میں امریکہ نے کھلم کھلا فوجی مداخلت شروع کر دی ہے تاکہ ایران کے اسلامی انقلاب سے اپنی رسوائی سے بدلا لے سکے۔ ایسے میں جبکہ مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط استعماری ایجنٹوں، فوجی آمروں اور بادشاہوں نے ایران کی اسلامی حکومت کے خلاف ایسا کر لیا ہے اور سب امریکہ سے تعاون پر کمر بستہ ہیں۔ سوادیوں نے نہ فقط سر زمین کعبہ کو اسلام کے صریح احکام کے خلاف زائرین حرم کے خون سے لالہ زار بنایا بلکہ ایسا پوری دنیا میں ان مظلوموں کے خلاف پراپیکنڈہ کیا۔ صہیونیت اور استعماری قوتوں کے تمام نشریات ادارے ان مظلوموں کے خلاف استعمال ہوئے۔ قاتلوں کو امن کا محافظ اور مشرکین اور دشمنان اسلام کے خلاف فریاد کرنے والوں کو امن کا دشمن قرار دیا گیا۔

سعودی ایسا کیوں نہ کرتے کیوں کہ یہ اسی یزید اور حجاج کے افکار کے وارث ہیں جنہوں نے خانہ خدا کی حرمت پامال کی تھی (ثاقب) (اگست ۱۹۸۷ء)۔ یہاں تک کہ جو مجرم اس حرم اور خانہ خدا میں پناہ لیں ان کا تعاقب بھی جائز نہیں۔ ایسے مجرمین کا صرف پانی بند کیا جا سکتا ہے تا کہ وہ باہر نکل آئیں اور سر تسلیم خم کر دیں۔

۳۔ ابراہیم (علیہ السلام) بت پرستی سے دوری کی دعا کیوں کرتے ہیں؟

۳۔ ابراہیم (علیہ السلام) بت پرستی سے دوری کی دعا کیوں کرتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ابراہیم (علیہ السلام) معصوم نبی تھے اور ان کے بلاواسطہ بیٹے جو آیت کے لفظ ”بنی“ کے یقینی مصداق ہیں یعنی اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) بھی معصوم پیغمبر تھے اس کے باوجود وہ تقاضا کرتے ہیں: خدا یا مجھے اور انہیں بتوں کی پوجا سے دور رکھ!

یہ بات بت پرستی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تاکید کے لئے دلیل ہے۔ یہاں تک کہ معصوم نبی اور بت شکن بھی اس سلسلہ میں خدا سے دعا کرتے ہیں۔ یہ بعینہ پیغمبر اسلام کی طرف سے اپنی وصیتوں میں حضرت علی (علیہ السلام) یا دوسرے ائمہ کو جو ان کے جانشین تھے انہیں نماز کی تاکید کرنے کے مشابہ ہے جبکہ ان کے بارے میں ترک نماز کا احتمال کا ہر گز کوئی مفہوم نہیں بلکہ اصولی طور پر نماز ان کی سعی و کوشش سے برپا ہوئی ہے۔ تو اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے کس طرح سے کہا کہ پروردگارا! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے حالانکہ وہ پتھر اور لکڑی کے سوا کچھ نہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:

اولاً بت ہمیشہ پتھر اور لکڑی کے نہیں ہوتے تھے بلکہ کبھی فرعون اور نمرود جیسے افراد لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیتے تھے اور اپنے آپ کو ”رب اعلیٰ“ ”زندہ کرنے والا“ اور ”مارنے والا“ کی حیثیت سے متعارف کرواتے تھے۔

ثانیاً بعض اوقات پتھر اور لکڑی کے بتوں کو ان کے متولی اور کارندے اس طرح سے آراستہ و پیراستہ کرتے اور ان کے لئے ایسے احترامات بجا لاتے کہ وہ واقعاً سادہ لوح عوام کے لئے گمراہ کن ہو جاتے تھے۔

۴۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے تابع کون ہیں؟

۴۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے تابع کون ہیں؟ زیر بحث آیات میں ہے کہ ابراہیم کہتے ہیں: خدا وندا! وہ لوگ جو میری پیروی اور اتباع کرتے ہیں۔

یہاں سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیرو کار صرف وہ لوگ تھے جو ان کے زمانے میں

تھے یا ان کے بعد ان کے دین پر تھے یا ساری دنیا کے توحید پرست اور خدا پرست اس میں شامل ہیں کیونکہ ابراہیم (علیہ السلام) توحید اور بت شکنی کی علامت اور نمونہ ہیں۔

قرآنی آیات میں ملت اسلامیہ اور دین اسلام کو ملت و دین ابراہیمی کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا ہے۔ 1  
اس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دعاء تمام توحید پرستوں اور راہ توحید میں جد و جہد کرنے والوں کے لئے ہے۔

ائمہ اہلبیت (علیہ السلام) سے مروی روایات میں بھی اس تفسیر کی تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔ آپ (علیہ السلام) فرماتے ہیں:

من احبنا فهو منا اهل البيت قلت: جعلت فداك منكم قال: منا والله اما سمعت قول ابراهيم! "من تبعني فانه مني"  
جو شخص ہم سے محبت رکھے (اور اہل بیت پر چلے) وہ ہم میں سے ہے۔

راوی نے پوچھا: میں آپ پر قربان، واقعاً آپ میں سے ہے؟  
فرمایا: واللہ ہم میں سے ہے۔ کیا تم نے ابراہیم کی گفتگو نہیں سنی جو کہتے ہیں من تبعنی انہ منی (جو شخص میری اتباع کرے وہ مجھ سے ہے) 2

یہ حدیث نشاندہی کرتی ہے کہ کسی مکتب کی پیروی اور اس کے پروگرام میں سے تعلق کسی خاندان سے روحانی طور پر تعلق ہونے کے مترادف ہے۔

ایک اور حدیث میں امام امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

نحن آل ابراهيم افترغون عن ملة ابراهيم و قد قال الله تعالى فمن تبعني فانه مني

ہم آل ابراہیم ہیں۔ تو کیا ابراہیم کی ملت اور دین سے منہ موڑتے ہو؟ حالانکہ خداوند عالم (ابراہیم کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا:

جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے۔

۱. حج ۷۸۔

2. تفسیر نور الثقلین، جلد ۲ ص ۵۴۸۔

۵. وادی - "غیر ذی زرع" اور خدا کا پر امن حرم

۵. وادی - "غیر ذی زرع" اور خدا کا پر امن حرم: جو لوگ مکہ گئے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خانہ خدا مسجد حرام اور پورا مکہ مکرمہ چند خشک اور بے آب و گیاه پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ گویا پتھروں کو پہلے ایک چلتے ہوئے تنور میں بھونا گیا ہے اور پھر انہیں ان کی جگہ پر نصب کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ خشک اور جلا دینے والی زمین عبادت کا عظیم ترین مرکز اور روئے زمین پر توحید کا اولین مرکز ہے علاوہ ازیں خدا کا حرم امن ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے امنیت تکوینی کا بھی حامل ہے اور امنیت تشریحی کا بھی۔

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسا مرکز ایسی سر زمین پر کیوں بنایا۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام نے خطبہ قاصعہ میں نہایت خوبصورت اور عمدہ الفاظ میں اس کا فلسفہ بیان فرمایا ہے:-

وضعه باوعر بقاع الارض حجراً و اقل نتائق الدنيا مدرأً..... بین جبال خشنه و رمال دثمة..... ولو اراد سبحانه ان يضع بيته الحرام و مشاعره العظام بين جنات و انهار و سهل و قرار جم الاشجار، داني الثمار، ملتف البني، متصل القرى، بين برة سمراء و روضة خضراء، و ارياف محدقه، و عراض مغدقة و رياض ناظرة و طرق عامره لكان قد صغر قدر الجزاء على حسب ضعف البلاء، و لو كان الاساس محمول عليها و الاحجار المرفوع بها، بين زمردة خضراء و ياقوتة حمراء، و نور و ضياء، لخفض ذلك مصارعة الشك في الصدور، و لوضع مجاهدة ابليس عن القلوب، و لنفى معتلج الريب من الناس، و لكن الله يختبر عباده بانواع الشدائد، و يتعبدهم بانواع المجاهد و يبنتلبيهم بضروب المكاراة، اخراجا للتكبر من قلوبهم، و اسكاناً للتذلل في نفوسهم، و ليجعل ذلك ابواباً فتحةً الى فضله، و اسباباً ذللاً لعفوه.

خدا نے اپنا گھر سنگلاخ ترین علاقے، نہایت بے آب و گیاه زمین، سخت پہاڑوں اور ریگستانی علاقے میں قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنا گھر اور احرام اور حج جیسی عظیم عبادت کا مقام کسی ایسے علاقے میں بنا سکتا تھا کہ جہاں باغات

ہوتے ، نہریں بہ رہی ہوتیں ، زمین ہموار ہوتی ، ہر طرف درخت ہوتے ، جہاں پھلوں پھولوں کی فراوانی ہوتی ، ارد گرد محلات اور آبادیاں ہونیں گندم کے کھیت ہوتے سبزہ ہی سبزہ ہوتا ، خونصورت کھیریاں ہوتیں ، پانی سے سیراب چمن ہوتے ، شاداب گلستان ہوتے اور آباد شاہراہیں ہوتیں ۔

لیکن عظیم حج اور عبادت کی آزمائش جس قدر سہل اور آرام وہ ہوتی اجر و جزا بھی اسی قدر کم ہوتی ۔  
نیز اگر خدا چاہتا تو کعبہ کے ستون اور اس کی عمارت کے پتھر سبز زمرد اور سرخ یاقوت کے ہوتے جن سے روشنی پھوٹتی لیکن یہ چیز سینوں سے شک و شبہات کا ٹکراؤ کم کر دیتی اور دلوں سے شیطان کی دوڑ دھوپ کا اثر زایل کر دیتی اور لوگوں سے شکوک کے خلجان دور کر دیتی مگر اللہ اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور ان سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے جو طرح طرح کی مشقتوں سے بجا گئی ہو اور انہیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ ان کے دلوں سے غرور تکبر کو نکال باہر کرے اور ان کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے اور یہ کہ اس آزمائش کی راہ سے اپنے فضل و امتنان کے کھلے ہوئے دروازوں تک انہیں پہنچائے اور سے اپنی معافی اور بخشش کا آسان وسیلہ قرار دے ۔1

.....

## 1۔نبی البلاغہ خطبہ قاصعہ ، خطبہ ۱۹۲۔

۶۔حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سات دعائیں

۶۔حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سات دعائیں :- زیر نظر آیات میں توحید و دعا کے پیرو اور بتوں ، بت پرستی اور ظالموں کے خلاف قیام کرنے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بارگاہ خدا میں سات دعائیں مذکور ہیں ۔

پہلی دعا : توحیدی معاشرے کے عظیم مرکز شہر مکہ کی امنیت کے بارے میں ہے اور یہ دعا نہایت معنی خیز ہے ۔  
دوسری دعا : بتوں کی پرستش سے دور رہنے کے بارے میں ہے کہ جو تمام دینی عقائد اور پروگراموں کی اساس ہے ۔  
تیسری دعا : ان کی اولاد اور ان کے مکتب کے پیرو کاروں کی طرف تمام لوگوں اور خدا پرستوں کے قلبی میلان اور فکری رجحان کے بارے میں ہے کہ جو معاشرے میں کسی انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہو سکتا ہے ۔  
چوتھی دعا : شکر گزاری کے مقدمہ کے طور پر اور خالق نعمات کی طرف مزید توجہ کے جذبہ سے انواع و اقسام کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کے بارے میں ہے ۔

پانچویں دعا : قیام نماز کی توفیق کے متعلق ہے اور یہ انسان کے خدا کے ساتھ عظیم ترین رشتہ کی علامت ہے اور یہ دعا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لئے بھی کرتے ہیں ۔  
چھٹی دعا : قبولیت دعا کے بارے میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ خدا وہ دعا قبول کرتا ہے کہ جو پاک دل اور بے آلائش روح سے نکلے ۔

ساتویں دعا : اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا آخری تقاضا اس بارے میں ہے کہ اگر ان سے کوئی لغزش سر زد ہوئی ہے تو بخشنے والا اور مہربان خدا انہیں اپنے لطف و بخشش سے نوازے اور اسی طرح روز قیامت ان کے ماں باپ اور تمام مومنین کو اپنے لطف و رحمت سے بہرہ ور کرے ۔

اس طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سات دعائیں امنیت سے شروع ہوتی ہیں اور مغفرت و بخشش پر تمام ہوتی ہیں ۔ یہ امر جاذب نظر ہے کہ ان دعاؤں میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) صرف اپنے لئے تقاضا نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے لئے بھی طلب کرتے ہیں کیونکہ مردان خدا کبھی بھی صرف اپنے لئے نہیں سوچتے ۔

۷۔ کیا ابراہیم (علیہ السلام) اپنے باپ کے لئے دعا کر رہے ہیں ؟

۷۔ کیا ابراہیم (علیہ السلام) اپنے باپ کے لئے دعا کر رہے ہیں ؟ اس میں شک نہیں کہ آزر بت پرست تھا اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ اس کی ہدایت کے لئے حضرت ابراہیم کی کوششیں موثر ثابت نہ ہو سکیں اور اگر ہم یہ مان لیں کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ تھا تو یہ سوال سامنے آئے گا کہ ان آیات میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس کی بخشش کی دعا کیوں کر رہے ہیں حالانکہ قرآن صراحت سے مومنین کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے روکتا ہے ۔ (۱۱۳۔)

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ آزر کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں سمجھا جا سکتا اور یہ جو علماء نے کہا ہے

کہ لفظ ” اب عربی زبان میں کبھی چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے ، زیر بحث آیات کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو یہ بات پوری طرح قابل و قبول معلوم ہوتی ہے ۔

خلاصہ یہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ ” اب “ اور ” والد “ مینفرق ہے ۔ لفظ ” والد “ کہ جو زیر بحث آیات میں بھی استعمال ہوا ہے صرف باپ کے معنی میں ہے لیکن لفظ ” اب “ کہ جو آزر کے متعلق آیا ہے چچا کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے ۔

مندرجہ بالا آیات اور سورہ توبہ کی آیات کہ جن میں مشرکین کے استغفار کی ممانعت کی گئی ہے کو باہم ملا کر دیکھا جائے تو ہم نہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آزر یقیناً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں تھا ۔ 1

1- مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۲۴۸ ۔ ( اردو ترجمہ ) کی طرف رجوع فرمائیں ۔

### تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 42-45

۴۲۔ وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخَّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ..

۴۳۔ مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُؤُسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ۔

۴۴۔ وَ أَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخْرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نَحْبُ دَعَوْتِكَ وَ نَتَّبِعِ الرَّسُولَ أَوْ لَمْ نَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلِ مَا لَكُمْ مِنْ زَوَالٍ۔

۴۵۔ وَ سَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمْ الْأَمْثَالَ۔

ترجمہ

۴۲۔ اور یہ گمان نہ کر کہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے ( ایسا نہیں ہے بلکہ اس نے ) ان کے لئے ( سزا کو ) اس دن کے لئے موخر کیا ہے کہ جس دن ( خوف و وحشت کے مارے ) آنکھیں پتھرا جائیں گی ۔

۴۳۔ وہ گردنیں اوپر کی اور سر اٹھائے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بے حرکت ہو کر رہ جائیں گی ( کیونکہ وہ جدھر دیکھیں گے عذاب کی نشائیاں نظر آئیں گی ) اور ان کے ( ڈوبتے ہوئے ) دل بالکل ویران ہونگے ۔

۴۴۔ اور لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس روز عذاب الہی ان کی طرف آئے گا وہ دن کہ جب ظالم کہیں گے : پروردگارا ! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لئے مہلت دے دے تا کہ ہم تیری دعوت قبول کر لیں اور رسولوں کی اتباع کر لیں ( لیکن انہیں فوراً جواب دیا جائے گا کہ ) کیا پہلے تم قسم کھا کر نہ کہتے تھے کہ تمہارے لئے زوال و فنا نہیں ہے ۔

۴۵۔ ( کیا وہ تمہی نہ تھے کہ ) جنہوں نے ان لوگوں کے گھروں ( اور محلات ) میں سکونت اختیار کی کہ جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا جبکہ تم پر یہ امر آشکار ہو چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ہم نے تم سے ( گزشتہ لوگوں کے انجام کی ) مثالیں بیان کر دی تھیں ( پھر بھی تم بیدار نہ ہوئے ) ۔

تفسیر

جس روز آنکھیں پتھرا جائیں گی

گزشتہ آیات میں یوم حساب کے بارے میں گفتگو تھی ۔ اسی مناسبت سے زیر نظر آیات میں ظالموں اور ستم گروں کی کیفیت مجسم کی گئی ہے اور ان کے انجام کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جو بلا دینے والی اور بیدار کرنے والی

ہے۔ ضمناً مسائل معاد کے اس حصہ کے ذکر سے گزشتہ مباحث توحید کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔ پہلے ظالموں اور ستم گروں کو تہدید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر! کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں اور ستم گروں کے کام سے غافل ہے۔

(و لا تُحْسَبَنَّ اللَّهُ غَافِلًا عَمَّا يُعْمَلُ الظَّالِمُونَ )۔

یہ بات درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے کہ جو کہتے ہیں کہ اگر اس عالم کا کوئی عادل خدا ہے تو پھر اس نے ظالموں کو کیوں ان کی حالت پر چھوڑ رکھا ہے۔ کیا وہ ان کی حالت سے غافل ہے یا پھر کیا وہ جانتا تو ہے لیکن انہیں روکنے کی قدرت نہیں رکھتا؟

اس سوال کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ خدا ہر گز غافل نہیں ہے۔ اگر وہ انہیں فوراً سزا نہیں دیتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جہان میدان عمل ہے اور یہ انسان کی آزمائش و پرورش کا مقام ہے اور یہ مقصد آزادی عمل کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن آخر کا ان کا یوم حساب آکے رہے گا۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خدا ان کی سزا اور عذاب ایسے دن پر اٹھا رکھا ہے جس میں خوف و وحشت کے مارے آنکھیں پتھرا جائیں گی اور ایک نقطہ پر لگی ہے حس و حرکت ہو کر رہ جائیں گی ( إِنَّمَا يُؤَخَّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ )۔

اس روز کی سزا اور عذاب اس قدر وحشت ناک ہو گا کہ شدت خوف کے باعث یہ ستمگر اپنی گردنیں اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے یہاں تک کہ ان کی پلکیں بھی حرکت نہ کریں گی اور شدت اضطراب سے ان کے دل ویران ہو جائیں گے ( مُهْطِعِينَ مُقْنَعِي رُؤُسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ )۔

تشخص ”شخص“ کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے آنکھوں کا بے حرکت ہو کر ایک ہی نقطہ پر جم کر رہ جانا۔ ”مہطعین“ ”اھطاء“ کے مادہ سے گردن اونچی کرنے کے معنی میں ہے۔ بعض نے اسے تیز ہونے کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ذلت و عجز کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں ہے لیکن آیت کے دیگر حصوں کی طرف توجہ کرنے سے پہلا معنی ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

”مقنعی“ ”اقناع“ کے مادہ سے آسمان کی طرف سر بلند کرنے کے معنی میں ہے۔ ”لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ“ کا مفہوم یہ ہے کہ وحشت کے مارے ان کی پلکیں ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتیں گویا مردوں کی آنکھوں کی طرح بے کار ہو چکی ہیں۔

”وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ“ ان کے دلوں کے ویران ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے وحشت ناک خبر سنائی تو اچانک میرا دل بیٹھ گیا اور ویران ہو گیا۔ گویا وہ یوں حواس کھو دیں گے کہ انہیں کسی چیز کی ہوش نہ رہے گی یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جائیں گے گویا ان میں نہ دل ہے نہ جان، کوئی چیز انہیں یاد نہیں۔

یہاں ان کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں :-

آنکھوں کا خیرہ ہونا ،

گردنوں کا اونچا ہونا ،

سر کا بلند ہونا ،

پلکیں نہ جھپک سکتا اور

سب کچھ بھول جانا۔

یہ اضطراب و وحشت کے عالم کی انتہائی عمدہ اور بولتی ہوئی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس روز ظالموں کی یہ حالت ہوگی۔ وہ ظالم کہ جو غرور تکبر میں ہر چیز کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے۔ اس دن ان کی بے چارگی کا یہ عالم ہوگا کہ پلکیں بھی نہ جھپک سکیں گے۔ ان ہولناک مناظر سے آنکھیں چرانے کے لئے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوں گے کیونکہ وہ جدھر بھی دیکھیں گے وحشت ناک مناظر ان کے سامنے ہوں گے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو عقل کل خیال کرتے تھے اور دوسروں کو بے عقل تصور کرتے تھے۔ اس روز عقل و ہوش گنواں بیٹھے گے اور دیوانے معلوم ہوں گے بلکہ ان کی آنکھیں مردوں کی آنکھوں کی طرح ویران اور بے حرکت ہوں گی۔

واقعاً جب قرآن کسی منظر کی تصویر کشی کرتا ہے تو نہایت مختصر عبارت میں کامل ترین تصویر پیش کر دیتا ہے۔ زیر نظر آیت بھی اس کا نمونہ ہے۔

اس کے بعد اس لئے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ خدائی عذاب کسی خاص گروہ سے مربوط ہے خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایک عمومی حکم دیتا ہے : تمام لوگوں کو اس دن سے ڈرا جس دن پروردگار کا درد ناک عذاب بد کاروں کا رخ کرے گا ، جس وقت ظالم اپنے اعمال کے وحشت ناک نتائج دیکھیں گے تو پریشان ہوں گے اور ان کی تلافی کے لئے سوچیں گے اور عرض کریں گے : پروردگارا ! ہمیں کچھ دیر کی مہلت دے دے ( وَ أَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخْرِنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ) . تا کہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ” ہم تیری دعوت قبول کریں اور تیرے رسولوں کی پیروی کریں “ ( نُجِبُ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرَّسُولَ ) .

لیکن فوراً ان کی بات مسترد کر دی جائے گی اور انہیں ہولناک پیغام دیا جائے گا کہ ایسا ہونا اب محال ہے ، عمل کا دور ختم ہو چکا ہے ” کیا تم ہی نہ تھے جو قسم کھایا کرتے تھے کہ تمہاری طاقت زوال پذیر نہیں ہے “ ( أَوْ لَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِنْ زَوَالٍ ) .

تم وہی نہیں جو ان کے گھروں اور محلات میں رہتے تھے جنہوں نے ظلم کیا تھا ( وَ سَكَنتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ) . جبکہ تم پر حقیقت آشکار ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ( وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ ) . اور ہم نے تم سے گزشتہ امتوں کی بلا دینے والی مثالیں بیان کیں

( وَ ضَرَبْنَا لَكُمْ الْأَمْثَالَ ) .

لیکن ان عبرت انگیز درسوں میں سے کوئی بھی تم پر اثر انداز نہ ہو اور تم نے اسی طرح اپنے شرمناک اعمال اور ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رکھا اور اب جبکہ تم الہی کیفر کردار کو پہنچے ہو تو مہلت دئے جانے کا تقاضا کر رہے ہو۔ کیسی مہلت ؟ اب موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ پیغمبر اکرم سے خطاب کیوں ہے ؟

۱۔ پیغمبر اکرم سے خطاب کیوں ہے ؟ اس میں شک نہیں کہ پیغمبر کبھی تصور بھی نہیں کرتے کہ خدا ظالموں کے کام سے غافل ہے لیکن اس کے باوجود زیر نظر آیات میں رسول اللہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : کہیں یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ظالموں کے اعمال سے غافل ہے ۔

یہ در حقیقت بالواسطہ طور پر دوسروں کو پیغام دیا گیا ہے اور یہ بھی فصاحت کا ایک فن ہے کہ کبھی کسی ایک شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے لیکن مراد دوسرا شخص یا دیگر اشخاص ہوتے ہیں ۔

علاوہ از این یہ تعبیر در اصل تہدید کے لئے کنایہ ہے ۔ مثلاً کبھی ہم کسی قصور وار سے کہتے ہیں : ” فکر نہ کرو ہم تیری تقصیریں بھول چکے ہیں “ یعنی موقع پر ہم تیرا حساب چکانیں گے ۔

بہر حال اس دنیا کی اساس اس پر ہے کہ تمام افراد کو کافی حد تک مہلت دی جائے تاکہ جو کچھ ان کے اندر ہے ظاہر ہو جائے اور آزمائش اور تکامل کا میدان وسیع ہو ۔ یہ اس لئے ہے کہ کسی کے لئے عذر و بہانہ باقی نہ رہے اور سب کو باز گشت ، اصلاح اور تلافی کا موقع دیا جائے ۔ اسی لئے گنہگاروں کو مہلت دی جاتی ہے ۔

۲۔ ” یوم یاتیہم العذاب “ سے کون سا دن مراد ہے ؟

۲۔ ” یوم یاتیہم العذاب “ سے کون سا دن مراد ہے ؟ زیر نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ رسول اللہ کو اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اس دن سے درائیں جس دن عذاب ان کی طرف آئے گا ۔ اس دن سے کونسا دن مراد ہے ، اس سلسلے میں مفسرین نے تین احتمالات ذکر کئے ہیں :

پہلا ۔ یہ کہ یہ قیامت کا دن ہے ۔

دوسرا یہ کہ یہ موت آنے کا دن ہے کہ جس دن عذاب الہی کا مقدمہ ظالموں کا رخ کرے گا ۔

تیسرا یہ کہ کچھ دنیاوی سزاؤں کے نزول کا دن ہے ۔ مثلاً جس روز قوم لوط ، قوم عاد و ثمود ، قوم نوح اور فرعونوں پر عذاب ہوا ۔ یہ لوگ دریا کی دھاڑتی ہوئی موجوں کا شکار ہوئے ، یا غرق طوفان ہوئے یا زلزلوں سے تباہ ہوئے ، یا شدید ویران گر آندھیوں سے برباد ہوئے ۔

اگر چہ بہت سے مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لیکن بعد میں آنے والے جملے واضح طور پر تیسرے احتمال

کو تقویت دیتے ہیں اور نشاندہی کرتے ہیں کہ مراد دنیاوی نوبود کرنے والے عذاب ہیں۔ اور ان کا شکار ہونے والے کہتے ہیں کہ پروردگارا! ہمیں تلافی کے لئے تھوڑی سی مہلت دے دے۔

”اخرنا“ (ہمیں تاخیر میں ڈال دے)۔ یہ تغیر دنیاوی زندگی جاری رکھنے کی درخواست کے لئے واضح قرینہ ہے۔ اگر وہ یہ بات روز قیامت آثار عذاب دیکھ کر کہتے تو انہیں کہنا چاہیے تھا: خدا وندا: ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۲۷ میں ہے:

وَلَوْ تَرَىٰ اِذْ وَقَفُوا عَلٰی النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذَّبُ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔

اگر تو انہیں سد عالم میں دیکھے کہ جب وہ آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے تو تو دیکھے گا کہ وہ کہتے ہیں: کاش! ہم دنیا کی طرف پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیات کی تکذیب نہ کرتے اور ہم مومنین میں سے ہوجاتے (تو تجھے ان کی حالت پر افسوس ہوگا)۔

کیونکہ فوراً بعد والی آیت میں ان کا جواب اس طرح دیا گیا ہے:

وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔

یہ جھوٹ کہتے ہیں اگر لوٹ بھی جائیں تو انہیں اعمال میں مشغول ہو جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ اگر یہ آیت عذاب دنیا سے ڈرانے کے لئے ہے جبکہ اس سے پہلی آیت ”ولا تحسبن الله غافلاً۔“ میں تو عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے تو یہ امر ایک دوسرے سے کس طرح سے مناسبت رکھتا ہے؟ نیز لفظ ”انما“ اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں صرف قیامت میں سزا دی جائے گی اور وہاں ان پر عذاب ہوگا نہ کہ اس دنیا میں۔

لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ سے جواب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ سزا اور عذاب کہ جس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہے عذاب قیامت ہے جو سب ظالموں کو لاحق ہوگا لیکن دنیاوی سزائیں ایک تو عمومیت نہیں رکھتیں اور دوسرا بازگشت کے بھی قابل ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ تباہ کن دنیاوی عذاب مثلاً وہ المناک عذاب جو قوم نوح یا آل فرعون اور ان جیسے لوگوں کو دامن گیر ہوا۔ ایسا عذاب شروع ہوجائے تو توبہ کے دروازہ بند ہو جاتے ہیں اور لوٹ آنے کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب گنہگار لوگ ایسی سزاؤں کا سامنا کرتے ہیں تو اظہار پشیمانی کرتے ہیں لیکن یہ درحقیقت ایک اضطراری ندامت ہوتی ہے جس کا کوئی وزن نہیں۔ لہذا ایسا عذاب شروع ہونے سے پہلے تلافی کے در پے ہونا چاہیے۔ ۱۔

.....

### 1-مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد سوم سورہ نساء آیت ۱۸ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں۔

۳۔ مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا؟

۳۔ مہلت کا تقاضا کیوں قبول نہیں کیا جاتا؟ قرآن مجید کی مختلف آیات میں ہے کہ برے عمل کرنے والے اور ظالم مختلف مواقع پر تقاضا کریں گے کہ انہیں اپنے گزشتہ کی تلافی کے لئے پھر سے دنیاوی زندگی مل جائے۔ ان میں سے بعض آیات روز قیامت سے مربوط ہیں مثلاً سورہ انعام کی آیت ۲۸۔ جس کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے۔ بعض دیگر آیات وقت موت آ پہنچنے سے مربوط ہیں مثلاً سورہ مومنون کی آیت ۹۹۔ اس میں فرمایا گیا ہے:

حتى اذا جاء احدهم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحاً فیما ترکت

یہی حالت رہتی ہے یہاں تک کہ جب کہ کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو وہ عرض کرتا ہے: خدا وندا! مجھے پلٹا دے۔ شاید میں اپنے کئے کی تلافی کر سکوں اور عمل صالح انجام دوں۔

کچھ آیات تباہ کن عذاب کے موقع سے مربوط ہیں۔ مثلاً زیر بحث آیات میں ہے کہ نزول عذاب کے وقت ظالم مہلت کا تقاضا کریں گے۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ ان تمام مواقع پر جواب نفی میں ہے۔ اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ ان میں سے کوئی تقاضا بھی حقیقی نہیں ہے یہ سب اس اضطراری حالت اور انتہائی پریشانی کا رد عمل ہے جو ان بت ترین افراد کو لاحق ہوگی۔ ان کے یہ تقاضے کسی داخلی انقلاب اور زندگی میں تغیر کے لئے عزم حقیقی کی دلیل نہیں ہیں۔

یہ تو بالکل ان مشرکین کی سی حالت ہے جو دریاؤں کے ہولناک گردابوں میں پھنس جائیں تو بڑے خلوص سے خدا کو پکارتے ہیں لیکن طوفان رکتے ہی اور ساحل نجات تک پہنچتے ہی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

اسی لئے قرآن مذکورہ آیات میں صراحت سے کہتا ہے :

ولو ردو العادوا لما نهو عنه

اگر یہ معمول کی زندگی کی طرف لوٹ جائیں تو پھر وہی طرز عمل جاری رکھیں گے ان کی روش میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی

-

یعنی - وہی ہے چال ہے ڈھنگی جو پہلے تھی و سواب بھی ہے -

## تفسیر نمونہ جلد 10

سورہ ابراہیم / آیہ 46-52

۴۶۔ وَ قَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ -

۴۷۔ فَلَا تَحْسِبَنَّ اللَّهَ مُخْلَفًا وَعَدِهِ رُسُلُهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ -

۴۸۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ -

۴۹۔ وَ تَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ -

۵۰۔ سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطْرَانٍ وَتَعْشَىٰ وُجُوهُهُمُ النَّارُ -

۵۱۔ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ -

۵۲۔ هَذَا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ وَلِيُنذِرُوا بِهِ وَيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ وَلِيُنذِرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ -

ترجمہ

۴۶۔ انہوں نے اپنا پورا مکر کیا اور ان کے سارے مکر ( اور سازشیں ) خدا کے سامنے آشکار ہیں اگر چہ ان کے مکر سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں -

۴۷۔ اور یہ گمان نہ کرنا کہ خدا ان وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا جو اس نے اپنے رسولوں سے کئے ہیں کیونکہ خدا قادر و منتقم ہے -

۴۸۔ وہ دن کہ جب یہ زمین دوسری زمین میں بدل جائے گی اور آسمان ( دوسرے آسمانوں میں ) تبدیل ہو جائیں گے اور خدائے واحد و قہار کی بارگاہ میں ظاہر ہوں گے -

۴۹۔ اور تو اس دن مجرموں کو اکٹھا طوق و زنجیر میں دیکھے گا ( ایسے طوق و زنجیر جن سے ان کے ہاتھ اور گردنیں اکٹھی بندھی ہونگی ) -

۵۰۔ اور ان کا لباس قطران ( جلانے والا چپکا ہوا بدبند دار مادہ ) کا ہوگا اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپ لے گی -

۵۱۔ تا کہ خدا ہر شخص کو جو کچھ اس نے انجام دیا ہے اس کی جزا دے کیونکہ خدا سریع الحساب ہے -

۵۲۔ یہ ( قرآن ) ( سب ) لوگوں کے لئے اعلان ہے تا کہ سب کو تہدید ہو جائے اور ( سب ) جان لیں کہ وہ اکیلا معبود ہے نیز اس لئے کہ صاحبان عقل ( اور غور و فکر کرنے والے ) نصیحت حاصل کریں -

تفسیر

ظالموں کمزور سازشیں

گزشتہ آیات میں ظالموں کی کچھ سزاؤں کی طرف اشارہ ہو چکا ہے - ان آیات میں بھی پہلے ان کے بعض کاموں کی طرف

اشارہ کیا گیا ہے اور پھر ان کے لئے بعض سخت اور دردناک سزائوں کا ذکر ہے -  
 پہلی آیت میں ہے : انہوں نے مکر کیا اور جس قدر ان سے بن پڑتا تھا سازش اور شیطنت کی (وَ قَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ ) -  
 خلاصہ یہ کہ تیرے دشمنوں نے اسلام کو مٹانے اور نابود کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا - ڈرانے دھمکانے  
 سے لے کر انیت و آزار اور قتل کی سازش کی - نیز وہ پرا پیکندہ کرتے رہے اور طرح طرح کی تہمتیں لگاتے رہے -  
 لیکن ان سب کے باوجود اللہ ان کی تمام سازشوں سے آگاہ ہے اور ان کے تمام کام اس کے رکارڈ میں ہیں (وَ عِنْدَ اللَّهِ مَكْرٌ  
 هُمْ ) -  
 بہر حال پریشان نہ ہو - یہ نیرنگیاں ، منصوبے اور سازشیں تجھ پر اثر نہیں ڈالیں گی ” اگر وہ اپنے مکر سے پہاڑوں کو  
 اپنی جگہ سے ہٹا دیں “

(وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ) -

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں ” مکر “ ہر قسم کی چارہ جوئی اور چارہ اندیشی کے معنی میں ہے - یہ کام کبھی برائی  
 کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی اس کے بغیر - اگر چہ موجودہ فارسی زبان میں یہ لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن  
 عربی ادب کے لحاظ سے اس کا معنی عام ہے - یہی وجہ ہے کہ کبھی یہ لفظ خدا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے -  
 (وَ عِنْدَ اللَّهِ مَكْرٌ هُمْ ) کے بارے میں دو احتمال ذکر کئے ہیں -

بعض مفسرین مثلاً علامہ طبا طبائی نے المیزان میں کہا ہے کہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ان کے تمام منصوبوں  
 چالبازیوں اور سازشوں پر پورا احاطہ رکھتا ہے -

بعض دیگر مثلاً مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے مکر کی سزا خدا کے ہاں ثابت ہے  
 لہذا یہ جملہ ” وَ عِنْدَ اللَّهِ مَكْرٌ هُمْ “ کی تقدی میں ہے اور لفظ ” جزاء “ جو مضاف ہے محذوف ہے -  
 البتہ پہلا معنی بلا شبہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی مطابقت رکھتا ہے - اور کسی قسم کے  
 حذف و تقدیر کا بھی محتاج نہیں ہے -

پہلا جملہ کہ جس میں ہے ” اگر چہ ان کا مکر پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے “ یہ بھی اسی تفسیر کو تقویت دیتا ہے  
 یعنی اگر چہ وہ منصوبہ بندی اور سازشوں میں بڑے طاق ہوں ، خدا ان سے زیادہ آگاہ اور زیادہ قدرت والا ہے اور ان کی  
 سازشوں کو درہم برہم کر دیتا ہے -

دوبارہ روئے سخن پیغمبر اکرم کی طرف ہے اور ظالموں اور بد کاروں کو دھمکی دی گئی ہے - ارشاد ہوتا ہے : تم یہ گمان  
 نہ کرنا کہ خدا نے انبیاء سے جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرے گا (فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفًا وَعْدِهِ رُسُلُهُ ) - کیونکہ  
 وعدہ خلافی تو وہ کرتا ہے جو قادر و توانا نہ ہو یا سزا و انتقام اس کی لغت میں نہ ہو لیکن ” خدا تو توانا بھی ہے اور  
 صاحب انتقام بھی (إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ) -

یہ آیت در حقیقت ایک گزشتہ آیت ”ولا تحسبن الله غافلاً عما يعمل الظالمون“ کی تکمیل کرتی ہے - یعنی اگر تم دیکھتے ہو  
 کہ ظالموں کو مہلت ملی ہوئی ہے تو وہ اس لئے نہیں ہے کہ پروردگار ان کے اعمال سے غافل ہے اور نہ اس لئے کہ وہ  
 اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرے گا بلکہ ان کے تمام حساب ایک ہی دن چکا دے گا اور انہی عادلانہ طور پر سزا دے گا -  
 لفظ ” انتقام “ موجودہ فارسی میں تلافی کرنا ، کینہ نکالنا اور معاف نہ کرنے کا مفہوم بھی لئے ہوئے ہے - در اصل اس کا  
 یہ معنی نہیں - بلکہ ” انتقام “ کا مفہوم سزا دینا اور عذاب کرنا ہی ہے - ایسی سزا کہ جو خدا استحقاق اور عدالت کی بنا پر  
 دے گا بلکہ انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے - کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر خدا کی طرف سے ایسا انتقام نہ ہو تو یہ اس کی  
 حکمت و عدالت کے خلاف ہوگا -

مزید فرمایا گیا ہے : یہ سزا ایسے دن دی جائے گی جبکہ یہ زمین دوسری زمین میں تبدی لہو جائے گی اور یہ آسمان  
 دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائے گا (يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ ) -

اس روز ہر چیز تباہی کے بعد پھر سے صورت پذیر ہوگی اور انسان نئے حالات کے ساتھ نئے عالم میں قدم رکھے گا -  
 ایسا عالم کہ جس کی تمام چیزیں اس عالم سے مختلف ہوں گی ” اس کی وسعت ، اس کی نعمتیں اور اس کی سزائیں سب  
 مختلف ہوں گی ” اور اس روز جو کچھ بھی کسی کے پاس ہے وہ سب پوری طرح واحد و قہار خدا کے سامنے ظاہر ہو  
 جائے گا (وَ يَرَوُا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ) -

” برزو “ اصل میں ” براز “ ( بر وزن ” فراز “ ) کے مادہ سے فضا اور وسیع جگہ کے معنی میں لیا گیا ہے - ” برزو “ کا  
 معنی ایسی فضا اور وسیع علاقہ میں ہونا ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ ظاہر اور آشکار ہونا ہے - اسی وجہ سے ” برزو عام  
 طور پر ” ظہور “ کے معنی میں آتا ہے ( غور کیجئے گا ) -

روز قیامت انسان کے خدا کے سامنے ظاہر ہونے کا کیا معنی ہے ، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں ۔ بہت سوں نے اسے قبروں سے باہر نکالنے کے معنی میں لیا ہے ۔ یہ احتمال بھی ہے کہ بروز کا مطلب انسان کے اندر اور باہر کا سب کچھ ظاہر ہوجانا ہو جیسا کہ سورہ مومن کی آیت ۱۶ میں فرمایا گیا ہے : یوم ہم بارزون لا یخفی علیٰ اللہ منہم شیء وہ دن کہ جب ان کاسب کچھ آشکار ہو جائے گا اور ان کی کوئی چیز مخفی نہ رہے گی ۔ نیز سورہ طارق کی آیت ۹ میں ہے :

یوم تبلی السرائر

وہ دن کہ جب ہر شخص کے اندرونی اسرار آشکار ہو جائیں گے ۔ بہر حال اس حالت میں خدا کی قہاریت کا ذکر ہر چیز پر اس کے تسلط اور سب کے اندر اور باہر پر اس کے غلبہ کی دلیل ہے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی چیز خدا پر مخفی ہے کہ جو وہاں آشکار ہو جائے گی ؟ کیا خدا قبروں میں مردوں کے وجود سے بے خبر ہے ؟ یا کیا وہ یہاں انسان کے اندرونی اسرار کو نہیں جانتا ؟ ایک نکتے کی طرف توجہ سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے ۔ وہ یہ کہ اس جہان میں ایک ہمارا ظاہر ہے اور ایک باطن ۔ بعض اوقات ہمارے علم کے محدود ہونے کی بناء پر یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ خدا ہمارے باطن کو نہیں جانتا لیکن دوسرے جہان میں ہر چیز اس طرح آشکار ہو جائے گی کہ ظاہر و باطن کا فرق نہیں ہوگا ۔ سب کچھ آشکار ہوگا ۔ یہاں تک کہ کسی کے دل میں یہ احتمال بھی پیدا نہیں ہوگا کہ ہو سکتا ہے کوئی چیز خدا سے مخفی رہ گئی ہے ۔ دوسرے لفظوں بروز و ظہور ہماری فکرو نظر کے اعتبار سے ہے کہ علم خدا کے اعتبار سے ۔ اگلی آیت میں مجرمین کی حالت ایک اور پہلو سے تصویر کشی کی گئی ہے : اس روز تو مجرموں کو دیکھے گا کہ وہ طوق و زنجیر میں جکڑے ہوں گے ۔ ان کے ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوں گے اور وہ ایک دوسرے سے بھی بندھے ہوں گے ( وَ تَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ) ۔

”اصفاد“ جمع ہے ”صفد“ ( بر وزن ”نمد“ ) کی اور ”صفاد“ (بروزن ”معاد“ ) طوق کے معنی میں ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ ”صفاد“ خاص طور پر اس طوق و زنجیر کو کہتے ہیں جو ہاتھ اور گردن کو ایک دوسرے سے باندھ دے ۔ ”مقرنین“ ”قرن“ اور ”اقتران“ کے مادہ سے اسی معنی میں ہے ۔ البتہ جب اسے باب تفعیل میں منتقل کیا جائے تو اس سے ”تکثیر“ کا مفہوم حاصل ہوتا ہے ۔ لہذا ”مقرنین“ کا معنی ہے : ”وہ لوگ جو ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں“ ۔ اس لفظ سے زیر نظر آیت میں کون لوگ مراد ہیں ۔ اس سلسلے میں مفسرین نے تین تفسیریں بیان کی ہیں ۔ پہلی :- یہ کہ اس روز مجرمین کو طوق زنجیر کے ایک لمبے سلسلے میں ایک دوسرے سے باندھا جائے گا وہ لوگ اسی حالت میں میدان حشر میں پیش ہوں گے ۔ طوق و زنجیر کا یہ سلسلہ اب گنہگاروں کے عملی فکری رشتے اور تعلق کا مظہر ہے ۔ اس تعلق کی بناء پر وہ اس جہان میں باہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے ، ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور ظلم و فساد کی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی تھے ۔ ان کا یہ باہمی ربط وہاں طوق و زنجیر کے اس سلسلے میں مجسم ہوگا ۔

دوسری :- تفسیر یہ ہے کہ اس روز مجرم زنجیروں کے ذریعے شیطانوں کے ساتھی ہو جائیں گے اور اس دنیا میں ان کا باطنی تعلق اس جہان میں ایک زنجیر کے ذریعے آشکار ہو جائے گا ۔ تیسری :- تفسیر یہ ہے کہ زنجیروں کے ذریعے ان کے ہاتھوں کو ان کی گردن کا قرین بنا دیا جائے گا ۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ مجرموں کے بارے میں یہ معانی صحیح ہوں اگر چہ آیت ظاہری مفہوم زیادہ تر پہلے معنی کی تائید کرتا ہے ۔

اس کے بعد ان کے لباس کے بارے میں بتایا گیا ہے اور یہ بھی ان کے لئے ایک عذاب عظیم ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : ان کے لباس قطران کے مادہ سے بنے ہوئے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ کے شعلے ڈھانپ لیں گے (سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطْرَانٍ وَ تَعْشَىٰ وَجُوهُهُمْ النَّارُ) ۔

”سرابیل“ ”سربال“ (بروزن ”مقال“ ) کی جمع ہے ۔ اس کا معنی ہے ”قمیص“ چاہے وہ کسی بھی چیز سے بنی ہو ۔ نیز بعض نے کہا ہے کہ یہ ہر قسم کے لباس کے معنی میں ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور ہے ۔ ”قطران“ لغت میں کبھی قاف پر زبر اور تا پر سکون اور کبھی قاف کے نیچے زبر اور طاء پر سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے ۔ اس کا معنی ہے ایسا مادہ جو اہل نامی درخت سے لیا جاتا ہے تا کہ اس بیماری کے باعث ہونے والی سوزش کو ختم کیا جا سکے اور اس کے مادہ کو جڑ سے ختم کیا جا سکے ۔ بہر حال یہ ایک ایسا بد بو دار سیاہ رنگ مادہ ہے جو شعلہ ور

ہو سکتا ہے - ۲۱

بہر کیف ”سرابیلہم من قطران“ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے بدن لباس کی بجائے ایک طرح کے سیاہ رنگ بدبودار جل اٹھنے والے مادہ سے ڈھانپے جائیں گے۔ یہ ایسا لباس ہوگا جو ویسے بھی برا ہوگا اور دیکھنے میں بھی بہت قبیح ہوگا۔ بدبو بھی دے گا اور خود بخود جل اٹھنے والا بھی ہوگا۔ جب لباس میں یہ چار عیب ہونگے تو گویا وہ بدترین لباس ہوگا۔ کیونکہ لباس زینت کے لئے بھی ہوتا ہے اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے بھی جبکہ یہ لباس برا اور قبیح صورت بھی ہوگا اور جلانے والا بھی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ لباس گناہ پہن کی مجرم اس جہان میں بارگاہ الہی میں بھی اپنے تئیں رو سیاہ کرتے ہیں اور ان کے گنا کا تعفن اس معاشرے کو بھی آلودہ کرتا ہے۔ نیز ان کے اعمال اس معاشرے میں فساد و گناہ کی آگ بھڑکنے کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ”قطران“ کہ جس کا لباس انہیں اس جہان میں پہنایا جائے گا گویا ان کے اس جہان اعمال کی تجسیم ہے۔

یہ جو آیت میں ہے کہ آگ کے شعلے ان کے چہروں کو ڈھانپ دیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس حصہ پر ”قطران“ نہیں ہوگا وہ اس کے شعلوں میں جلے گا۔

یہ اس لئے ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کے کئے کے مطابق سزا دے (لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ)۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ”انہیں ان کے اعمال کی سزا دے گا“ بلکہ کہتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے، انہیں جزا کے طور پر دے گا۔ دوسرے لفظوں میں ان کی جزا ان کے اعمال مجسم ہونا ہے۔ اس خاص تعبیر کے باعث یہ آیت تجسیم اعمال کی ایک اور دلیل ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: اللہ سریع الحساب ہے۔ (إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ)۔

بالکل واضح ہے کہ جب انسان کے اعمال ختم نہ ہوں اور چہرہ بدل کر انسان کے پاس آجائیں تو اس سے زیادہ جلدی حساب اور کیا ہوگا اور دراصل انسان کا حساب اس کے ساتھ ساتھ ہی ہے۔

بعض روایات میں ہے۔

ان اللہ تعالیٰ يحساب الخلاق كلهم في مقدار لمح البصر

اللہ تعالیٰ چشم زدن میں تمام مخلوقات کا حساب کر لے گا۔

اصولی طور پر پروردگار کی طرف سے محاسبہ مدت کا محتاج نہیں۔ مذکورہ بالا روایت نے دراصل مختصر ترین زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۴۵۔ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہ سورہ اور تمام قرآن چونکہ لوگوں کو دعوت توحید دیتا ہے، احکام الہی کی تبلیغ کرتا ہے اور احکام الہی کی خلاف ورزیوں سے ڈراتا ہے لہذا اس سورہ کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: قرآن کا ابلاغ سب لوگوں کے لئے عمومی ہے (ہذا بَلَاغٌ لِلنَّاسِ)۔ اور انہیں ڈرانے والا ہے (وَلِيُنذِرُوا بِهِ)۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جان لیں کہ ان کا معبود بس وہی ایک ہے (وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ)۔ نیز ہدف یہ ہے کہ صاحبان عقل و فکر متوجہ ہوں (وَلِيَذَكَّرُوا أُولَئِكَ)۔

.....

۱۔ تفسیر کبیر، فخر الدین رازی جلد ۱۹ ص ۱۴۸۔

۲۔ فرید وجدی دائرۃ المعارف میں قطران کے مادہ میں کہتا ہے:

یہ ایسا مایع ہے کو پتھر کو کونہ کی تقطیر کے وقت ہاتھ آتا ہے جبکہ ایک خاص گیس حاصل کرنے کے لئے عمل تقطیر کیا جاتا ہے اور نباتی قطران بعض درختوں سے لیا جاتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ زمین اور آسمان بدل جائیں گے:

۱۔ زمین اور آسمان بدل جائیں گے: زیر نظر آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ قیامت میں یہ زمین کسی دوسری زمین میں اور اسی طرح آسمان دوسرے آسمانوں میں تبدیل ہو جائی گے۔

کیا اس تبدیلی سے مراد ذاتی وجود کی تبدیلی ہے یعنی کیا یہ زمین بالکل نا بود ہو جائے گی اور کوئی دوسری زمین خلق کع

دی جائے گی اور قیامت اس زمین میں برپا ہوگی یعنی یہ کرہ خاکی اور یہ آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں پر نئے زمین و آسمان پیدا ہوں گے جو اس زمین و آسمان کی نسبت تکامل و ارتقاء میں زیادہ ہوں گے۔؟  
قرآن مجید کی بہت سی آیات کا ظاہری مفہوم دوسرے معنی کی تائید کرتا ہے :-  
سورہ فجر کی آیہ ۲۱- میں ہے :

كَلَّا اِذَا دَكَتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا

ایک ایسا وقت آئے گا کہ جب زمین درہم درہم ہو جائے گی۔

سورہ زلزال میں اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاخْرَجَتِ الْاَرْضُ اِثْقَالَهَا

جب زمین میں زلزلہ آئے گا اور وہ اپنے مخفی بوجھ اگل دے گی۔

سورہ حاقہ کی آیہ ۱۴ اور ۱۵ میں ہے :

وَحَمَلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدَكَّتَا دَكَّةً وَاٰحَدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ

زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھالٹے جائیں گے اور وہ درہم درہم ہو جائیں گے اور اس روز وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا۔

سورہ طہ کی آیات ۱۰۵ تا ۱۰۸ میں ہے :

#### تفسیر نمونہ جلد 10

۱۰۵۔ وَ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا .

۱۰۶۔ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا .

۱۰۷۔ لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا .

۱۰۸۔ يَوْمَئِذٍ يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا .

تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: میرا پروردگار انہیں سرگرداں اور ریزہ ریزہ کر دے گا اور پھر انہیں ہموار زمین کی صورت دے گا اس طرح کہ تجھے اس میں ٹیڑھ پن اور پستی و بلندی نظر نہیں آئے گی۔ اس روز لوگ اس پکارنے والے کی پیروی کریں گے جس سے انحراف نہیں ہو سکے گا اور مہربان خدا کے سامنے آواز میں جھکی ہونگی اور تجھے دھیمی دھیمی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دے گا۔

#### تفسیر

سورہ تکویر کی ابتداء میں چراغ آفتاب گل ہو جائے، ستاروں کے تاریک ہو جانے اور پہاڑوں کے چلنے کا تذکرہ ہے۔ نیز سورہ انفطار کے آغاز میں بھی آسمانوں کے پھٹ جانے، ستاروں کے بکھر جانے اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے (غور کیجئے گا) کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

یہ آیات اور ایسی بہت سی آیات کو مجموعی طور پر دیکھا جائے اور اسی طرح انسان کے قبروں سے اٹھنے کے متعلق آیات کو ملحوظ نظر رکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا موجودہ نظام اس صورت میں باقی نہیں رہے گا لیکن یہ بالکل نابود نہیں ہوگا بلکہ زمین درہم درہم ہو کر ہموار اور صاف ہو جائے گی اور لوگ گویا ایک نئی زمین پر قدم رکھیں گے۔ البتہ واضح ہے کہ وہ زمین کامل تر اور عالی تر ہوگی کیونکہ اس عالم کی تمام چیزیں اس جہان کی نسبت زیادہ وسیع اور زیادہ کامل ہوں گی۔

فطری امر ہے کہ ہمارا آج کا جہان قیامت کے مناظر قبول کرنے کی استعداد نہیں رکھتا اور قیامت اور دوسرے جہان میں ہماری زندگی کے لئے تنگ اور محدود ہے اور جیسا کہ ہم نے بار بار کہا ہے شاید اس جہان کی نسبت اس جہان سے اسی طرح بے جیسے رحم مادر کی نسبت ہماری اس زندگی سے۔

بعض آیات میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اس دنیا کے دنوں کی نسبت بہت طویل ہوں گے ۲  
یہ امر بھی اس حقیقت پر ایک اچھا شاہد ہے -

البتہ ہم اس جہان کی تفصیلات کی تصویر کشی اس جہان میں نہیں کر سکتے  
جیسے شکم مادر میں بچہ سوچہ بوجہ بھی رکھتا ہو تو بھی باہر کی دنیا کی خصوصیات نہیں سمجھ سکتا - ہم تو صرف اتنا  
جانتے ہیں اس جہان ایک عظیم تغیر ہوگا - یہ جہان بالکل ویران ہوکر بالکل ایک نئے جہان میں بدل جائے گا -  
یہ بات قابل توجہ ہے کہ مصادر اسلامی میں موجود متعدد روایات میں ہے کہ اس وقت زمین اور عرصہ محشر طیب و پاک  
اور سفید روٹی میں بدل جائے گا کہ انسان جسے کھا سکیں گے تا کہ ان کا حساب واضح ہو جائے اور ہر کوئی اپنے انجام  
کی طرف چل پڑے -

تفسیر نور الثقلین میں یہ روایات مختلف حوالوں سے درج کی گئی ہیں - ۳

اہل سنت کے بعض مفسرین مثلاً قرطبی نے بھی اسی آیت کے ذیل میں ایسی روایات کی نشاندہی کی ہے - 4

بعید نہیں کہ ان روایات سے مراد یہ ہو کہ اس جہان میں زمین بجائے اس کے کہ مٹی نے اسے ڈھانپ رکھا ہو ایک ایسا  
غذائی مادہ اس پر محیط ہو کہ جو بدن انسانی کا حصہ بن سکتا ہو - کیونکہ مٹی ایسی چیز نہیں جو بدن انسانی کا حصہ بن  
سکے بلکہ اس میں موجود غذائی مواد نباتات کے ذریعے باہر نکلتا ہے تا کہ بدن انسانی کا حصہ بننے کے قابل ہو سکے  
لیکن اس روز سطح زمین پر مٹی کی بجائے ایسا مادہ محیط ہوگا جو آسانی سے جزو بدن بن سکے - اسے روٹی سے اس  
لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ انسان کی غذا کا زیادہ حصہ روٹی پر بھی مشتمل ہوتا ہے ( غور کیجئے گا ) -

.....

۱۔ پُس۔ ۵۱، قمر۔ ۷، معارج۔ ۴۳، حج۔ ۷ وغیرہ۔

۲۔ معارج۔ ۴۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۵۵ تا ص ۵۷۷۔

4۔ تفسیر قرطبی جلد ۵ ص

۲۔ سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام

۲۔ سورہ ابراہیم کا آغاز اور اختتام: جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے سورہ ابراہیم قرآن کے ایک حساس موضوع سے شروع ہوتی  
ہے اور یہ موضوع ہے انسان کو جہالت اور شرک کے اندھیروں سے علم و توحید کی طرف نکال لے جانا - اس سورت کا  
اختتام تمام لوگوں کو جہالت و شرک کے نتائج سے ڈرانے، تعلیم توحید اور اولواالباب کو متوجہ کرنے پر ہوتا ہے -  
اس ابتداء اور انتہاء سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی ہم چاہتے ہیں وہ اسی قرآن میں موجود ہے - حضرت  
امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

فیہ ربیع القلب و ینابیع العلم

دلوں کی بہار اور علوم و دانش کے سوتے اسی قرآن سے پھوٹتے ہیں 1

اسی طرح تمام فکری، اخلاقی اجتماعی اور سیاسی بیماریوں کا علاج اسی قرآن میں تلاش کرنا چاہئے - بقول امیر المومنین

:

فاستشفوه من ادوائکم

اسی قرآن سے اپنی بیماریوں کی دوا حاصل کرو - 2

یہ بیان اس امر کی دلیل ہے کہ آج کے مسلمان جو سمجھتے ہیں کہ قرآن صرف ایک ایسی مقدس کتاب ہے جو پڑھنے اور  
ثواب حاصل کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے اس کے برعکس یہ ایک ایسی کتاب ہے جو انسانوں کی ساری زندگی کے  
دستور العمل کے طور پر نازل ہوئی ہے - یہ آگہی عطا کرنے والی اور بیدار کرنے والی کتاب ہے -  
خلاصہ یہ کہ یہ ایسی کتاب ہے جو عالم اور دانشور کو متوجہ کرتی ہے اور عامۃ الناس اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں -  
چاہئے کہ یہ کتاب مسلمانوں کی زندگی میں جگہ پائے اور ان کی زندگی کا آئین بن جائے - نیز ضروری ہے کہ یہ کتاب  
ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر عمل کرنے کے لئے تحقیق، مطالعہ اور غور و خوض کا موضوع بنی رہے -  
مسلمانوں کے زوال اور پس ماندگی کا موثر عامل اور سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس عظیم آسمانی کتاب کو فراموش کر دیا

اور مشرق و مغرب کے انحرافی مکاتب فکر کی رخ کر لیا ہے ۔  
 حضرت علی علیہ السلام نے کیا عمدہ فرمایا ہے :  
 واعلموا انه ليس على احد بعد القرآن من فاقة ولا لاحد قبل القرآن من غنى ۔  
 یقین جانیے کہ آپ میں سے کوئی شخص بھی حامل قرآن ہو جائے تو اسے ذرہ بھر فقر و احتیاج نہیں رہے گی اور حامل  
 قرآن ہونے سے پہلے بے نیازی اور تونگری ممکن نہیں ۔ 3  
 کس قدر درد ناک ہے ۔ قرآن سے ہماری بیگانگی اور بے گانوں کی قرآن سے آشنائی ۔  
 کس قدر تکلیف دہ ہے ۔ کہ بہترین وسیلہ سعادت ہمارے گھر میں موجود ہے اور ہم اس سعادت کے لئے دنیا کے پیچھے  
 لگے ہوئے ہیں ۔  
 کس قدر اندونناک ہے ۔ کہ اب حیات کا چشمہ ہمارے پاس ہو اور ہم تشنہ کام جان دے دیں یا تپتے ہوئے بے آب بیابانوں میں  
 سیراب کے پیچھے بھاگتے رہیں ۔  
 خدا وندا ! ہمیں وہ عقل و ایمان عطا فرما جس کے ذریعے ہم سعادت کا یہ عظیم وسیلہ کھو نہ بیٹھیں جو تیری راہ کے شہداء  
 نے ہم تک پہنچایا ہے ۔  
 اور ہمیں وہ شعور مرحمت فرما کہ ہم جان لیں کہ ہماری گمشدہ متاعیں اسی عظیم کتاب میں ہیں ۔  
 تاکہ ہم کبھی اس کے سامنے اور کبھی اس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتے پھریں ۔

۱ نہج البلاغہ  
 2 نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶  
 3 نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶ ۔

۳۔ اول و آخر ۔ توحید

۳۔ اول و آخر ۔ توحید : زیر نظر آیات کا ایک پہلو توحید پر تاکید ہے ۔ یہاں آخری ذکر بھی توحید کا ہے اور اسی کی طرف  
 اولوالباب کو متوجہ کیا گیا ہے ۔  
 جی ہاں ۔ توحید اسلام کی عمیق بنیاد ہے ۔ عقیدہ توحید اسلام کا وہ شجر ہے جس کی جڑیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں ۔ اسلامی  
 تعلیم و تربیت کے سب راستے اسی پر اختتام پذیر ہوتے ہیں ۔ اسلام کی ابتداء بھی توحید ہے اور انتہاء بھی توحید ۔ اسلام کا  
 تانا بانا توحید ہی سے بنا گیا ہے ۔ توحید کا تعلق فقط معبود اور اللہ کے عقیدہ ہی سے نہیں بلکہ اس کے ہر نظریے ، عقیدہ  
 اور پروگرام کا ہدف بھی توحید ہی ہے ۔ ہر ایک کی بنیاد توحید پر ہے ۔  
 آج مسلمانوں کی عظیم ابتلا کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے توحید کو عملی طور پر اسلام سے حذف کر دیا ہے ۔  
 افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عرب ممالک کہ جہاں اسلام پروان چڑھا ۔ آج شرک آلود نعروں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ۔ آج  
 وہ نسل پرستی ، عرب تفاخر ، احیاء عربیت اور عظمت عرب کے بھنور میں گرفتار ہے ۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں  
 سے بھی ہر کسی نے اپنے لئے اسی قسم کا کوئی بت تراش لیا ہے ۔ انہوں نے اسلامی توحید کو اپنے سے بالکل الگ کر دیا  
 ہے کہ جس نے کسی وقت مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا تھا ۔ اس طرح یہ سب ممالک اپنے آپ میں ڈوب  
 کر خود اپنے آپ سے بے گانہ ہو گئے ہیں ۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کی آپس میں جنگ خون کے پیاسے  
 دشمنوں سے کہیں زیادہ ہے ۔

یہ بات کتنی شرمناک ہے کہ ہم سنیں کہ عرب ممالک کی باہمی جنگوں میں مرنے والوں کی تعداد اسرائیلی یہودیوں کے  
 مقابلے میں مرنے والوں سے کہیں زیادہ ہے ۔ اس وقت جب کہ ان کا ایک مشترک خطرناک دشمن ہے تو ان کے انتشار کا  
 یہ عالم ہے اگر ایسا دشمن نہ ہوتا تو ان کی کیا حالت ہوتی ۔

اس وقت جبکہ ہم تفسیر کا یہ حصہ لکھ رہے ہیں حکومت عراق نے بڑی بے رحمی سے اسلامی جمہوریہ ایران پر حملہ  
 کر دیا ہے اور بہانہ بھی اس کے پاس سرحد کا معمولی سا تنازعہ ہے جو یقیناً مذاکرات سے حل ہو سکتا تھا ۔ یہ وہی  
 حکومت عراق ہے کہ جس نے اسرائیلی سپاہیوں پر آج تک ایک بھی گولی نہیں چلائی ۔ آج اس نے اس سفاکی سے حملہ  
 کیا ہے کہ جیسے دو قوموں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو ۔ جیسے یہ نہ آپس میں ہمسایہ ہیں ، نہ ان میں تہذیب و ثقافت کا  
 کوئی رشتہ ہے اور نہ گہرا دینی تعلق ہے ۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ مشترک دشمن یہودی خوش ہو کر کہتا ہے :  
 اس سے بہتر منصوبہ کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ عراق ایران پر حملہ کر دے اور دونوں میں شدید تباہ کن

طولانی جنگ شروع ہو جائے اور ہمیں ایک مدت کے لئے آسودگی مل جائے۔  
یہ وہ مقام ہے کہ ایک موحد، متعبد اور صاحب ایمان مسلمان پر لازم ہے کہ ان طاغوتوں کا شر ختم کرنے کے لئے اٹھ  
کھڑا ہو ایسے شرک آلود، نفاق ڈالنے والوں، تباہیاں پھیلانے والوں اور دشمن کو خوش کرنے والوں کو قعر جہنم میں  
پہنچائے۔

۱ - سورہ ابراہیم آیہ ۳۷ تا ۴۱

ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر ایک نظر  
حضرت ابراہیم (علیہ السلام)

یہ وہ صورت ہے جو قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے اگرچہ ان کے حالات زندگی  
صرف اسی صورت میں نہیں ہیں بلکہ مختلف مناسبتوں سے دیگر صورتوں میں بھی خدا کے اس عظیم پیغمبر کا ذکر  
موجود ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ مکتب توحید کے اس ہیرو کی پر افتخار زندگی کے مختصر حالات زندگی اس سورہ  
کے آخر میں پیش کر دیں تا کہ اس سلسلہ میں آنے والی مختلف آیات کی تفسیر میں قارئین محترم کے لئے مدد گار ثابت ہو  
سکیں کیونکہ ان میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کی ضرورت پیش آئے گی۔

زندگی کے تین دور

حضرت ابراہیم کی زندگی کو واضح طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ قبل بعثت کا دور

۲۔ دور نبوت اور بابل کے بت پرستوں سے مقابلہ۔

۳۔ بابل سے ہجرت اور مصر، فلسطین اور مکہ میں مساعی کا دور۔

بت شکن پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر ایک نظر

بچپن

حضرت ابراہیم بابل میں پیدا ہوئے۔ یہ دنیا کا حیرت انگیز اور عمدہ خطبہ تھا۔ اس پر ایک ظالم و جابر اور طاقتور

حکومت مسلط تھی ۱

حضرت ابراہیم نے آنکھ کھولی تو بابل پر نمرود جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ وہ اپنے آپ کو بابل کا بڑا خدا  
سمجھتا تھا۔

البتہ بابل کے لوگوں کے لئے یہی ایک بت نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مختلف مواد کے بنے ہوئے مختلف  
شکلوں کے کئی ایک بت تھے۔ وہ ان کے سامنے جھکتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔

حکومت وقت سادہ لوح افراد کو بیوقوف بنانے اور انہیں افیون زدہ رکھنے کے لئے بت پرستی کو ایک موثر ذریعہ سمجھتی  
تھی لہذا وہ بت پرستی کی سخت حامی تھی۔ وہ کسی بت کی اہانت کو بہت بڑا ناقابل معافی جرم قرار دیتی تھی۔

حضرت ابراہیم کی ولادت کے بارے میں مورخین نے عجیب و غریب داستان نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا  
ہے : بابل کے نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو نمرود کی غیر متنازعہ طاقت سے مقابلہ کرے  
گا۔ لہذا اس نے اپنی تمام قوتیں اس بات پر صرف کر دیں کہ ایسا بچہ پیدا نہ ہو اس کی کوشش تھی کہ ایسا بچہ پیدا ہو بھی  
جائے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور یہ بچہ آخر کار پیدا ہو گیا۔

اس بچہ کی جاء ولادت کے قریب ہی ایک غار تھی۔ اس کی ماں اس کی حفاظت کے لئے اسے اس میں لے گئی اور اس ک  
ی پرورش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی عمر کے تیرہ برس وہیں گزر گئے۔

اب بچہ نمرود کے جاسوسوں سے بچ بچا کر نو جوانی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس عالم تنہائی کو چھوڑ  
دیا جائے اور لوگوں تک وہ درس توحید پہنچائے جو اس نے باطنی الہام اور فکری مطالعہ سے حاصل کیا تھا۔

۱ . بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آپ ملک بابل کے شہر اور میں پیدا ہوئے ۔

بت پرستوں سے مقابلہ

بابل کے لوگ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کے علاوہ سورج ، چاند اور ستارے جیسے آسمانی موجودات کی پرستش کرتے تھے ۔ حضرت ابراہیم نے عزم صمیم کر لیا کہ واضح منطق اور استدلال کے ذریعہ ان کے خوابیدہ وجدان کو پیدا کیا جائے اور ان کی پاک فطرت کے چہرے سے غلط تعلیمات کے تاریک پردے ہٹا دئے جائیں تا کہ نور فطرت چمک اٹھے اور وہ توحید پرستی کے راستے پر گامزن ہو سکیں ۔ انہوں نے مدتوں آسمان و زمین کی خلقت پر غور کیا تھا ، ان پر حکمران قدرت کا مطالعہ کیا تھا اور آسمان و زمین کے شگفت انگیز اور تعجب خیز نظام کے بارے میں فکر کی تھی ۔ نور یقین ان کے دل میں چمک رہا تھا ( انعام ۔ ۷۵ ) ۔

منطق و استدلال کے سہارے

پہلے انہیں ستارہ پرستوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ ” زہرہ “ ستارہ کہ جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی افق مغرب پر چمک اٹھتا ہے ، یہ لوگ اس کی پرستش و تعظیم میں مشغول تھے ۔

حضرت ابراہیم نے استفہام انکاری کے طور پر یا ان کے نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لئے ہم آہنگی کے اظہار کے طور پر پہلے کہا : یہ میرا خدا ہے ۔

لیکن جس وقت وہ غروب ہو گیا تو کہا : مجھے غروب ہونے والے اچھے نہیں لگتے ۔

جس وقت چاند افق کا سینہ چاک کر کے ابھرا اور چاند کی پرستش کرنے والوں نے مراسم عبادت شروع کیے تو ان کے ساتھ ہم صدا ہو کر کہنے لگے : یہ میرا خدا ہے ۔

اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا : اگر میرا پروردگار میری راہنمائی کرے تو میں تو گمراہوں میں سے ہو جاؤں ۔

آفتاب نے شب تیرہ کا پردہ ہٹایا اور کوہ صحرا پر اپنی طلائی شعائیں چھڑکیں تو سورج پرست عبادت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اس پر ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا : یہ میرا خدا ہے ، یہ تو ان سب سے بڑا ہے ۔

مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو گویا ہوئے : اے قوم ! میں ان شریکوں سے بیزار ہوں کہ جو تم نے خدا کے لئے بنا رکھے ہیں ۔ یہ تو سب غروب ہو جاتے ہیں ۔ یہ تو سب خوبصورت تغیر و تبدل کا شکار اور قوانین آفرینش کے اسیر ہیں ۔ ان کے تو اپنے بس میں کوئی ارادہ و اختیار نہیں چہ جائیکہ یہ خود اس جہان کے خالق اور اسے گردش دینے والے ہوں ۔ میں تو اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس کے لئے میں اپنے ایمان میں خالص اور ثابت قدم ہوں اور میں ہر گز مشرکین میں شامل نہیں ہوں گا ( انعام ۔ ۷۵ تا ۷۹ ) ۔

ابراہیم نے بت پرستوں سے مقابلہ نہایت خوبصورتی سے جیت لیا ۔ کچھ لوگ بیدار ہو گئے اور باقی کم از کم اپنے عقاید کے بارے میں شک و شبہ میں پڑ گئے ۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ علاقہ میں یہ بات دھوم گئی ۔ ہر کوئی سوچتا کہ یہ جوان کون ہے ، اس کی باتیں کتنی منطقی ہیں ، اس کا پیغام کتنا دل نشین ہے ، اس کی آواز تو لوگوں کے دلوں میں اترتی جاتی ہے ۔

آزر سے گفتگو

ایک اور مرحلہ آیا ۔ ابراہیم کی اپنے چچا آزر سے بحث ہونے لگی ۔ کبھی بہت مضبوط انداز سے ، محبت کے سلیقے سے اور کبھی تنبیہ و سرزنش کے لہجے میں ، آپ نے اسے بت پرستی کے بارے میں خبر دار کیا اور اس سے کہا : تو ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتا ہے جو نہ سن سکتی ہے ، نہ دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی تیری کوئی مشکل حل کر سکتی ہے ؟ آپ (علیہ السلام) نے چچا سے کہا : اگر تو میری پیروی کے تو میں تجھے سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں ۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر تو شیطان کی پیروی کرتا ہے تو کہیں تجھے عذاب الہی دامن گیر نہ ہو جائے ۔

یہاں تک کہ ان کا چچا ان نصیحتوں کے جواب میں انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دیتا ۔ آپ (علیہ السلام) ” سلام علیک “ کہتے ہوئے اسے جواب دیتے ہیں : میں تمہارے لئے استغفار کروں گا ۔

اس طرح آپ کوشش کرتے کہ اس سنگ دل کے دل میں کوئی گنجائش نکل آئے ۔ (مریم ۔ ۴۷)

دور نبوت

حضرت ابراہیم کب مبعوث نبوت ہوئے ، اس سلسلے میں ہمارے پاس کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے ۔ البتہ سورہ مریم

سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے اپنے چچا ازر سے بحث چھڑی تو آپ مقام نبوت پر فائز ہو چکے تھے کیونکہ سورہ کہتی ہے :

و اذکر فی الکتاب ابراہیم انہ کا صدیقاً نبیاً اذ قال لابیہ یا ابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئاً ۔  
ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ بت پرستوں کے ساتھ شدید معرکہ آرائی اور آپ کو آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے ۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے کے وقت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی عمر ۱۶ سال تھی ۔ ہم اس کے ساتھ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ عظیم کا رسالت آغاز نو جوانی ہی میں آپ کے دوش پر آن پڑا تھا ۔

عملی مقابلے کا آغاز

بہر حال بت پرستوں کے ساتھ حضرت ابراہیم کی معرکہ آرائی روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی ۔ یہاں تک کہ ایک روز موقعہ پا کر آپ نے بابل کے بت خانے کے بڑے بت کے علاوہ تمام بت توڑ ڈنھے ۔ یہاں سے زبانی محاذ آرائی عملی مقابلے کی شکل اختیار کر گئی ۔

سلطان جابر کے سامنے

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی مخالفت اور محاذ آرائی کا ماجرا آخر کار نمرود کے کان تک پہنچ گیا ۔ آپ (علیہ السلام) کو دربار میں حاضر کیا گیا تا کہ وہ بزعم خویش پند و نصیحت کے ذریعے ، یا ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے یا پھر دھمکی سے کام لے کر انہیں خاموش کر دے ۔

نمرود بہت چالاک تھا ۔ اس نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے پوچھا : اگر تو ان بتوں کی پوجا نہیں کرتا تو پھر تیرا پروردگار کون ہے ؟

آپ نے کہا : وہی جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے ۔

وہ چلا کر کہنے لگا : اے بے خبر ! یہ تو میرے ہاتھ میں ہے ۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ جس مجرم کو قتل کی سزا ملی ہو میں اسے آزاد کر دیتا ہوں اور ایسے قیدی کو جسے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ، میں چاہوں تو اسے قتل کر دیتا ہوں ۔  
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دندان شکن جواب میں بہت مشہور تھے ۔ نبوت کی طاقت سے مدد لیتے ہوئے آپ نے اس سے کہا : خدا کے ہاتھ میں صرف موت و حیا ہی نہیں بلکہ تمام عالم ہستی اس کے تابع فرمان ہے ۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ ہر صبح سورج اس کے حکم سے افق مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور وقت شام اس کے حکم سے مغرب میں ڈوب جاتا ہے ۔ اگر تو عالم ہستی کی اس وسعت کا فرمان روا ہے تو کل معاملہ اس کے برعکس کر دے تو کہ سورج مغرب سے نکلے اور مشرق میں ڈوب جائے ۔ نمرود مبہوت ہو گیا ۔ ایسا چکرایا کہ اس کی زبان میں جواب کی سکت نہ رہی (بقرہ ۔ ۲۵۸)  
اس میں شک نہیں کہ ابراہیم (علیہ السلام) خوب جانتے تھے کہ موت و حیات پر قدرت کے بارے میں نمرود کا دعویٰ بس چکر بازی اور تیز طراری ہے لیکن استدلال پر آپ کی مہارت اجازت نہ دیتی تھی کہ اس موضوع پر بات کرتے رہیں کہ جسے مکار دشمن نے دیناویز بنا لیا ہے لہذا اسے چھوڑ کر فوراً ایسے موضوع پر بات شروع کی کہ جس پر وہ ہاتھ پاؤں مارنے کی طاقت بھی نہ رکھتا تھا ۔

حضرت ابراہیم (ع) کی ہجرت

آخر کار نمرود کی ظالم حکومت کی مشیزی کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ جوان آہستہ آہستہ حکومت کے لئے خطرے کا مرکز بنتا جا رہا ہے ۔ انہوں نے سوچا کہ اس کی زبان گویا ، فکر توانا اور منطق رسا کہیں پسے ہوئے محروم عوام کی بیداری اور آگاہی کا باعث نہ بن جائے کہیں لوگ استعمار کی زنجیر توڑ کی ان کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں لہذا حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ بت پرستوں کے جابلانہ تعصب کا سہارا لے کر ابراہیم کو راستے سے ہٹا دیا جائے ۔ انہیں ایک خاص انداز اور حالات پیدا کر کے لوگوں کے سامنے آگ کے دریا میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا گیا ۔ سورہ انبیا میں اس واقعہ کی تفصیل آئیں گی ۔ یہ آگ در حقیقت لوگوں کی جہالت اور حکمران نظام کے ظلم کے ایندھن سے جلائی گئی تھی ۔ حکومت اس طرح اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے آسودہ فکر کرنا چاہتی تھی ۔

لیکن جب آگ حکم خدا سے خاموش ہو گئی اور ابراہیم اس سے صحیح و سالم نکل آئے تو نمرود کے نظام حکومت میں لرزہ پیدا ہو گیا ۔ اب ابراہیم ایک اور حیثیت سے سامنے آئے ۔ وہ ایک عام تفرقہ پرواز انسان نہ تھے کہ جسے وہ قتل کرنا چاہتے تھے ۔ وہ تو ایک خدائی رہبر تھے وہ ایک ایسے بہادر ہیرو تھے جو تن تنہا خالی ہاتھ طاقتور ظالم حکمرانوں پر حملہ کر سکتے تھے ۔ لہذا عوام کا خون چوسنے والے نمرود اس کے درباریوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پوری قوت سے ابراہیم کا مقابلہ کریں گے اور جب تک انہیں ختم نہ کر لیں آرام سے نہیں بیٹھیں گے ۔

دوسری طرف ابراہیم یہاں اپنا کردار ادا کر چکے تھے۔ آمادہ دل لوگ ان پر ایمان لا چکے تھے۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ مؤمنین اور اپنے حامیوں کو ساتھ لے کر بابل سے نکل جائیں اور اپنی دعوت حق کو دور دور تک پھیلانے کے لئے شام، فلسطین اور فرعون کی سر زمین مصر کی طرف روانہ ہوں۔ آپ نے ان علاقوں میں حقیقت توحید کی تبلیغ کی اور بہت سے لوگ خدانے واحد پر ایمان لائے۔

رسالت کا آخری مرحلہ

حضرت ابراہیم نے تمام عمر ہر طرح کی بت پرستی خصوصاً انسان پرستی کے خلاف جہاد کرتے گزاری۔ آپ نے آمادہ دلوں کو نور توحید سے روشن کیا۔ آپ نے انسانی جسموں میں نئی روح پھونک دی اور بہت سے لوگوں کو خود غرضوں اور خود سروں کی قید سے رہائی دلائی۔ اب ضروری تھا کہ آپ بندگی خدا کے آخری مرحلے میں قدم رکھیں اور اپنی متاع حیات کو طبق اخلاص میں رکھ کر بارگاہ الہی میں پیش کر دیں تاکہ خدا کی عظیم آزمائشوں سے گزر کر ایک عظیم روحانی انقلاب کے ذریعے انسانوں کی امامت کے مرحلے میں داخل ہوں۔

اس کے ساتھ ساتھ اب انہیں خانہ توحید یعنی خانہ کعبہ کی بنیادوں کو بھی بلند کرنا تھا اور اسی خدا پرستی کے ایک بے نظیر مرکز میں تبدیل کرنا تھا اور تمام آمادہ دل مؤمنین کو اس عظیم مرکز توحید کے پاس ایک عظیم کانفرنس کی دعوت دینا تھا۔

آپ نے اپنی کنیز ہاجرہ کو اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ اس سے انہیں اسمعیل جیسا بیٹا نسیب ہوا۔ آپ کی پہلی بیوی سارہ نے ان سے حسد کیا۔ یہی حسد سبب بنا کہ آپ ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچہ کو حکم خدا سے فلسطین سے لے کر مکہ کی جلتی ہوئی سنگلاخ پہاڑوں کی سر زمین میں لے گئے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں پانی کی ایک بوند بھی دستیاب نہ تھی آپ حکم خدا سے ایک عظیم امتحان سے گزرتے ہوئے انہیں وہاں چھوڑ کر واپس فلسطین آگئے۔

وہاں چشمہ زمزم پیدا ہوا۔ اس اثناء میں جرہم قبیلہ ادھر سے گزرا۔ اس نے جناب ہاجرہ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی۔ گویا واقعات کا ایک طولانی سلسلہ ہے کہ جو اس علاقہ کی آبادی کا باعث بنا۔

حضرت ابراہیم نے خدا سے دعا کی تھی کہ اس جگہ کو آباد اور پر برکت شہر بنا دے اور لوگوں کے دل میری اولاد کی طرف مائل کر دے۔ ان کی اولاد وہاں پھلنے پھولنے لگی تھی۔ 1

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض مورخین نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم ہاجرہ اور شیر خوار اسمعیل کو مکہ میں چھوڑ کر واپس جانا چاہتے تھے تو جناب ہاجرہ نے فریاد کی: اے ابراہیم آپ کو کس نے حکم دیا ہے کہ ہمیں ایسی جگہ پر چھوڑ جائیں کہ جہاں نہ کوئی سبزہ ہے، نہ دودھ دینے والا کوئی جانور، یہاں تک کہ جہاں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں ہے۔ آپ پھر بھی ہمیں بغیر زاد و توشہ اور مونس و مددگار کے چھوڑے جارہے ہیں۔

حضرت ابراہیم نے مختصر سا جواب دیا: میرے پروردگار نے مجھے یہی حکم دیا ہے۔

ہاجرہ نے یہ سنا تو کہنے لگی: اگر ایسا ہے تو پھر خدا ہر گز ہمیں یوں ہی نہیں چھوڑے گا۔ 2

حضرت ابراہیم بار بار فلسطین سے اسماعیل کو ملنے کے لئے مکہ آئے۔ ایک سفر کے موقع پر آپ مراسم حج بجا لائے اور حکم خدا سے اپنے آبرو مند اور نہایت پاکیزہ صاحب ایمان نوجوان بیٹے اسماعیل کو لے کر قربان گاہ میں آئے۔

اسمعیل آپ کی زندگی کا بہترین ثمر تھے۔ آپ بالکل تیار تھے کہ انہیں راہ خدا میں قربان کر دیں۔

اس اہم ترین آزمائش سے جب آپ نہایت عالی طریقہ سے عہدہ برآ ہو چکے اور آخری مرحلے تک اپنی آمادگی کا مظاہرہ کر چکے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانی کو قبول کر لیا اور اسمعیل کو بچا لیا اور قربانی کے لئے ایک دنبہ کو بھیج دیا۔ 3 حضرت ابراہیم ان سب امتحانات سے کامیابی سے گزر چکے اور آزمائشوں کی اس کٹھالی سے کامیاب نکل آئے تو آپ کو ایک ایسا مقام حاصل ہوا جو وہ بلند ترین مقام ہے جو ایک انسان ترقی کر کے حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

اللہ نے کچھ کلمات کے ذریعے ابراہیم کا امتحان لیا۔ وہ ان سب سے کامیاب گزرے تو اس پر اللہ نے ان سے کہا: میں

تجھے لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتا ہوں۔ (ابراہیم اس خوش خبری پر وجد میں آئیں گے) کہنے لگے: یہ مقام میرے کچھ اولاد کو بھی عطا کر دے۔ (ان کی دعا قبول ہو گئی لیکن ایک شرط کے ساتھ) اللہ نے کہا: یہ مقام ہر گز کسی ایسے شخص کو نصیب نہ ہوگا جس سے ظلم و ستم اور انحراف سرزد ہوا ہو۔ 4

.....

1. کامل ابن اثیر جلد ۱ ص ۱۰۳

2. سورہ صافات ۱۰۴ تا ۱۰۷

قرآن اور ابراہیم کا مقام بلند

- آیات قرآن مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بہت بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ ایسا بلند مقام اللہ تعالیٰ نے کسی اور گزشتہ نبی کو عطا نہیں فرمایا تھا۔ اس پیغمبر خدا کی عظمت ان تعبیرات سے واضح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے :
- ۱ - خدا نے ابراہیم کی ایک ”امت“ قرار دیا ہے اور ان کی شخصیت کو ایک امت کی مانند گردانا ہے (نحل - ۱۲۰)۔
  - ۲ - اللہ نے آپ کو خلیل اللہ کا مرتبہ عطا فرمایا ہے :  
واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً (نساء - ۱۲۵)۔
- یہ امر قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں ہے :  
یہ مقام انہیں اس بناء پر حاصل ہوا کہ ابراہیم نے خود کبھی کسی چیز کے لئے کسی کے سامنے دست دراز بلند نہ کیا اور کبھی کسی سائل کو محروم نہیں لوٹایا - 2
- ۳ - قرآن کے مطابق وہ نیک ۱ صالح ۲ قانتین میں سے ، ۳ صدیقین میں سے ، ۴ صابریں میں سے ۵ اور ایفائے عہد کرنے والوں میں سے تھے - 1
  - ۱ - ص ۴۷
  - ۲ - نحل - ۱۲۲
  - ۳ - نحل - ۱۲۰
  - ۴ - مریم - ۴۱
  - ۵ - توبہ - ۱۱۴
  - ۶ - نجم - ۳۷
  - ۷ - ذاریات ۲۴ تا ۲۷
- یہاں تک کہ بعض روایات میں انہیں ابوا ضیاف ( مہمانوں کا باپ یا مہمانوں کا ساتھی ) کا لقب دیا گیا ہے - 3
- ۸ - سفینة البحار جلد ۱ ص ۷۴
- جب بت دھر قوم آپ کو آگ کے سمندر میں پھینک رہی تھی - فرشتوں نے خواہش کی تھی کہ ہم آپ کو بچا لیں - ابراہیم نے ان کے اس تقاضے کو قبول نہ کیا - تاریخ میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے - آپ (علیہ السلام) نے کہا : میں سر تا نیاز و احتیاج ہوں لیکن مخلوق سے نہیں صرف خالق سے ، 4
- ۶ - شجاعت و بہادری میں بے مثال تھے - بت پرستوں کے دہاڑتے ہوئے سیلاب کے سامنے تنہا کھڑے ہو گئے ، ان کا دل لمحہ بھر کے لئے ان سے وحشت زدہ نہ ہوا - آپ نے ان کے بتوں کا مذاق اڑایا اور ان کے بت کدے کو ڈھا کر پتھروں کا ڈھیر بنا دیا نیز نمود اور اس کے جلادوں کے بڑی جرأت سے بات کی جو قرآنی آیات میں موجود ہے -
  - ۷ - ابراہیم بڑی منطق سے بات کرتے تھے - آپ نے گمراہوں کو بہت مختصر ، محکم ، دندان شکن استدلال سے جواب دئے اور اپنے منطقی استدلال سے مخالفین کو رسوا کر دیا -
- آپ کبھی سختی و خشونت سے پیش نہیں آتے تھے بلکہ بڑے اطمینان سے بات کرتے - آپ کا یہ انداز آپ کی عظیم روحانی قوت کا ترجمان تھا - آپ نے گفتار و کردار سے مخالفین کو شکست دی - نمود کے سامنے آپ کی بات چیت اور اپنے چچا آزر سے آپ کی گفتگو بابل کے قاضیوں سے مناظرہ بڑی وضاحت سے مرقوم ہے - بابل کے قاضی آپ کو خدا پرستی اور بت شکنی کے جرم میں سزا دینا چاہتے تھے آپ نے بڑے اعتماد اور اطمینان سے مدلل جواب دئے - اس سلسلے میں سورہ انبیاء کی مندرجہ ذیل آیات کو غور سے پڑھنا چاہیے :
- قاضیوں نے آپ سے پوچھا : کیا وہ تم ہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے سر پر یہ مصیبت ڈھائی ہے اور ان سب چھوٹے بڑے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے -
- قالو ا أنت فعلت هذا بالهتنا يا ابراهيم
- ( کہنے لگے : اے ابراہیم کیا وہ تم ہی ہو جس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے )؟ -
- آپ نے انہیں ایسا جواب دیا کہ ان کے لئے بچ نہ نکلنے کی کوئی راہ نہ رہی قرآن کے الفاظ میں :

قال بل فعله كبيرهم هذا فاستلوهم ان كانوا ينطقون

بولے: بوسکتا ہے کہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہو اگر یہ بات کرسکتے ہیں تو انہیں سے پوچھو۔  
اس ایک ہی جملہ سے آپ نے اپنے دشمنوں کے لئے تمام راستے بند کردئے۔ اب اگر وہ کہیں کہ بت گونگے ہیں، لب پستہ  
ہیں اور بات کرنے کی سکت نہیں رکھتے، تو ان کے گونگے اور بے عزت خداؤں کی کتنی رسوائی ہے اور اگر کہیں کہ  
یہ بات کرسکتے ہیں تو پھر ان کے پوچھنا پڑتا اور انہیں جواب دینا پڑتا۔  
اس پر ان کا کواہیدہ وجدان جاگ اٹھا۔ ان کے اندر آواز آئی: تم ظالم اور خود پرست ہو، نہ اپنے اوپر رحم کرتے ہو اور نہ  
اپنے معاشر پر۔

قرآن الفاظ میں:

فارجعوا الیٰ انفسهم فقالوا انهم انتم الظالمون

بہر حال جواب تو انہیں دینا ہی تھا۔

ثم نکثوا علی رؤسهم لقد علمت ما هوؤلاء۔ ينطقون

بڑی بے دلی سے سر شکستہ ہو کر کہنے لگے: تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ بات نہیں کرسکتے۔

یہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بات ان کے سر پر بجلی بن کر گری۔

آپ نے پکار کر کہا:

اف لکم و لما تعبدون من دون الله افلا تعقلون

حیف ہے تم پر اور ان پر کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو۔ کیا گیاہے تمہاری عقلوں کو؟۔

آخر کا رجب انہوں نے دیکھا کہ وہ ابراہیم (علیہ السلام) قوی منطق کے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتے تو انہوں پھر تمام

چھوٹے سرکشوں کی طرح طاقت کا سہارا لیا اور کہنے لگے: تمہیں چاہئیے کہ انہیں جلا دو:

اس کام کے لئے انہوں بت پرستوں کے جاہلانہ تعصبات سے مدد لی اور پکار کر کہا: اگر تم میں طاقت ہے تو اسے جلا دو

اور اپنے خداؤں کی مدد کے لئے تیار ہو جاؤ۔

”قالوا حرقوه و انصروا الہتکم ان کنتم فاعلین“ 17

یہ ابراہیم (علیہ السلام) کی رسا، استدلالی اور قاطع منطق کا ایک نمونہ تھا۔

۸۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ایک اعزازیہ شمار کرتا ہے کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں 5

اور قرآن کہتا ہے کہ ان ہی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ 6

یہاں تک کہ مسلمانوں کو شوق دلانے کے لئے ان کے چند کے احکام پر عمل درآمد کی دعوت دیتا ہے اور رکھتا ہے کہ

تمہیں ابراہیم اور ان کے انصار کی اقتدا کرنا چاہئیے۔ 7

۹۔ اس عظمت و شکوہ سے مراسم حج کی بنیاد حکم الہی سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام

مراسم حج میں ابراہیم کا نام، ان کے کی یاد اور ان کا ذکر موجود ہے۔ 8

۱۰۔ ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت اس قدر بلند ہے کہ ہر گروہ کی کوشش تھی کہ انہیں اپنے میں سے قرار دیں۔

یہودی اور عیسائی ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ اپنے تعلق پر بہت زور دیتے تھے یہاں تک کہ قرآن ان کے جواب میں یہ

حقیقت بیان کرتا ہے کہ وہ ایک مسلمان اور سچے موحد تھے یعنی وہ ہر امر میں حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم تھے،

اس کے علاوہ انہیں کوئی سوچ نہ تھی اور بس اسی کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے۔ 9

.....

1۔ ابراہیم بہت مہمان نواز تھے۔ 13

2۔ ان کا توکل بے مثال تھا یہاں تک کہ کسی کام اور کسی مشکل میں خدا کے علاوہ کسی پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ بھی

مانگتے خدا ہی سے مانگتے اور اس کے علاوہ کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے تھے 15

3۔ شعراء ۷۸ تا ۸۲

4۔ کامل بن اثیر جلد ۱۔ ص ۹۹۔

5۔ انبیاء ۶۳ تا ۶۷۔

6۔ ملۃ ابیکم ابراہیم حج ۷۸۔

7۔ ملۃ ابیکم ابراہیم حج ۷۸۔

8۔ ممتحنۃ ۴۔

9۔ سورہ حج ۲۷۔

